''چہارسُو''

..... عالمی کہانیاں .....

امریکا میں مقیم معروف صحافی اور ادیب ظفر قریشی صاحب کا عالمی کہانیوں پر مبنی پانچواں مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ظفر قریشی صحافت سے ۱۹۶۰ء سے وابستہ رہے۔اس زمانے کے مقبول روزنامہ ''حریت'' میں شائع ہونے والے تراجم کی انفرادیت مسلمّہ تھی اور اپنی نوعمری ہی کے دور میں صحافتی اور ادبی حلقوں میں ظفر قریشی نے اپنا مقام بنالیا تھا۔عالمی کہانیوں کے پانچویں مجموعے کے مطالعے سے قارئین کو ان کی ترجمہ نگاری اور تحریر کی مہارت کا بہ خوبی اندازہ ہوجائے گا۔منتخب عالمی کہانیوں کے چوتھے سلسلے کا ہم نے بہ نظرِ غائر جائزہ لیا تھا،اس کی بیش تر کہانیوں میں تجسس اور سنسنی خیزی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے اور بحیثیت ترجمہ نگار وہ ہر کہانی میں اپنے اس ہُنر کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں۔کہانیوں کے نشیب وفراز کو انہوں نے ہر جگہ سلیقے سے بیان کیا ہے۔اچھے ترجمے کے ساتھ ایک اور بات میں نے یہ نوٹ کی ہے کہ ظفر قریشی صاحب نے معیاری اردو لکھی ہے۔وہ کسی بھی کہانی کے مرکزی خیال کو متاثر کیے بغیر اردو زبان کے قالب میں ڈھالنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں اور یہ کام حقیقت میں اتنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ کسی بھی عبارت کے جملوں کا حُسن اصل زبان سے ترجمہ کرنے والی زبان میں قائم رکھنا بہت مہارت مانگتا ہے اور میں نے نوٹ کیا ہے کہ انہوں نے کسی بھی جملے کی معنویت کو ترجمے کے حسن میں کہیں بھی برباد نہیں کیا ہے۔

اپنے مندرجات اور پیش کش کے لحاظ سے میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ منتخب عالمی کہانیوں کے سلسلے میں ان کی اب تک آنے والی کتابوں میں قارئین کے لیے دلچسپی کا جو سامان اور جو معیار موجود تھا وہ عالمی کہانیوں کے پانچویں مجموعے میں بھی موجود ہوگا۔مجھے ظفر قریشی کی آئندہ آنے والی کتاب بلکہ کتابوں کا انتظار رہے گا۔

..... ایس ایم معین قریشی

اشاعت:۲۰۲۱ء، قیمت:۱۰۰۰روپے،دستیابی:فرید پبلشرز،اردو بازار،کراچی۔

..... محبت عام کرنا چاہتا ہوں .....

ڈاکٹر عمر قیاز قاتلؔ نہ صرف ادب کے استاد اور طالب علم ہیں، بلکہ جنوں کی حد تک تخلیقِ ادب سے بھی وابستہ ہیں۔اُن کے اِسی جذبۂ شوق سے یہ اُمید وابستہ کی جاسکتی ہے کہ قلم قبیلے میں انہیں انتہائی عزت واحترام سے نوازا جائے گا۔انہوں نے اپنے پہلے اردو شعری مجموعے ''محبت عام کرنا چاہتا ہوں'' میں اپنے جذبات واحساسات کو جن محاکاتی حوالوں اور ہنرمندانہ لفظیات سے پیش کیا ہے وہ اُن کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔میں بلاشبہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ لفظوں کے نبض شناس اور ایک دلِ حساس کے مالک ہیں۔اُن کے اندر وفورِ جذبات کی کتنی ہی کہکشائیں اپنے اظہار کی منتظر ہیں۔وہ عادتاً شاعری نہیں کرتے بلکہ اُن کی شخصیت اور فطرت اُن سے شاعری کراتی ہے۔اُن کے بے شمار اشعار کچی مٹی سے پھوٹتی کونپلوں کی صورت جنم لیتے ہیں۔اُن کا ناطہ اور رشتہ اپنی زمین سے نہایت گہرا ہے۔اگر اُن کی ریاضتِ شعری کا سفر اسی تسلسل اور بہاؤ سے جاری رہا تو اُن کے اشعار پڑھنے والوں کے دلوں پر اسی طرح دستک دیں گے،جس طرح سورج کی پہلی کرن آفاق کے دریچوں میں اُترتی ہے۔میں اُن کی کامیابیوں کے لیے ہمیشہ سے دعا گو ہوں اور رآئندہ بھی رہوں گا۔

..... ڈاکٹر نذیر تبسم

اشاعت:۲۰۲۱ء، قیمت:۶۰۰روپے،دستیابی:ورلڈ ویو پبلشرز،لاہور۔

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۰،شمارہ:جولائی،اگست ۲۰۲۱ء

بانی مدیراعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِسالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

مدیرمسؤل

گلزارجاوید

○☆○

مدیرانِ معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

رابطہ:537/D-1،گلی نمبر18،ویسٹریج-III،راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:(+92)-51-8730633-8730433

موبائل:(+92)-336-0558618

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازارراولپنڈی

متاع چہارسو

سرِورق، پسِ ورق۔۔۔۔۔۔۔شعیب حیدر زیدی
تزئین۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عظمیٰ رشید
کمپوزنگ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

قرطاسِ اعزاز

گلزارشاعری۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی ۵
تاروں پہ کمند۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد انعام الحق ۶
منٹو اور عصمت کے افسانے۔۔۔ڈاکٹر پرویز شہریار ۷
براہِ راست۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۹
چشمِ حیواں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تبسم فاطمہ ۱۷
ایک منفرد افسانہ نگار۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر سید احمد قادری ۲۱
افسانوں کا منظر نامہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔منظر کلیم ۲۵
منٹو اور عصمت شناسی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر محمد کاظم ۳۱
گمشدہ آدمی کی متلاشی نظمیں۔۔ڈاکٹر سعادت سعید ۳۶
ماورائے ازدواج رفاقتوں کا بیانیہ۔۔۔حقانی القاسمی ۴۱
پرویز شہریار کے افسانے۔۔۔۔۔۔۔۔۔شموئل احمد ۴۶
پرویز شہریار کی کہانیاں۔۔۔۔۔۔مشرف عالم ذوقی ۴۹
پرویز سے شہریار تک۔۔۔۔۔۔۔پروفیسر ابن کنول ۵۳
دس سروں والا بجوکا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پرویز شہریار ۵۵
خاموش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پرویز شہریار ۵۷
بہادری کا انعام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پرویز شہریار ۵۸

عظمت کا بیاں

نسیمِ سحر، محبوب اصغر خان، ڈاکٹر نزہت شاہ، اشہر اشرف۔ ۵۹

افسانے

نوحہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اصغر ندیم سید ۶۱
تلاش ابھی ناتمام ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔طاہرہ اقبال ۶۳
مگر حقیقت ہے!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔رینو بہل ۶۶
عید قرباں سے پہلے۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر شکیل احمد خاں ۷۰
اضطراب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر قمر جمالی ۷۴

خاک کے ذرے ۷۸

پنڈت ہری چند اختر، اعتبار ساجد، ولی عالم شاہین، جاوید زیدی، نسیمِ سحر، آفتاب مضطر، انوار زاہدی، اشرف جاوید، ڈاکٹر ریاض احمد، ڈاکٹر نبیل احمد۔

افسانے

ماسک۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فرخندہ شمیم ۸۳
ہائے رے یہ مجبوریاں۔۔۔۔۔۔معین الدین عثمانی ۸۴
الوداع۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ارشد منیم ۸۷
افسانچے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔محمد علیم اسماعیل ۸۹
بجُّو سیٹھ کی باڑی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔گلزار جاوید ۹۱

رقصِ آزردگاں

واصف حسین واصف، مادھو کوشک، انیس الرحمٰن، نوید سروش، ڈاکٹر عمر قیاز قائل، مقسط ندیم، تصور اقبال، خورشید طلب، شکیل اعظمی، احمد سوز، تسنیم کوثر، ارشد سعید۔ ۹۷

دنیا میرے آگے

خطرناک کھلونے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تابش خانزادہ ۱۰۱

سفرنامہ

برطانیہ سے جاپان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یعقوب نظامی ۱۰۳

نشانِ راہ

ڈیوڈ میتھیوز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اشفاق حسین ۱۰۶

جنازوں کے جلوس

فیض احمد فیض، امجد اسلام امجد، جاوید زیدی، یوگیندر بہل تشنہ، ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد، محمد شاہد صدیقی شاہد، فیصل عظیم، انیس الرحمٰن، جاوید زیدی۔ ۱۰۹

غبّارِ وحشت

رہیے اب ایسی جگہ؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پرتو اسد ۱۱۴

ایک صدی کا قصہ

رامانند ساگر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دیپک کنول ۱۱۵

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین۔۔۔۔۔۔۔۔۔وجیہ الوقار ۱۱۹

☆

قرطاسِ اعزاز

ڈاکٹر پرویز شہریار

کے نام

گلزارشاعری

اک زندہ دل ادیب ہیں پرویز شہریار
حاصل جنھیں جہان ادب میں ہے اعتبار
نظموں میں ان کی ان کا نمایاں ہے کرب ذات
افسانے ان کے عصری ادب کے ہیں شاہکار
گلزار شاعری کے گل سرسبد ہیں وہ
گرویدہ ان کے حسن بیاں کے ہیں گلعذار
جاری ہے ان کا ادبی سفر عزو شان سے
مداح ان کے عہد رواں میں ہیں بے شمار
گوشہ ''چہارسو'' کا جو ہے ان کے نام سے
اردو ادب میں ان کا بڑھائے گا وہ وقار
ارباب علم وفضل ہیں سب ان سے آشنا
بحر ادب کی آج ہیں وہ در شاہوار
کرتے ہیں شایع ان کی وہ ادبی نگارشات
اردو کے آج جتنے رسائل ہیں باوقار
این سی ای آر ٹی کے ایڈیٹر ہیں ان دنوں
تعلیم کی جو راہ کو کرتا ہے استوار
ہے قاضی پور ان کی جو آبائی زادگاہ
اس کا بھی اپنے ساتھ بڑھاتے ہیں وہ وقار
ہے ''بھوک کی حمایت میں'' ان کی کتاب جو
ہر سطر سے ہے سوز دروں اس کی آشکار
ہے تنہا آدمی کا بڑے شہر میں جو حال
اس سے عیاں ہے ذہن پریشاں کا انتشار
پرویز پر خصوصی شمارہ ہے اس کا جو
ہے وہ چہارسو کے لیے وجہ افتخار

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی
(نئی دہلی)

ستاروں پہ کمند

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

نام : پرویز شہریار

والد کا نام : شہاب قاضی پوری

سن پیدائش : 10 رجنوری 1964

جائے پیدائش: جمشید پور، جھارکھنڈ، انڈیا

وطن مالوف : شاہ آباد، آرہ، بہار، انڈیا

تعلیم:

بی اے (انگریزی آنرز)، رانچی یونیورسٹی

ایم اے (اردو)، جواہر لال نہرو یونیورسٹی (یونیورسٹی ٹاپر)

ایم فل، جے این یو، نئی دہلی

پی ایچ ڈی، دہلی یونیورسٹی

ماس میڈیا کا ایڈوانس ڈپلوما، جے این یو،

بک پبلشنگ پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما، دہلی یونیورسٹی (گولڈ میڈلسٹ)

ذمہ داریاں:

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی (1993 سے)

پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، قومی کاؤنسل برائے فروغ اردو زبان، (2007)

محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند، نئی دہلی

اختصاص:

ایڈیٹر (جنرل)

موجودہ ذمہ داری :

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی، انڈیا

تخلیقی سفر کا آغاز:

سن 1980ء اردو فکشن سے

پہلی تخلیق:

مختصر افسانہ ''مچھلی کی دسویں رانی''

پہلی اشاعت:

ہفتہ وار ادبی اخبار ''پندار'' پٹنہ, بہار 6 رستمبر 1980

اولین نظمیں:

''آدم اور حوا'' اور ''انتظار کے دوش پر''، اخبار مشرق، کولکاتہ، مغربی بنگال، انڈیا

شناخت:

افسانہ نگاری

اولیں افسانوی مجموعہ:

بڑے شہر کا خواب (سن اشاعت 2005)

مشہور افسانے:

شجر ممنوعہ کی چاہ میں، دس سروں والا بجوکا، لو اِن ریلیشن سے پرے، سیلوا جڈوم کہاں جائیں، شہر نوشیرواں کا ایک یادگار محرم

اولیں شعری مجموعہ:

بڑا شہر اور تنہا آدمی (سن اشاعت 2009) اتر پردیش اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ

چنیدہ نظمیں:

صندل کی خوشبو اور سانپ، بھوک کی حمایت میں، یہ سفر جاری رہے، بڑے شہر کا خواب، شجر ممنوعہ سے پرے

نقد و نظر :

منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور 2011

بیدی کے منتخب افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ 2019

اردو فکشن کے تثلیث:

منٹو، بیدی اور عصمت کا تنقیدی مطالعہ زیر طبع

ادب اطفال (تراجم):

1۔ ننھا شہزادہ 2۔ معصوم دل کا جادو

ہما کو پرواز کرنے دو:

(ترجمہ) اسٹیج ڈرامہ (سن اشاعت 2012)

راجندر سنگھ بیدی: حیات اور کارنامے:

ریسرچ مونوگراف برائے قومی کاؤنسل (زیر تکمیل)

نغمۂ گیتی (ترجمہ):

ساہتیہ اکادمی کا پروجیکٹ (زیر تکمیل)

ثانوی افسانوی مجموعہ:

شجر ممنوعہ کی چاہ میں (سن اشاعت 2014) بہار اردو اکادمی سے انعام یافتہ

خط و کتابت کا پتہ:

فلیٹ نمبر 4/48، این سی ای آر ٹی کیمپس، شری اروبندو مارگ، نئی دہلی۔110016 (انڈیا)

ای میل آئی ڈی:

drspahmad@gmail.com

موبائل فون نمبر:

09910782964

☆

منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور

ڈاکٹر پرویز شہریار

سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی نے کثرت سے افسانے لکھے اور پوری عصری حسیت کے ساتھ لکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں اس وقت کا جیتا جاگتا معاشرہ آج بھی اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انھیں بعض اعتبار سے اجتہادی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے معاشرے کے افراد بالخصوص خواتین کے ایسے سنجیدہ مسائل پر قلم اٹھایا جن پر بیسویں صدی کے نصف اول کے ہندوستانی معاشرے میں کھل کر گفتگو کرنے میں بھی عار محسوس کیا جاتا تھا۔ یہ ان کی جرأت اور بے باکی تھی جس نے انھیں مقبولیت اور عظمت کی انتہائی بلندیوں پر برقرار رکھا ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی معنویت میں مزید اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ ہر چند کہ ان کے اس کارنامے کو آج جنسی حقیقت نگاری سے موسوم کیا جاتا ہے تاہم اسی حقیقت کے بیان کے لیے کبھی ان پر فحش نگاری اور اخلاق سوزی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا تھا۔ ٹھنڈا گوشت اور لحاف کے مقدمے کی شنوائی کے لیے لاہور کے ایک ہی عدالت میں ایک ہی دن منٹو اور عصمت دونوں کو حاضر ہونا پڑا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ مقدمہ ٹائیں ٹائیں فش ہوگیا۔

منٹو اور عصمت ایسے فنکار ہیں، جنھوں نے سماج کے ایسے گرے ہوئے لوگوں کے اندرون میں موجود کراہتی ہوئی انسانیت کو آواز دی ہے جو صدیوں سے ہندوستانی سماج کی نفرت اور حقارت کے عتاب سہتے آئے تھے، ان افسانہ نگاروں نے سماجی، سیاسی اور معاشی استحصال کی طرح جنسی استحصال کے خلاف خاص طور سے صدائیں بلند کی ہیں۔ وہ چراغ جسے ''انگارے'' کے مصنفوں نے 1932 میں مغرب کے اثر سے روشن کیا تھا ان ہی سے روشنی اور حوصلہ لے کر ان فنکاروں نے بھی امکانات کی نئی راہیں ہموار کی ہیں بلکہ ان میں کارل مارکس کا معاشی نظریۂ مساوات اور فرائڈ کی نفسیاتی موشگافیوں نے ان کے فن کو تاثر اور احساس کے نئے افق کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ ان میں زندگی کی پراسراریت اور ابنارملٹی (Abnormality) کو سمجھنے کا ادراک پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مذہب اور اخلاق کی فرسودہ دیواروں کو منہدم کیا اور زندگی کی نئی سرحدیں دریافت کی ہیں۔

ان فنکاروں کے یہاں نہ صرف موضوع بلکہ فن کی سطح پر بھی بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ منٹو اور عصمت کے یہاں افسانے کا Treatment یا زبان اور اسلوب مختلف ہوسکتے ہیں، لیکن کردار نگاری بالخصوص نسوانی کردار کو نفسیاتی اور جنسی سطح پر احساس کی گہرائی میں ڈوب کر پیش کرنے کا انداز حیرت ناک حد تک مماثلت رکھتا ہے۔ اصل میں منٹو اور عصمت دونوں سگمنڈ فرائڈ کے زیر اثر کرداروں کے نفسیاتی تجزیے بڑے انہماک سے پیش کرتے ہیں۔ فرائڈ کے اصول کے مطابق انسان کا ردعمل، اس کا ہر قول اور فعل دراصل بنیادی جبلتوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں جذبات اور بالخصوص جنسی جذبات کو جب دبایا جاتا ہے تو وہ اصل میں دبتے نہیں بلکہ تحت الشعور میں چلے جاتے ہیں اور جب بھی موقع آتا ہے تحت الشعور سے ابھر آتے ہیں۔

اس اصول سے استفادہ کر کے عصمت نے اپنے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے ہر عمر کی عورت کی نفسیات کو پیش کیا ہے لیکن تخصیص کے ساتھ ان کی فنکاری کے جوہر وہاں کھلتے ہیں جہاں وہ عنفوان شباب کے دور سے گزرتی ہوئی دوشیزاؤں کی جنسی گھٹن اور نفسیاتی کشمکش کو اپنا موضوع بناتی ہیں۔

کچھ ایسی ہی کیفیت منٹو کے کرداروں کی بھی ہے خاص طور سے جب وہ کسی بے راہ روی کی شکار، نچلے طبقے کی سن بلوغ کو پہنچتی ہوئی لڑکی یا دوسرے الفاظ میں ویمپ یا طوائف کی زندگی کو منظر عام پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ منٹو نے زیادہ تر گھر سے باہر کی عورتوں خاص طور سے بازار کی عورتوں کی زندگی پر قلم اٹھایا ہے جب کہ عصمت نے گھر کی چار دیواری کے اندر کی پردہ نشیں عورتوں کی زندگی پر زیادہ لکھا ہے۔

عصمت کا فن قدرے اشاریت کا علم بردار تھا۔ انھوں نے گھر کے اندر رہنے والی پردہ نشیں عورتوں کے ان جنسی مسائل کو موضوع بنایا تھا جن پر لکھنا اور چھپنا در کنار محفل میں روبرو گفتگو کرنا بھی عار سمجھا جاتا تھا۔ میری مراد لبیین ازم سے ہے۔ ایک عورت کے ذریعے عورت کے ہم جنسی کے موضوعات نے متداول اور مروجہ ادب میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

عصمت کے یہاں ایک خاص قسم کے موضوعات بھی افسانے میں راہ پائے ہیں جن سے ان کی شناخت بنتی ہے۔ انھوں نے خود کو دانستہ طور پر جین آسٹین (Jane Austen) کی طرح گھریلو زندگی کے گونا گوں موضوعات تک محدود رکھا، جس سے انھیں اس مخصوص کینوس پر زندگی کے گہرے اور باریک رنگوں کو پیش کرنے میں مہارت حاصل ہوگئی۔

ہر چند کہ منٹو کے افسانے موپاساں کی طرح اپنے چونکا دینے والے واقعات، ہیجان انگیزی اور جذبات کی برانگیختگی کے لیے مشہور ہیں ان کے افسانوں میں پہاڑی ندی کی طغیانی جیسا زور ہوتا ہے اور دوسری طرف عصمت کے افسانے اپنی زبان اور اسلوب کے لئے بھی مشہور و مقبول ہیں نیز ان کے افسانوں میں کسی جھرنے کی سی تیزی اور کبھی سبک روی کے ساتھ کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے اور اس کی قل قل چھل چھل کی متواتر آواز کانوں میں رس گھولتی رہتی ہے۔ حتی کہ کہانی کبھی سیدھی، کبھی ٹیڑھی لکیر پر چلتی ہوئی چپکے سے ختم ہوجاتی ہے۔ لیکن ان دونوں فنکاروں کے بیشتر افسانے ایسے ہیں جو کردار پر مبنی ہوتے ہیں اور اپنی عمدہ کردار

نگاری کی وجہ سے ہی شہرت اور پذیرائی رکھتے ہیں۔ان میں ہتک، کالی شلوار، بابو گوپی ناتھ، ممی، شاردا، موذیل، خوشیا، سڑک کے کنارے، دھواں، بو، ٹھنڈا گوشت، سرکنڈوں کے پیچھے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔اس طرح عصمت کے یہاں اس سلسلے میں چوتھی کا جوڑا، لحاف، بچھو پھوپھی، منھی کی نانی، گیندا، ڈائن، دو ہاتھ، جڑیں، ساس، تل، چھوٹی آپا، بھول بھلیاں کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

منٹو اور عصمت نے غالباً ایک ہی طریق کار کو اپنایا لیکن منٹو کے کردار اپنی الگ انفرادیت رکھتے ہیں۔ بلکہ کردار کا غیر معمولی ہونا منٹو کے افسانوں کا لازمی جز ہے۔ان کے برے کردار عام طور پر قاتل، جیب کترے، طوائفیں، پاگل، عادی مجرم، دلال، غنڈے یا اسی قبیل کے دوسرے لوگ ہوتے ہیں جو اچانک قربانی، ایثار، دردمندی اور انسانیت کے اعلیٰ ترین جوہر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور پڑھنے والے کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں اور افسانے کا قاری یہ محسوس کرنے لگتا ہے۔گو، گندی گدڑیوں میں بھی کیسے کیسے گراں قدر لعل و گوہر چھپے ہوتے ہیں۔مزید برآں انسانی کردار کی جبلی عظمتیں کیسے کیسے دھوکا دینے والے کریہہ اور بھیانک پیکروں میں چھپی ہوتی ہیں۔

اس طرح عصمت کے بھی کردار ادب میں اپنی خاص شناخت رکھتے ہیں۔ان کے زیادہ تر کردار گھروں میں رہنے والی پردہ نشیں عورتیں اور نوجوان لڑکیاں ہوا کرتی ہیں۔ان مستورات کی زندگی کے انوکھے اور انجانے حالات زندگی کو اس ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ آج بھی ہمارے فکر ونظر اور علم وعقیدے کو مہمیز لگاتے ہیں۔عصمت نے عورت کو پہلی دفعہ ادب میں پوری آزادی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ کردار نگاری کے فن میں انتہائی باریک بینی اور کمال چابکدستی سے کام لیتی ہیں اور ایک ایک جزیات کی تفصیل بڑے پرلطف انداز سے پیش کرتی ہیں۔

منٹو کے بیش تر نسوانی کردار شہروں کی گندی بستیوں میں مقیم، تیسرے درجے کی بازاری اور بردہ فروش عورتیں ہیں جن کے ہاں پردہ کا کوئی تصور نہیں ہوتا ہے۔لیکن ان، ان پڑھ عورتوں میں بعض مذہبی رسوم سے سچی عقیدت اور انسان دوستی کا مادہ موجود ہوتا ہے۔

عصمت کے زیادہ تر نسوانی کردار متوسط طبقہ کی پردہ نشین مسلم خواتین ہیں۔ان میں ان پڑھ اور تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ بوڑھی اور بچی بھی ہیں۔ شادی شدہ اور کنواری بھی ہیں۔ان کے یہاں شادی، بچہ اور جنس زندگی کی بڑی صداقتیں ہیں۔مردوں کے وصال کے بغیر یہ خود کو ادھوری محسوس کرتی ہیں۔ بڑی عمر کی عورتیں شوہر کی خدمت گزاری اپنا فرض سمجھتی ہیں۔

عصمت بازاری عورتوں کے بیان میں لڑکھڑانے لگتی ہیں۔منٹو گھر کے اندر قدم رکھتے ہی پھسلنے لگتے ہیں۔منٹو کی فنکاری کا اصل میدان بازار ہے جب کہ عصمت کی فنکاری گھر میں لگے پردے کے اندر کرشمہ دکھانے لگتی ہے۔کم سن اور نوجوان لڑکیوں کا بانکپن عصمت نے اپنے افسانوں میں بھر دیا ہے۔منٹو کے ہاں ٹھیٹھ بازاری عورتوں کی فحش اور بھونڈی شہوت انگیزی سے اوراق لرزنے لگتے ہیں۔عصمت نے معصوم نوخیز لڑکیوں کو سماج کی برائیوں کا شکار ہوتی ہوئی دکھایا ہے۔منٹو کے ہاں عصمت فروش عورتوں کے اندر معصوم عورت کی موجودگی دکھائی گئی ہے۔

منٹو اور عصمت کی کردار نگاری کے فن کی مماثلت کا سبب اس عہد کے فنی اور تہذیبی تقاضوں کا شعور ہے اور ان کے فن کا امتیازی وصف ان کے اپنے نرینہ اور نسائی رویے اور زاویۂ نگاہ کا فرق ہے۔

جنس مخالف سے محبت، عورت کی فطرت ہے۔عصمت کے یہاں اس کی ابتدا عموماً نفرت سے ہوتی ہے۔مرد کو متوجہ کرنے کے لیے یہ عورتیں سوجتن کرتی ہیں۔ان کے بظاہر انکار میں اقرار چھپا ہوتا ہے۔وہ مردوں کے اندر اپنی محبت اور چاہت جگانے کے لیے دوسرے مردوں کے ساتھ آنکھیں لڑاتی ہیں تاکہ ان میں جذبہ رقابت (Jealousy) پیدا کرسکیں۔لیکن آخر کار پسپا ہوکر خود سپردگی پر آمادہ ہوجاتی ہیں اور اسی میں ان کی فتح اور نصرت پوشیدہ ہوتی ہے۔

منٹو کے یہاں کسی عورت کے اندر جنس مخالف سے محبت میں ماں کا روپ جھلکتا ہے۔عورت ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔گود میں بچوں کی طرح لے کر تھپتھپانا اور لوریاں دے کر سلانا، عورت کی ازلی خواہش ہوتی ہے۔خاموش اور مکمل خود سپردگی، منٹو کے یہاں عورت کی اعلیٰ جنسی صفات متصور کی جاتی ہیں۔

عصمت کے یہاں عورت میں سوتن ڈاہ موجود ہوتا ہے۔اپنے بے مثال حسن کے آتشیں نظاروں سے وہ دشمن کے تمام دفعائی میکانزم کو پارہ پارہ کردیتی ہے۔ جب کہ منٹو کے یہاں عورت اپنی محبت میں ذرا سی خیانت کے بدلے دشمن کو اور وجہ عداوت کو بھی چھرے اور کرپان سے دم کے دم میں لہولہان کرکے ان کا کام تمام کردیتی ہے۔

عصمت کے یہاں عورت سچی ہندوستانی عورت ہے۔ وہ عورت کے تمام تر یاچر تر کی حامل ہوتی ہے۔منٹو کے یہاں عورت کے خمیر میں شہری زندگی کی تمام تر آلائشیں اس قدر مجتمع ہوگئی ہیں کہ ان کا سچا شفاف جوہر دھندلایا ہوا ضرور معلوم ہوتا ہے تاہم سبک سی تراش سے وہ چمک اٹھتا ہے۔

منٹو اور عصمت کے یہاں عورت کا تصور داستانوی ادب کی طرح سماوی اور رومانوی ادب کی طرح نوری محض نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں عورت اپنی زمین کی خوشبو سے عبارت ہے۔زندگی کی کھردری سچائیوں کا سامنا کرتی ہے۔ان کے یہاں حال سے فرار اور ماضی میں پناہ لینے کی خو نہیں ملتی ہے بلکہ حالات کے تحت وہ بدلتی ہے۔اس کا اپنا مکمل اور انفرادی وجود ہوتا ہے۔حالات کے نشیب وفراز سے گزرنے کے باوجود اس کا عورت پن اپنی فطری ماہیت کے ساتھ کہیں نہ کہیں برقرار رہتا ہے۔اپنی محبت کی خاطر وہ ڈائن تو بن سکتی ہے لیکن ایسی دیوی نہیں جس کے آگے لوگ ماتھے ٹیکیں۔وہ گوشت پوست کی جیتی جاگتی انسان ہوتی ہے جو اپنا حق حاصل کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتی ہے۔

براہِ راست

کسی بھی شخصیت کے اوصافِ حسنہ بیان کرنا خاصا مشکل امر ہے مگر برادرِ محترم و مکرم ڈاکٹر پرویز شہریار صاحب اس قدر من موہنی، مہذب اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک ہیں کہ جی چاہتا ہے، اُن کی شان میں قصیدہ لکھا جائے۔ ایسا قصیدہ جو فن کا شاہکار گر نہ ہو تو پرویز شہریار کی شخصیت کا پَرتو ضرور ہو۔ امیدِ واثق ہے کہ ہماری یہ خواہش مستقبل قریب میں کوئی بلند قامت اہلِ سخن یہ فریضہ بہ حسن و خوبی انجام دیں گے اور اس طرح انجام دیں گے کہ ڈاکٹر پرویز شہریار کی شخصیت و فن کے ان گوشوں کی نقاب کشائی بھی کریں گے جو اہلِ ہنر کی نظر سے ابھی تک پوشیدہ ہیں۔

آیئے ہمیشہ کی طرح آج کی شمعِ محفل ڈاکٹر پرویز شہریار صاحب کے سامنے سجاتے ہوئے نہ صرف اُن کو خوش آمدید کہتے ہیں بلکہ فریضۂ حق سچ کی ادائیگی کا اہتمام بھی کرتے ہیں!!!

.....گلزار جاوید

☆ بندہ پرور، بندہ نواز بلکہ دلنواز پرویز شہریار صاحب قبلہ، جب جب جتنے لمحات آپ کی تنہائی کے امین ہوتے ہیں، تب تب، کون کون، کہاں کہاں سے آپ کی یادوں کا خزینہ لے کر آتا ہے اور کس سبب آتا ہے؟

☆☆ ’ماں‘ کی یاد آتی ہے۔ ویسے تو ماں ایک ایسی ہستی کا نام ہے جس کے دودھ کا قرض اگر وہ معاف نہ کرے تو انسان کسی قیمت پر بھی چُکا نہیں سکتا۔ لیکن میری ماں میں خاص بات یہ تھی کہ میں نے قصہ گوئی کا فن آغوشِ مادر سے ہی سیکھا ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ قصہ گوئی میرے خون میں شامل ہے۔ وہ بہت Extrovert اور حاضر جواب تھیں ساتھ ہی بہت ملنسار بھی تھیں۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ 1964 کے جمشید پور کے فرقہ وارانہ فسادات کے قصے مہمان خواتین کو سنایا کرتی تھیں اور میں ان کی گود میں اگر بیٹھ جاتا اور ان سے فسادات کی تباہی، بربادی اور خون ریزی کی داستان بہت حیرت واستعجاب سے سنا کرتا تھا۔ وہ بہت بہادر تھیں اور بلوائیوں سے کیسے کیسے مقابلہ کیا تھا، وہ سبھی واقعات مجھے اپنی گرفت میں لے لیتے تھے اور میں اپنے کھیل کود چھوڑ کے ان کے بیانات سننا پسند کرتا تھا۔

وہ بہت مہمان نواز خاتون تھیں۔ ہر جمعرات زنانہ میلاد شریف کی محفل سجایا کرتی تھیں۔ ان کی وجہ سے گھر میں ایک رونق رہتی تھی۔ وہ محفلوں میں بلند آواز سے گفتگو کیا کرتی تھیں۔

میں نے اپنی پہلی کتاب ’بڑے شہر کا خواب‘ میں انتساب ان کے نام معنون کیا ہے۔ والدہ مرحومہ شافعہ خاتون کے نام جنھوں نے 16 جنوری 1996 کی انتہائی صبر آزمارات میں اس دارِ فانی کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دیا۔ اللہ مغفرت فرمائے۔ آمین۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
تم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

☆ اب موقع اور محل ان محترم و مہربان شخصیات کو یاد کرنے کا ہے جو آپ کی تعلیم، تنظیم اور تخلیق میں بار آور رہے ہیں؟

☆☆ سائرہ بانو، محمد محسن خان، منظر کاظمی، سید نثار مصطفیٰ، سید احمد شمیم، صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر صادق، محمد حسن اور گوپی چند نارنگ کا تاحیات ممنون و مشکور رہوں گا، جن سے براہِ راست اور بالواسطہ طور سے فیضیاب ہوتا رہا ہوں۔ جوگیندر پال اور ستیہ پال آنند سے تخلیقی ادب کے رموز و نکات کی ادراک اور آگہی حاصل ہوئی۔ اُن کا بھی صدقِ دل سے متشکر ہوں۔ اپنی شریکِ حیات زینت شہریار کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن پر میں نے اردو، ہندی اور انگریزی میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔ علاوہ ازیں، اپنے فرزند سید انشا پرویز اور سید اعیان پرویز کے لیے بھی دعا گو ہوں کہ ان کی طرف سے بھی میرے ادبی جنون میں کسی قسم کی روکاوٹ نہیں پیدا ہونے دی گئی۔

☆ استاد کا نام اخفا رکھنے کے وعدے کے ساتھ گیارہویں نمبر کی بیٹی کے بارے میں کچھ بتلایئے جس سے ملنے کی چاہ میں آپ استاد کو نہ صرف چائے بلکہ تنوری روٹی بھی کھلایا کرتے تھے۔

☆☆ ایسا کوئی خاص معاملہ نہیں ہے۔ لیکن پروفیسر ابن کنول نے اپنے خاکہ ’پرویز سے شہریار تک‘ میں شگفتگی پیدا کرنے کی خاطر اس میں قدرے رومانیت کا رنگ بھر دیا ہے۔ نوری میری ہم جماعت طالبہ تھی اور یہ قصہ مڈل اسکول کا ہے۔ میں نے اپنی ہم جماعت نغمہ پر بھی نظمیں لکھی ہیں اور وہ کلکتہ سے نکلنے والے روزنامہ اخبار مشرق میں شائع بھی ہوئیں۔ اس کے علاوہ، شاہدہ پر ایک افسانہ بھی لکھا جو کہ ’شہرِ نوشیرواں کا ایک یادگار محرم‘ کے عنوان سے ایک تہذیبی مرقع ہے۔ اسی طرح ’کام ہی روشنی‘ میں اپنے ہم جماعت دوستوں میں اعجاز، آفتاب، خورشید اور نظام کا بھی ذکر کیا ہے۔ میں اپنے کردار آس پاس کے چلتے پھرتے افسانوں سے ہی چُنتا آیا ہوں۔ معاشقہ تو کسی سے بھی نہیں ہوا خواہ وہ میرے استاد کی گیارہویں نمبر کی بیٹی ہی کیوں نہ ہو۔

☆ پہلا افسانہ ’پندار‘ پٹنہ، دسویں جماعت کا طالب علم کس تحریک اور رہنمائی کے زیرِ اثر لکھتا ہے اور بوقت اشاعت اس کی کہانی کا نام ’چمبل‘ کی

دسویں رانی' کردیا جاتا ہے؟

☆☆ مجھے اندر سے ہی خواہش ہوتی تھی کہ میں کہانی لکھوں۔اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہوگی کہ جب میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا،تب ہمارے اسکول میں ایک سوینیئر شائع ہوا۔اس میں زیادہ تر بچوں نے چٹکلے، لطیفے، کہانی اور نظمیں شائع ہونے کے لیے جمع کرائی تھیں۔میں نے بھی اپنے والد جو کہ جمشید پور کے ممتاز شاعر تھے، سے کہا کہ کچھ لکھ کردے دیجیے۔اس پر انھوں نے کہا کہ خود سے لکھو۔میں نے نیر کی ایک نظم اٹھائی اور جہاں جہاں کالی بلی لکھا تھا،اسے بھوری بلی کردیا اور والد صاحب کو دکھایا۔یہ نظم لکھی ہے۔لیکن انھوں نے منع کردیا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔اسے مت دو۔

سوینیئر جب شائع ہوا تو میرے اندر ایک حسرت دب کر رہ گئی کہ میں امتیازی نمبروں سے پاس ہونے اور کلاس کا مانیٹر ہونے کے باوجود اس میں شامل نہ ہوسکا۔وہ اندر ہی اندر مجھے تڑپاتی رہی۔اس کا کتھارسس 6 ستمبر 1980 کو ہوا جب میرا پہلا افسانہ شائع ہوا۔اس وقت چمبل کی گھاٹی کی ڈاکو 'پھولن دیوی' کے نام سے لوگ کانپتے تھے۔تب تک 'شعلے' کے 'گبر سنگھ' کے ڈاکوؤں والی فلم بھی دیکھ چکا تھا۔لہٰذا، ذہن تیار ہوگیا کہ ڈاکوؤں کی زندگی کے بارے میں جاننے کے لیے لوگوں کے دلوں میں بہت تجسس رہتا ہے۔کیوں نہ ڈاکوؤں کی زندگی پر کہانی لکھی جائے اور اس طرح میرے اولین افسانے کا موضوع اور عنوان 'چمبل کی دسویں رانی' قرار پایا۔

☆ ابتدائی دور میں 'سایہ سایہ جنگل'، 'نئی روشنی کا آخری ڈرامہ'، 'قصہ گوکالیہ' اور 'شیطان' وغیرہ مقبولیت کی سند نہ پاسکے تو آپ نے اپنے اسلوب، مواد، مزاج کو خود بدلنے اور نیا رنگ دینے کا فیصلہ کیا یا کسی سینئر نے آپ کی توجہ اس جانب دلائی؟

☆☆ یہ سبھی افسانے دہلی آنے سے پہلے کے ہیں۔جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے دورانیے کے تفرق کے علاوہ میرے افسانوی سفر میں بھی دو اہم پڑاؤ رہے ہیں جنھیں دو اہم ادوار پر منقسم کیا جاسکتا ہے۔ 1980 سے 2000 اور پھر 2000 سے 2020 تک کا سفر جس میں میرے اسلوب میں بھی واضح فرق نمودار ہوا ہے۔رسائل اور جرائد ہی میرے رہنما رہے ہیں۔کثرتِ مطالعہ نے میری رہنمائی کی ہے اور یہ فیصلہ میرا خود کا تھا کہ علامت کی بجائے بیانیہ کی طرف رجوع کیا جائے۔دل چسپی یا دل کشی فکشن کا بنیادی وصف ہے۔تجسس جبھی پیدا ہوگا جب کہانی ترسیل و ابلاغ کی حامل ہوگی۔ میرے 2000 کے بعد کی کہانیوں میں یہ عناصر غالب نظر آتے ہیں جنھیں قرأت کے دوران محسوس کیا جاسکتا ہے۔

☆ ابتداء میں آپ نے علامت اور تجرید کے اثرات قبول کرنے کے بعد دوسری راہ کا انتخاب کن وجوہات کی بنا پر کیا اور اس کے اثرات کیا رہے؟

☆☆ 1980 سے میں نے اپنے افسانوی سفر کا آغاز کیا تھا اور 1985 کے پانچ چھ سال کے عرصے میں جدیدیت سے بے حد مرعوب ہوکر علامتی اور تجریدی افسانے کی طرف ملتفت ہوگیا۔مجھے اچانک رشک کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔جمشید پور میں منظر کاظمی واحد معروف افسانہ نگار تھے جو علامتی افسانے کے علمبردار تھے۔ان سے رابطہ ہوا اور ہماری ادبی تنظیم' ادارہ بزم، جمشید پور' کے روح رواں تنویر اختر رومانی نے بھی میرے 'شبخون' میں شائع ہونے پر ایک طرح استقبالیہ نشست رکھی تھی۔ مجھے بہت شہرت ملی۔لیکن اس کے بعد کے تین چار برسوں میں علامتیں بوجھل معلوم ہونے لگیں۔منظر کاظمی صاحب میرے استاد تھے اور ان کے افسانے کی تفہیم کے مراحل سے گزرتے ہوئے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔'شفق' کا ان دنوں ناول آیا تھا' کانچ کا بازی گر' پڑھا تو لگا کہ صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں، معنی عنقا! حالاں کہ شوکت حیات، عبدالصمد، حمید سہروردی، اکرام باگ، م ناگ اور سلام بن رزاق وغیرہ کے جدیدیت کے دور کے علامتی افسانے پڑھتا تھا۔لیکن نجی علامتوں کی وجہ سے ابلاغ کا مسئلہ پیش آنے لگا تھا۔ ان میں عبدالصمد اور سلام بن رزاق غنیمت تھے کہ ان کے افسانوں میں کہانی پن تھا یا حمید سہروردی کے یہاں علامتیں اتنی گنجلک نہیں تھیں۔اس دور میں ایسے افسانے لکھے جارہے تھے کہ قاری تو باؤلا ہوگیا تھا۔کوئی پلاٹ لیس افسانے لکھ رہا تھا تو کوئی اینٹی ہیرو افسانے اور علامتیں شاعری میں بھی ہوتی ہیں مگر وہ روایتی قسم کی، ابلاغ و ترسیل کا معاملہ وہاں اتنا پیچیدہ نہیں ہوتا۔اس کی مختلف تشریحات ہوسکتی ہیں۔مگر افسانے کی تشریحات کون کرتا۔ایسی صورت میں ،اس بات کا رونا رویا جانے لگا کہ قاری گم ہوگیا ہے۔قاری کی تلاش شروع ہوئی اور روٹھے ہوئے قاری کو منانے کے لیے از سرِ نو بیانیہ کی طرف رجوع کیا جانے لگا۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے کچھ ایسا ہوا کہ علامتی دور میں جن رسائل کا ڈنکا بجتا تھا، وہ ایک ایک کرکے بند ہونے کے کگار پر آنے لگے۔اب رسائل کے دور اندیش مدیروں نے بیانیہ کو ترجیح دینی شروع کردی۔

یہی وہ وقت تھا، جب میں نے ہم عصر اجتماعی اسلوب اور انداز تحریر سے یگانگت کی اور عصری حسیت کی پاسداری کرتے ہوئے، علامت کی روش کو ترک کرکے بیانیہ کو لبیک کہا اور منشی پریم چند، خواجہ احمد عباس، منٹو اور راجندر سنگھ بیدی کے رنگ میں خود کو رنگنے کی شعوری کوشش کی۔میری یہ کوشش کامیاب رہی۔

☆ آپ کے مزاج کی کون سی خامی اور ادبی خیموں کی کن برکات نے آپ کو ادب کا تیسرا آدمی بنا کر رکھ دیا ہے؟

☆☆ میں نہ اپنی زندگی میں Extremism کو پسند کرتا ہوں اور نہ ہی ادب میں۔میں نے لیفٹ اور رائیٹ کے مابین ایک پُل کا کام کیا ہے۔مجھے عقلیت پسند، روشن خیال اور ترقی پسند ادب کے ساتھ وجدان اور رومان پسند ادب کے محاسن بھی اتنے ہی متاثر کرتے ہیں۔میں ادب کے چھوٹے بڑے خیموں میں خود کو منقسم کرنے کے بجائے ایک بین الاقوامی تناظر میں دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ میرے لیے اردو کے ساتھ ہندی اور انگریزی زبان بھی اتنی عزیز ہے۔

☆ ہر تخلیق کار کا اپنا اسلوب اور مخصوص انداز تحریر ہوا کرتا ہے، جب کہ آپ موضوع کے حساب سے اسلوب اور تکنیک بدلنے کے عادی بتلائے جاتے ہیں؟

''چہارسُو''

☆☆ دیکھیے، اسلوب کوئی لباس نہیں ہے کہ موقع ومحل اور مختلف تقریبات کے اعتبار سے آدمی اسے بدلتا رہے۔ اسلوب بہت وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو جیسا آپ نے کہا، ہر تخلیق کار کا اپنا اسلوب ہوتا ہے، دوسرا زمانے کا دور بھی ایک اجتماعی اسلوب ہوتا ہے۔ مثلاً رومانی تحریک کے زیر اثر لکھنے والوں کا ایک مخصوص اسلوب تھا۔ ترقی پسند تحریک کے دوران وہ اسلوب یکسر بدل گیا۔ اس طرح اُسّی کی دہائی میں لکھنے والوں کا اسلوب بدلا اور اب مابعد جدیدیت اور اکیسویں صدی کے آغاز سے فکشن کے اسلوب میں ایک قلب ماہیت دیکھنے کو ملتی ہے۔

لہٰذا، میری گزشتہ چالیس برسوں کی تحریروں میں بھی وہ اجتماعی اسلوب کے تغیر کے اثرات نمایاں اور بلیغ طور پر نظر آسکتے ہیں۔ البتہ افسانے کی تکنیک کے تجربات میں نے اکثر و بیشتر کیے ہیں، جس کا اظہار میں نے 'گفتنی' میں بھی کیا ہے اور میرے افسانوں سے بھی اظہر من الشمس ہوتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کسی تخلیق کار کے ادبی سفر کے ارتقاء میں ایک نامیاتی بالیدگی اور مثبت عوامل کا درجہ رکھتے ہیں۔

☆ آپ کی کہانیوں میں آدی باسیوں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ آج کی نشست میں آپ آدی واسیوں کی محرومیوں اور ان کے سدباب پر روشنی ڈالیے۔

☆☆ آج کے اس Information Technology کے دور میں میرا ایک ہی گرو منتر اسم اعظم ہے کہ تعلیم حاصل کرو۔ آدی واسیوں کی زندگی میں تعلیم کی رسائی نہیں ہو پائی ہے۔ آدی واسیوں کا جو قبیلہ تعلیم تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے، ان کی زندگی تیزی سے بدل رہی ہے اور اس کی برکات سے وہ سماج کے مرکزی دھارے سے آکر مل رہے ہیں۔ انھیں اپنی اجتماعی طاقت کا احساس ہو رہا ہے اور اتحاد کے ساتھ اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے وہ آواز بلند کر رہے ہیں۔

ہاں! یہ سچ ہے کہ استماری طاقتوں نے جنگلات کو کاٹ کر انھیں گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ معدنیات کے لیے بھی انھیں اپنی سرزمین سے بے دخل ہونا پڑا تھا۔ لیکن اب ان کے مسائل کی طرف کئی غیر سرکاری تنظیمیں بھی توجہ دے رہی ہیں اور ان کے مسائل کے سدباب کی کوششیں جاری ہیں۔

☆ اس حوالے سے آپ کیا کہنا پسند کریں گے کہ جنس کے بے مہابا استعمال نے آپ کی شخصیت وفن کو کس قدر ضعف پہنچایا ہے؟

☆☆ جنس ہماری زندگی کا جزوئے لاینفک ہے۔ جنس اپنے آپ میں نہ اچھی چیز ہے نہ بُری۔ اس کے غلط استعمال اور Perversion سے صحت مند زندگی کو نقصان پہنچتا ہے۔ میرے افسانے 18 برس سے زیادہ عمر گروپ کے بالغان کے لیے لکھے گئے ہیں۔ بچوں کے لیے میں اپنی کہانیاں الگ سے بچوں کے رسائل میں بھیج دیتا ہوں۔ اب اگر بچے میری ان کہانیوں کو پڑھنے کی کوشش کریں گے جو بالغان کے لیے لکھے گئے ہیں تو ان کا اخلاق خراب ہوگا ہی۔

☆ عورت اور مرد کے وہ کون سے باطنی معاملات ہیں جن کو سلجھانا آپ کے خیال میں ضروری ہو گیا ہے؟

☆☆ رشتوں کی پائیداری آپسی افہام وتفہیم پر منحصر ہوتی ہے۔ خواہ کوئی بھی معاملات ہوں، دو فریقین کے مابین اگر سمجھداری نہیں ہوگی تو وہ معاملات آگے نہیں بڑھ پائیں گے۔ عورت اور مرد کے درمیان اگر محبت ہے تو باقی ساری باتیں اضافی ہوتی ہیں جو کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ عورت ہر حال میں مرد کے ساتھ نباہ کر سکتی ہے اگر مرد اسے اس کے حصے کا پیار دینے میں کامیاب ہے۔ وہ اپنی محبت میں خیانت برداشت نہیں کر سکتی چاہے، میرے افسانے 'سہاگ کا خون' کی دیو یا نی ہو یا سعادت حسن منٹو کے افسانے 'ٹھنڈا گوشت' کی کلونت کور۔ یہ بات جس دن مرد سمجھ جائے گا اس کی زندگی میں باغ بہشت کے کینوں کی سی آسودگی اور دلنوازی بحال ہو جائے گی۔

☆ آپ جیسے خوش شکل، خوش لباس اور خوش فکر شخص کے لیے لفظ صوفی اور تصوف کی فکریات کو ہضم کرنے میں دقت پیش آرہی ہے؟

☆☆ صوفیانہ طرز فکر میرے ڈی این اے میں موجود ہے۔ ہمارے آباواجداد بغداد سے شاہ جہاں کے وقت میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ وہ قاضی اور مفتی ہوا کرتے تھے۔ چند پشتوں قبل ہمارا سلسلہ نسب شرف الدین یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ سے جا ملتا ہے۔ میرے والد صاحب کی تربیت دائرہ شاہ اجمل میں ہوئی اور اجمل اجملی میرے والد صاحب کے بچپن کے دوست تھے۔ خانقاہوں سے ہماری نسبت رہی ہے۔ میں خود بھی بارے اشتیاق دائرہ شاہ اجمل اور دائرہ شاہ ارزاں کے روحانی ماحول میں دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر زندگی کی چند پرسکون ساعتیں گزار آیا ہوں۔ پروفیسر سراج اجملی بھی میرے بھائی ہیں۔ مجھے ایسی جگہوں پر ایک پُراسرار کشش اپنی طرف کھینچتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ میرے اندر یہ روحانی مادّہ پہلے سے ہی موجود تھا، جس کی وجہ سے مجھے صوفیانہ ماحول میں سکون میسر آتا ہے۔ کئی درگاہوں اور خانقاہوں میں تواتر سے حاضری لگتی رہی ہے۔

☆ یہی وہ موقع اور محل ہے جہاں بھکتی تحریک اور اس کی بابت آپ کے نقطہ نظر پر کھل کر بات کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

☆☆ بھکتی تحریک کے دوران خدائے واحد لاشریک کی بات پر زور دیا گیا تھا۔ مادیت سے ہٹ کر روحانیت اور غیر ضروری رسم ورواج سے ہٹ کر خدائے واحد کی عبادت پر زور دیا گیا تھا۔ مذہب کے معقولیت پسند اصولوں کی تجدید کی گئی ہے۔

میں بھی سمجھتا ہوں کہ خدا واحد ولاشریک ہے اور اس کو الگ الگ زبانوں میں اور الگ الگ زمانوں میں مختلف ناموں کے ذریعے بلایا گیا، لیکن وہ حقیقتاً ایک ہے۔ ہم سب اسی ایک خدا کے بندے ہیں، ہماری تہذیب مختلف ہو سکتی ہے، ہماری زبان اور ملک مختلف ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے جسد خاکی کے حیاتیاتی نظام ایک سے ہیں۔ ہماری بیماریوں کا علاج بھی ایک جیسا ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے، جب ہمارا خدا بھی ایک ہو، ہر سچا مذہب ہمیں توہم پرستی سے

روکتا ہے۔صوفی اور سنت سب اسی کی حمد گاتے ہیں۔

☆ برصغیر کی لگ بھگ تین چوتھائی آبادی دیہات یا دور دراز کے پس ماندہ علاقوں میں مقیم ہے جبکہ آپ کے یہاں اکثر و بیشتر شہر کی فیشن ایبل عورت کو موضوعِ سخن بنایا جاتا ہے جو اپنی شرائط پر جنسی معاملات کی حدیں قائم کرتی ہے؟

☆☆ آپ کے سوال کے پہلے حصے سے سو فیصدی اتفاق کرتا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میری زندگی کا تین چوتھائی حصہ شہر میں گزرا ہے۔میرے افسانوں میں تین چوتھائی افسانے شہری زندگی سے پیدا ہونے والے مسائل کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔بلکہ کئی افسانے فرانس اور کناڈا کی عورتوں پر بھی موقوف ہیں۔تمام مذاہب کی خواتین کرداروں پر موقوف ہیں۔مثلاً 'شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں' کی مرکزی کردار ایک یہودن عورت ہے۔اُس میں آدم اور حوا کے عقائد کو توریت کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔

لیکن گاؤں کا بھی ذکر ہے۔'شال باف کی بیٹی' میں کشمیری لڑکی، 'داسی تیرے چرنوں کی' میں خالص گاؤں کی ایک لڑکی اور ڈاکو کی محبت کی کہانی ہے۔'دس سروں والا بجوکا' گاؤں کی زندگی پر لکھا گیا افسانہ ہے۔اس کی وجہ بالکل واضح ہے کہ جو چیز فنکار کے مشاہدے میں آتی ہے، فنکار کا فرض ہے کہ اس پر اظہارِ خیال کرے اور یہی میں نے بھی کیا ہے جسے میرے قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔لہٰذا، میں اپنے اس تخلیقی رویے سے کافی مطمئن ہوں۔

☆ آپ کے لیے عصری سماج کا نباض اور فکری و فنی معنویت کا معمار جیسے الفاظ حقیقت میں کسی کارنامے کے عوض استعمال کیے گئے ہیں یا مروت اور دوستداری کی عطا ہیں؟

☆☆ اس سوال کے جواب پر میرا لب کشائی کرنا مناسب نہیں، میں سب ہی کے اظہارِ خیال کا احترام کرتا ہوں۔خواہ وہ میرے دوست واحباب ہوں یا میرے نقاد بلکہ ادب میں تنقید نگار آپ کے بہترین دوست ہوتے ہیں جو آپ کو آپ کی صلاحیتوں سے واقف کراتے ہیں اور بالواسطہ آپ کے فن میں مزید جلا بخشنے کا باعث ثابت ہوتے ہیں۔کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ''آلوچک ہمارے پرم مِتر ہیں''۔جو آپ کی خامیوں کو رگوا کر ایک بہتر فنکار بننے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

☆ کم وبیش ہر تخلیق کار اپنے طور پر نئے موضوعات اور نئے اسلوب کا داعی ہوا کرتا ہے۔آپ کے بارے میں اختصاص کے ساتھ اس کا ذکر کرنے والے کس نئے زاویے اور روشن پہلو کی جانب نشان دہی کر رہے ہیں خصوصیت کے ساتھ شہر کی چکا چوند کے کس ابعاد سے متعارف کرایا ہے آپ نے؟

☆☆ گاؤں سے تلاشِ معاش میں ہجرت کر کے شہر میں آنے والے نفوس مادّی آسائش کے حصول میں کامیاب تو ہو جاتے ہیں لیکن ان کا دل ہر دم گاؤں کی طرف پلٹ کر دیکھتا رہتا ہے۔شہری زندگی میں وہ آسودگی نہیں ہے جو گاؤں میں اپنوں کے درمیان بآسانی میسر رہتی ہے۔شہری زندگی میں طمع ہے، محرومی ہے اور تنہائی ہے۔ہر طرح کی بدعنوانیوں کا راج ہے، عورت محفوظ نہیں ہے، سچائی کا کوئی مول نہیں ہے۔پوری دنیا میں یہی صورت حال ہے۔اس کل جُگ میں شہر کی زندگی محال ہے۔پھر بھی اس کی چاہت کم نہیں ہوتی اور آئے دن لوگ گاؤں سے جوق در جوق شہر کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔یہ آج کے انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔اسی طرح کے موضوعات میرے افسانوں اور نظموں میں اختصاص کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

☆ بہت معذرت اور احترام کے ساتھ اس مخالفانہ رائے کی بابت آپ کا نقطہ نظر جاننا ضروری ہے کہ آپ کے فن پارے تخلیق کی بجائے تالیف کے زمرے میں شمار کرنے اور انگریزی ادب سے مستعار بتلانے والے کس قدر حق بجانب ٹھہرائے جا سکتے ہیں؟

☆☆ میں نے انگریزی ادب کا بھی آنرس لیول تک مطالعہ کیا ہے۔آج کے گلوبل ولیج کے دور میں جبکہ دنیا بہت سمٹ چکی ہے۔فارسی ادب، ہندی ادب، انگریزی ادب اور اردو ادب میں حد فاصل اب گزشتہ صدی کی طرح قائم نہیں کیا جا سکتی۔انٹرنیٹ کی سہولیات کے بعد ہم بآسانی عربی، یونانی اور فرانسیسی شعرا کے بھی تازہ ترین کلام سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے۔لیکن میرے افسانے اور میری نظمیں تالیف محض نہیں ہیں، بلکہ یہ تخلیق کے ہی زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔اس سوال میں معذرت کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔آپ میرے لیے بہت محترم ہیں۔

☆ 'شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں' آپ نے جن برائیوں کا ذکر کیا ہے وہ آپ کی نسل کے لیے نئی ہو سکتی ہیں وگرنہ پرانی نسل کے باخبر لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ بیگمات کی تبدیلی نصف صدی قبل بھی key کلب کے نام سے مغربی ممالک میں ہوا کرتی تھی۔'لوان ریلیشن' بھی کم وبیش اتنے ہی عرصے سے برصغیر میں بھی عام ہے۔ہمارے معاشرے میں ایسے جوڑوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو شادی سے قبل سال دو سال نہیں بلکہ ایک دہائی تک 'لوان ریلیشن' میں رہے اور ایک سے زائد تعلق نبھائے؟

☆☆ ادب میں 'کیا' سے زیادہ 'کیسے' کی اہمیت ہوتی ہے۔تمام فنون لطیفہ کا مرکزی خیال مرد اور عورت کے جذباتی رشتوں سے نمو پذیر ہوتا ہے۔یہ جسمانی محبت فرشتوں کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔آدم اور حوا سے یہ دنیا سات آٹھ ارب کی آبادی تک پہنچ گئی۔خدا نے اس کام میں اگر کشش نہیں رکھی ہوتی تو شاید یہ دنیا اتنی بالیدہ اور جاذب نہیں ہوتی۔دُنیا کے قوانین، اصول وضوابط اپنی جگہ، محبت اپنی جگہ ہے۔دو پیار کرنے والے نہ رنگ دیکھتے ہیں نہ نسل، نہ مذہب نہ ملک، نہ دولت نہ ذات۔یہ سب انسان نے بنائے ہیں۔قدرت نے ہر جاندار کے جوڑے بنائے ہیں جس سے فطری طور پر افزائشِ نسل کا تفاعل جاری رہتا ہے۔

ادب کا منصب اخلاق کی تعلیم نہیں ہے۔لہٰذا، میرے مشاہدے میں جو بات آئی اسے ایک دلکش انداز سے فن پارے میں تبدیل کر دیا۔فکشن کا بنیادی عنصر تجسس ہے۔میرے مذکورہ دونوں افسانے بے حد پسند کیے گئے ہیں۔مرد اور عورت کی محبت پر یہ حرف آخر نہیں ہیں۔اس طرح کے موضوعات

پر مجھ سے پہلے بھی افسانے لکھے گئے ہیں۔ میرے بعد بھی لکھے جائیں گے۔ مگر یہ اسلوب میرا منفرد اسلوب ہے، جس پر مجھے ناز ہے۔

☆ تیسری دُنیا بالخصوص اردو ادیبوں کے ذہنوں پر عورت کے سوار رہنے کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ آپ بھی اس الزام سے مبرا نہیں ہیں۔

☆☆ عورت بے شک سوار ہے، لیکن تناظر بدل گیا ہے۔ موپاساں کا تعلق مغرب سے تھا لیکن اس پر عورت سوار تھی اور ایسے کئی ادیب مل جائیں گے، لیکن آپ کی بات درست ہے کہ مشرق میں یہ بات عمومی طور سے مشاہدے میں آتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بیشتر مذاہب کی اُتپتی مشرق میں یا مشرق وسطیٰ میں ہوئی ہے اور دُنیا کے تمام مذاہب نے عورت کو بہت خاص مقام عطا کیا ہے۔ ہماری نصف آبادی کو ادب میں وہی مقام دینا اچھی بات ہے۔ میں نے بھی دس سال کی شاہدہ (شہرِ نوشیرواں کا ایک یادگار محرم) سے لے کر ستر سال کی بتولن بی بی (بتولن ڈائن کیسے بن گئی) تک کا ذکر کیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ بنتِ حوا کی خدمات کو میں نے کہیں بھی Ignore نہیں کیا ہے۔

☆ جناب حقانی القاسمی اور شموئل احمد صاحبان نے آپ کو بیدی اور عصمت کے زیرِ اثر بتلا کر آپ کی شان بڑھائی ہے یا کسی خامی کی طرف اشارہ کیا ہے؟

☆☆ انھوں نے اس طرف اشارہ کر کے اپنی بھی شان بڑھائی ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ میرے افسانے کو پڑھ کر انھیں بیدی اور منٹو جیسے عظیم افسانہ نگاروں کا خیال آ گیا۔

میرے افسانہ 'دس سروں والا بجوکا' کو سن کر مسندِ صدارت پر جلوہ افروز جوگندر پال کو پریم چند اور سریندر پرکاش کا خیال آ گیا تھا۔ 'قصہ گو کی تراجدی' کو سن کر زیب اذکار اور انجیلا ہمیش کو احمد ہمیش یاد آ گئے تھے۔ یہ میری تحریر کی کامیابی ہے کہ میں نے اردو فکشن کی روایت کو زندہ رکھا ہے۔ حقانی القاسمی اور شموئل احمد کے اقوال میرے لیے اعزاز کی بات ہیں۔

☆ منظر کلیم صاحب نے آپ کے افسانوں پر پریم چند کی چھاپ بتلا کر آپ کا قد اونچا کرنے کی دانستہ کوشش کی ہے یا۔۔۔؟

☆☆ منظر کلیم مرحوم کو اللہ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین)۔ اب وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ لیکن ان کا احترام کرتا ہوں۔ پریم چند سے کسی افسانہ نگار کا نام جڑ جانا لمحہ فخریہ ہے اور باعث صد افتخار ہے۔ پریم چند کی روش پر چلنے والوں کی ایک لمبی قطار ہے۔ عظیم کریوی سے لے کر سہیل عظیم آبادی اور کلام حیدری تک افسانہ نگاروں کا ایک بڑا قافلہ ہے جس کے علمبردار بلکہ بنیادگزار ہندی ساہتیہ میں جنھیں 'کہانی سمراٹ' کہتے ہیں، وہ پریم چند ہیں۔ جنھوں نے ہندوستان (تقسیم ملک سے پہلے) کے گاؤں اور دیہات کو اپنی کہانیوں اور ناولوں میں زندہ جاوید کر دیا ہے۔

☆ ڈاکٹر مشتاق وانی علی الاعلان آپ کے افسانوں کو منٹو رنگ میں رنگا ہوا بتلا کر کس بات کو واضح کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ دیکھیے، سعادت حسن منٹو کی بے باکی اور ترقی پسندانہ حقیقت نگاری مجھے بے حد عزیز ہیں۔ ممکن ہے کہ مشتاق احمد وانی صاحب نے سعادت حسن منٹو کا نسبتاً زیادہ مطالعہ کیا ہو۔ اس وجہ سے میرے افسانوں سے وہ منٹو رنگ کشید کرنے میں زیادہ کامیاب ہو گئے، ورنہ گزشتہ سوالوں کے جواب میں عرض کر چکا ہوں کہ پریم چند اور راجندر سنگھ بیدی کی روایت کی بھی پاسداری میرے افسانوں میں موجود ہے۔ ادیب اپنی زبان کی روایت سے یکسر مفر حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ ادب کسی خلا میں جنم نہیں لیتا ہے۔ میرے حصے کی جو زمین ہے اُس کی فضا میں بھی مذکورہ سبھی افسانہ نگاروں کا رنگ گھُلا ہوا ہے۔

☆ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے اس اصلی محور کی نشان دہی فرمایئے جس کو آپ نے 'منٹو اور عصمت' میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے؟

☆☆ میں نے اپنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے دوران ماسٹر آف فلاسفی کے تحقیقی مقالہ کے طور پر جس موضوع کا انتخاب اپنے نگراں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی رہنمائی میں کیا تھا وہ ہے 'منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور' (کرداری نگاری کا سماجیاتی اور تقابلی مطالعہ)۔

میں نے سماجیاتی (Sociological) مطالعہ کے دوران عورت کی سماجی حیثیت کی مختلف الابعاد اور جہات پر ریسرچ کی ہے۔

منٹو اور عصمت ترقی پسند اور انسان دوست افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے عورت کی بوقلمونیوں کو بہت ہی انسانی ہمدردی کے ساتھ پیش کیا ہے اور جہاں کہیں بھی Doxa دیکھا، ریاکاری اور منافقت دیکھی، اسے بے باکی سے طشت از بام کرنے کی جرأت مندانہ کوشش کی ہے۔ مذہب کے ٹھیکیداروں نے اُن پر فحاشی کا الزام لگایا اور ان پر مقدمہ چلایا۔ لیکن بالآخر، انھیں منھ کی کھانی پڑی۔

☆ آپ کے خیال میں سید وقار عظیم کے دور کی کہانی کی تعریف کب اور کیونکر تبدیل ہوئی اور نئے فکشن کو کسی نئے انجام سے چونکانے یا توجہ دلانے کی ضرورت نہیں رہی تو قاری کو دینے کے لیے آج کے ادیب کے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے؟

☆☆ آج کی کہانی میں سید وقار عظیم کے دور کی کہانیوں کی طرح ہیرو، ہیروئن اور ویلن سیدھے سپاٹ طریقے سے بیان نہیں ہوتے۔ بلکہ معاشرتی پیچیدگی کے تحت ہمارے اظہار اور فن پارے میں بھی قدرے پیچیدگی آ گئی ہے۔ موضوع کے ٹریٹمنٹ اور بیانیہ میں تہہ داری آ گئی ہے۔

آج 'کسی صورت حال' کو ہم ویلن کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں۔ کبھی کبھی پورا شہر ایک کردار کے طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ ہم خود اپنے اندر کے ہمزاد سے بعض اوقات مکالمہ قائم کر لیتے ہیں اور ہماری ذات میں ہی دو متضاد کردار نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ سب پرو ٹوٹائپ افسانہ سے بہت آگے کی چیز ہیں۔

فکشن کا بنیادی عنصر کہانی پن ہے۔ اس سے روگرداں نہیں ہونا چاہیے۔ ماضی قریب میں ہم نے اس کا انجام اچھی طرح سے بھگتا ہے۔ اس

لیے قصہ پن کے حوالے سے مجھے کہنے دیجیے کہ کہانی خواہ کتنی بھی بلند پرواز ہو جائے، اُسے واپس اسی سیدو وقار عظیم کی زمین پر آنا پڑے گا۔ انھیں ساتھ لے کر ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔

☆ سارتر کی وجودیت اور کارل مارکس کے فکری افکار نے مادی اعتبار سے انسانی بازیافت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا آج وہ کس مرحلے میں ہے اور استفادے کے اس پیغام کو آج کا ادیب کس طور پر اپنا راہنما بنا سکتا ہے؟

☆☆ ہمارے پروفیسر محمد حسن ترقی پسند تھے۔ لیکن کلاس روم میں تنقیدی نظریے پڑھاتے وقت اکثر کہا کرتے تھے کہ دنیا میں کوئی بھی 'ازم' حرف آخر نہیں ہے۔ وقتی طور پر وہ بہترین نظر آتے ہیں لیکن ان میں بھی کچھ خامیاں ہوتی ہیں۔ ارسطو سے ایلیٹ تک جتنے بھی نظریہ ساز، مفکر اور نقاد ہوئے ہیں۔ ان کے نظریات ایک مدت کے بعد فرسودہ اور از کار رفتہ معلوم ہونے لگتے ہیں۔

کارل مارکس اپنی کمیونزم کے لیے آج بھی معنویت رکھتے ہیں۔ اسی طرح سارتر کی وجودیت بھی انسانی اقدار کی حریت کے لیے اتنی ہی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اس وقت دونوں ہی معنویت رکھتے ہیں اور پوری شدومد کے ساتھ اہمیت کے حامل ہیں۔

☆ مطالعہ اور اس کے اثرات تخلیق کار کی بنیادی اساس ہوا کرتے ہیں مگر جس طرح آپ نے سگمنڈ فرائڈ، اوہنری اور موپاساں سے براہِ راست کسبِ فیض کا ذکر کیا ہے اس کی روشنی میں منٹو اور عصمت کے قد کاٹھ پر کسی نہ کسی طور زد ضرور پڑتی ہے؟

☆☆ سگمنڈ فرائڈ سے ایک عالم نے استفادہ کیا ہے، ان کی تحلیل نفسی اور جنسی تفہیم کے رویئے سے علمی سطح پر منٹو اور عصمت نے یقینی طور پر استفادہ کیا ہے لیکن جب بات طرز اظہار اور بیانیہ کی آتی ہے تو ایک حد تک منٹو موپاساں کے نرینہ بیانیہ (Male Narratology) سے قریب نظر آتے ہیں۔ خصوصی طور پر جب وہ جنسی تفاعل کی جزیات کے دوران عورت کے ذہنی کوائف کو بیان کرتے ہیں۔ وہ وجدان کے تحت یہ سب نہیں لکھتے بلکہ خارجی اور ٹھوس حقیقت کے زیر اثر جسم میں ہونے والے متغیرات کو بڑی فنکارانہ چابکدستی سے بیان کر جاتے ہیں۔

البتہ عصمت چغتائی نے نسائی بیانیہ میں اپنی ذات کو انڈیل دیا ہے۔ 'ننھی کی نانی'، 'چھوئی موئی'، 'تل' اور 'گیندا' وغیرہ جیسے افسانے ہیں جو عورت کی نازک ذہنی اور جسمانی تغیرات کو بہت نزاکت اور لطافت کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر، وہ رشید جہاں کے زاویہ نگاہ سے بھی بہت آگے نکل جاتی ہیں۔

لہٰذا، مغرب سے مرعوب ہونے کی بجائے ہم اپنی چیزوں کو Appreciate کرنا سیکھیں تو بازی پلٹ بھی سکتی ہے۔ عصمت کے یہاں نسائی بیانیہ (Gyno- Narratology) کے تمام تر محاسن بہت نمایاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ، علمی سطح پر کسبِ فیض سے کسی کے قد و کاٹھ پر ضرب نہیں پڑنی چاہیے۔

☆ حقانی القاسمی صاحب نے آپ کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے 'لِوان ریلیشن' کے ابتدائی حصے کو حذف کرنے اور افسانے کی ابتدا بہ انداز دیگر کرنے کی جو تجویز دی ہے اس کی بابت آپ کا ردعمل کیا ہے۔ نیز مستقبل قریب میں اگر کوئی دوست یا نقاد آپ کو اس طرح کے مشورے دے تو آپ اس پر عمل کرنا پسند کریں گے؟

☆☆ حقانی صاحب کی رائے کا احترام کرتا ہوں۔ آپ صحافی بھی ہیں اور نقاد بھی۔ اس افسانے کو پہلی بار حقانی صاحب نے بغیر کسی کتر بیونت کے عالمی راشٹریہ سہارا کی میگزین میں تصاویر کے ساتھ شائع کیا تھا۔ تب انھوں نے اس پر کوئی رائے نہیں دی تھی۔ میں اس کی اشاعت کے لیے ان کا بصمیم قلب مشکور و ممنون ہوں۔

☆ بقول سعادت سعید تمام تر روشن خیالی کے باوجود آپ نے کعبے کی پشت پناہی سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ آپ کے خیال میں روشن خیالی اور کعبے کی پیروی کے درمیان کس قسم کی رکاوٹ اور فاصلے حائل ہیں اور انھیں پاٹنے کا طریقہ کیا ہے؟

☆☆ روشن خیالی کا مطلب میرے نزدیک دُنیا زادیا ناستک ہونا نہیں ہے۔ ایک شخص دیندار ہوتے ہوئے بھی روشن خیال اور تعقل پسند ہو سکتا ہے۔ میرے نزدیک روشن خیالی کا ضد قنوطیت پسندی اور Orthodoxy ہے۔ لہٰذا کعبے سے انحراف کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ غالب وحدت الوجود کے قائل تھے، ان کا توحید پر عقیدہ راسخ تھا لیکن پھر بھی روشن خیال تھے۔ مجھے تصوف اور معرفت کہیں بھی روشن خیال ہونے سے نہیں روکتے ہیں۔ یہ چیزیں میری زندگی میں کہیں حائل نہیں ہوتیں۔ اُسے پاٹنے کا میرے پاس طریقہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے۔ اسے مختلف ناموں، مختلف انداز سے ضرورت مند یاد کرتے ہیں اور وہ سب کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ روشن خیالوں کے بھی اور غیر روشن خیالوں کے بھی۔ میری نظموں میں اکثر ایسے موضوعات آپ دیکھ سکیں گے۔ عشق کے بغیر کامیابی ممکن نہیں ہے۔

☆ بحر و اوزان ایک طرح سے ڈسپلن کا دوسرا نام ہے۔ ان حصاروں میں دم گھٹنے کا مطلب محنت سے فرار بھی لیا جا سکتا ہے؟

☆☆ آپ کے اس سوال کے حصہ اوّل سے صد فیصدی متفق ہوں، لیکن دوسرے حصے سے جزوی طور پر اختلافِ رائے رکھتا ہوں۔ کیوں کہ شاعری کے لیے موزوں طبع ہونا لازمی شرط ہے۔ آمد کی شاعری بہتر ہوتی ہے۔ غزل میں اگر آورد کی کیفیت حاوی ہو جائے تو شعر کا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ غزل داخلی جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ دل اگر نہ لگ رہا ہو تو شاعری بیکار ہے۔

☆ اس تصور بلکہ ٹھوس حقیقت کے بارے میں آپ کیا کہنا پسند کریں گے کہ باوجود کوشش کے بحر و اوزان جن لوگوں کی دسترس میں نہیں آتے وہ آزاد اور نثری شاعری کے مسافر بن کر غزل مخالف لابی کے سفیر بن جاتے ہیں؟

☆☆ آج کل تو بحر و اوزان جن لوگوں کی دسترس میں نہیں آتے وہ ان میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کسی استاد شاعر سے غزل لکھوا کر مشاعرے میں

اپنا جلوہ بکھیر کر مشاعرے کے فیشن ایبل سامعین سے واہ واہی بٹور لاتے ہیں۔

لیکن ہاں! جو جینوین شاعری میری مراد فکری شاعری کرنا چاہتے ہیں اور پابند شاعری کے لیے خود کو موزوں طبع نہیں پاتے ہیں، وہ آزاد شاعری کو فوقیت دیتے ہیں۔ بعض ایسے شاعر بھی ہیں خود میرے والد شہاب قاضی پوری جو غزل گو بھی تھے اور نثری نظمیں انھوں نے بھی کہی ہیں۔

یہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کس موضوع پر بات کرنا چاہتے ہیں۔ اگر الطاف حسین حالی 'مناجات بیوہ' لکھنا چاہتے ہیں تو وہ بات غزل کے سہارے نہیں کہہ سکتے۔ 'مدوجزر اسلام' جیسے موضوع پر اظہار خیال کرنے کے لیے انھیں 'مسدس حالی' لکھنا پڑی۔ خیال اپنے ساتھ ہیئت لے کر آتا ہے۔

☆ شاعری کے باب میں ن۔م۔ راشد اور میراجی سے استفادے کے ساتھ ان کے مصرعے برتنے کی بابت بھی وضاحت ضروری ہے؟

☆☆ موسم کے ساتھ جس طرح بدلتے رہنا ضروری ہے، اسی طرح اپنی جڑ سے جڑے رہنا بھی لازمی ہے۔ ورنہ بے جڑ کے پودے اپنی فطری بالیدگی کھو کر تناور درخت بننے کے بجائے بونسائی جیسے بونے پودوں میں ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔

میں نے اپنی روایت کی پاسداری کی ہے۔ اپنے اکابر کو خراج عقیدت کے طور پر ان کے انداز اور بعض نظموں میں ان کی کسی عبارت سے اپنی نظم کا آغاز کیا ہے تاکہ اپنے شاندار ماضی سے اپنا اور قارئین کا رشتہ استوار کر سکوں۔ میری نظموں کو محفلوں میں سن کر میراجی، اختر الایمان اور اختر شیرانی کو احباب نے یاد کیا ہے۔

☆ دس شعرا کے ایک ساتھ طویل نظم لکھنے اور اس کی تشہیر کے پیچھے کیا مقاصد اور فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ نیز اس منصوبے کا ماخذ کیا ہے؟

☆☆ اس منصوبے کا ماخذ یہ ہے کہ شعرا اپنے کلام سے ایک بہتر دنیا کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ عالمی شاعری میں یہ چلن تیزی سے عام ہو رہا ہے۔ مختلف براعظموں کے شعرا انگریزی زبان میں اپنی تخلیقات پیش کر رہے ہیں اور یک موضوعی شاعری کے ذریعہ دُنیا کو امن اور محبت کا پیغام دے رہے ہیں۔ اس طرح کی کوششوں کے پیچھے منطق یہ ہے کہ جس طرح باغ میں عندلیب اپنی نغمہ سرائی سے خوش گوار ماحول تیار کر دیتا ہے، اسی طرح شاعر بھی اپنے امن و محبت کے گیت سے سیاسی تناؤ اور مذہبی تضاد کو دور کرنے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس مشینی دور (کل جگ) میں انسانیت کا احیا اور اخوت کی بحالی شعرا اپنے کلام کے توسط سے کر سکتے ہیں۔ میں نے ایسی کئی ایک Collaborative نظمیں لکھی ہیں جو دیر یا سویر اینتھولوجی کی شکل میں منظر عام پر آ چکی ہیں اور کچھ مستقبل قریب میں آنے والی ہیں۔

☆ آپ کی شاعری کو حادثاتی شاعری کہنے والے تخلیقی وجدان کی کمی کا اشارہ تو نہیں دے رہے؟

☆☆ ممکن ہے، میری حادثاتی اور واقعاتی شاعری کو بعض نقاد میری تخلیقی وجدان کی کمی پر محمول سمجھتے ہوں، مثلاً 'ہم امن چاہتے ہیں'، 'کھاڑی یدھ کی باتیں'، 'قتلِ صدام حسین'، 'شیطان بزرگ کو خدا ماننے والو!' وغیرہ۔ لیکن اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ان میں آپ کو قومی اور بین الاقوامی سیاسی بصیرت اور انسانی حقوق کی پامالی کے شعور سے روبرو ہونے کے لیے مواقع ملیں گے نیز 'مٹی کا دیا' اور 'پاپ کا گھڑا' جیسی نظموں میں صوفیانہ خیال کو مادّی اشیا کے حوالے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وجدان کی بھی نظمیں کہی ہیں میں نے، لیکن اس طرح کی نظموں کا تناسب زیادہ نہیں ہے۔ میری نظموں میں شہریت زیادہ ہے، وحشت کم ملے گی۔

☆ بقول آپ کے نوجوانوں کی ذہنی سطح پر جانے کے لیے آپ کو نثری نظم کا سہارا لینا پڑا، اس کا مطلب ہے میر، غالب اور اقبال جیسے عروضیے اپنے دور کے نوجوانوں کی ذہنی سطح سمجھنے سے قاصر تھے؟

☆☆ میر اور غالب کا زمانہ اور تھا، ہمارا زمانہ کچھ اور ہے۔ آج کے نوجوانوں کے پاس عشق کا وہ انداز اور قرینہ نہیں ہے جو میر، غالب اور اقبال کے یہاں ملتا ہے۔ جس طرح آتش و ناسخ کے زمانے میں شاعری کے بناؤ سنگھار پر، ظاہری حسن پر توجہ صرف کی جاتی تھی، اب نہیں کی جاتی ہے۔ ہر خیال اپنے ساتھ اپنی جداگانہ ہیئت بھی لے کر آتا ہے۔ عشق اب بھی ہو رہا ہے، اس کا انداز بدل گیا ہے۔ میری سہل اور عام فہم زبان میں کہی گئی نثری نظمیں بہت آسانی سے ہندی (دیوناگری) اور انگریزی میں منتقل کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح میں زیادہ سے زیادہ قارئین تک رسائی حاصل کر لیتا ہوں۔ اس میں کیا مضائقہ ہے؟

ویسے بھی آج کل کے نوجوانوں کے پاس معشوقہ کی زلفوں کے پیچ و خم کو سلجھانے کا وقت نہیں ہے بلکہ آج کی محبوبائیں بھی اس بات کو بخوبی سمجھتی ہیں کہ بالوں کو Straightener سے چند منٹوں میں سیدھا کر لینا ہی بہتر ہے، بجائے کسی عاشق نامراد کے منت کش ہونے سے۔ یہی وجہ ہے کہ میری شاعری میں معنی عنقا نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی قسم کی شعبدہ بازی ہوتی ہے۔ میں ذاتی طور پر کولہو کے بیل کی طرح ایک مخصوص دائرے میں گردش کرتے رہنے کو پسند نہیں کر سکتا اور آپ جانتے ہی ہیں کہ جدت پسندوں کو تکرار کی خو نہیں۔

☆ ہم اور ہمارے قارئین تنقید میں اُس انفرادی روش سے آگاہی کے خواہش مند ہیں جس کا کریڈیٹ تہران یونیورسیٹی کی ڈاکٹر وفا یزداں منش آپ کو دے رہی ہیں؟

☆☆ ڈاکٹر وفا صاحبہ کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھ ناچیز کی تحقیق و تنقید کے حوالے سے اظہار خیال فرمایا ہے۔ میں نے 1993 میں منٹو اور عصمت کے یہاں عورت کا تصور پر کتاب تیار کر لی تھی اور اس کی اشاعت اگرچہ تاخیر سے ہوئی، لیکن اس میں جس نئے زاویے سے اُن کے افسانوں کو دیکھا گیا، وہ سماجیاتی مطالعہ تھا۔ میرے مطالعے کی گہرائی اور گیرائی سے متاثر ہو کر بیک زبان سبھی تعریف کر رہے تھے۔ ایران کے لیے میری تحقیق و تنقید کا انداز بالکل اچھوتا اور نئی روش کا حامل تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ چوں کہ درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ لہٰذا، یہی تنقیدی رویہ ان کے دل کو بھی چھو گیا۔

☆ ڈاکٹر محمد کاظم جس شدت سے منٹو اور عصمت شناسی میں آپ کے تجزیے کو نیا اور انفرادی بتلا رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ کی زبانی اس انفرادیت

کی تفصیل اورتصدیق ضروری ہوجاتی ہے؟

☆☆ منٹوگھر کے باہرکی عورت بلکہ بازاری عورتوں کی کردارنگاری میں ان کے اندروں میں مچی ہوئی خلفشارکوبیان کرنے میں یدطولیٰ رکھتے ہیں۔لیکن اندرون خانہ پردہ نشین عورتوں کے بیان میں عصمت چغتائی سے مقابلہ نہیں کرسکتے ہیں۔اسی طرح عصمت چہاردیواری کے اندر پردہ نشین عورتوں کی کردارنگاری میں یدطولیٰ رکھتی ہیں لیکن بازاری عورتوں کے بارے میں وہ سعادت حسن منٹوسے مقابلہ نہیں کرسکتی ہیں۔

☆ ایک گلہ یہ بھی آپ سے کرناہماراحق بنتاہے کہ آپ ہرکتاب کے ’پیش لفظ‘ میں کچھ نیا لکھنے کے بجائے ’گفتنی‘ کودہراتے رہتے ہیں؟

☆☆ کچھ حدتک آپ کا گلہ درست ہے لیکن طائرانہ نگاہ ڈالنے کے بجائے بہ نظرغائرتوجہ کی جائے تو ’گفتنی‘ کے متن میں ہربارتبدیلی اورکتربیونت ہوتی رہی ہے۔علاوہ ازیں،میری چندایک کتابوں میں ’پیش لفظ‘ اور ’گفتنی‘ دونوں موجودہیں۔کہیں میں نے ’کچھ اپنے بارے میں‘ کے عنوان سے بھی اپناتعارف کرایاہے۔مجھے کسی Jack کےاستعمال سے کوفت ہوتی ہے۔اس لیے عموماً کسی استاذ سے تقریظ یاتمہیدلکھوانے سے گریزکرتاہوں۔البتہ پروفیسرابن کنول کا یہ حسن نظر ہے،ان کی شگفتہ بیانی ہے کہ انھوں نے مجھ پرنوشتہ اپنے خاکے میں اسے بہت دل چسپ پیرائے میں بیان کیاہے جس سے ایک قاری کی حیثیت سے میں بھی قرأت کے دوران خندہ زن ہوئے بغیرنہ رہ سکا۔یہ ان کی تحریرکا اعجاز ہے۔ میں ان کا بڑامشکورو ممنون ہوں۔

☆ بھونڈے معاشرتی نظام کاوہ کون ساحیاسوزواقعہ ہے جس پرقاری کی توجہ دلاناضروری ٹھہرا،اس کانتیجہ کیابرآمدہوا؟

☆☆ سماج کی ناہمواری ہمیشہ سےادیبوں کامحبوب موضوع رہاہے۔ترقی پسندتحریک میں اس پربہت زیادہ توجہ دی گئی تھی۔

مجھے بھی سماج کے ایسے رسم ورواج پرکوفت ہوتی ہے۔’جہیزکی آگ میں جلتی زندگی‘، ’ہارت رہے تیرا بھولپن‘، ’ابھاگن‘، ’داسی‘، ’جرم ضعیفی کی سزا‘ جیسے افسانوں میں جہاں سماج کے کمزورافرادیعنی عورتوں اورضعیفوں پرمظالم ہوتے ہیں توان کے اس ناروارویے سے مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے اوران کی حمایت میں قلم اٹھانامیں اپنافرض سمجھتاہوں۔

☆ گزشتہ چندسالوں سے ’لوجہاد‘ کی اصطلاح جس تیزی سے سیاست،صحافت،معاشرت،علم وادب اورروزمرہ کی گفتگومیں دخیل ہوئی ہے اُسی قدرمعاشرے میں تعصب اورتشددکاگراف بڑھ رہاہے مگرجب سے حکومتی سطح پرقانون سازی کی بات چلی ہے،معاملہ انتہائی پریشان کن صورت اختیارکرگیا ہے۔ایک فردکے جسم پراس کے خاندان،سماج،قانون اورحکومت کاحق کسی بھی مہذب معاشرے میں برحق ٹھہراناجنگل کے قانون کی یادتازہ کردیتاہے۔

☆☆ آپ بالکل حق بجانب ہیں۔اس ضمن میں میراماننایہ ہے کہ قانون خواہ کوئی سابھی ہو،اس کااطلاق سب پریکساں ہوناچاہیے۔یہ نہیں کہ ہم کریں تودیش بھکت،تم کروتودیش دروہی!

☆ آپ نہیں سمجھتے کہ آپ نے اپنی تخلیقات میں جن معاشی، سیاسی،سماجی،ثقافتی اورنوآبادیاتی مسائل کوبرتاہے نیوورلڈآرڈراورپوسٹ کورونا ورلڈکی روشنی میں اُن کوری وزٹ کرناضروری ہوگیاہے؟

☆☆ وبائیں پہلے بھی آتی رہی ہیں۔لیکن عالمی پیمانے پرآمدورفت کے وسائل اوررسل ورسائل کے ذرائع کی سہولیات نے کوروناجیسے وائرس کوسرعت سے پھیلنے میں مددبہم پہنچائی ہے۔

دنیابھرکی انسانی آبادی چندمہینوں تک سکتے میں آگئی ہے اوربے تحاشہ اموات کاسامناکرناپڑا۔پورے عالم انسانیت پرخوف طاری ہوگیا۔ انسان انسان سے خوف کھانے لگا۔حتیٰ کہ باپ کی لاش کوبیٹاہاتھ لگانے سے ڈررہاتھااورواقعتاً نفسی نفسی کاعالم قائم ہوگیاتھا۔انسانی ترقی اوراشرف المخلوقات نے ایک حقیر سے وائرس کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

ہمیں اس صورتِ حال سے کامیابی کے ساتھ نبردآزماہونے کے لیے حفظ ماتقدم کے طورپرازسرنوغورکرنے کی ضرورت ہے۔

۔ منٹواورعصمت ۔

پرویزشہریار،جن موضوعات کوزیربحث لارہے ہوتے،ان کوترتیب سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کرہرایک کا تجزیاتی تبصرہ کرتے ہیں۔باب "منٹواورعصمت کے نسوانی کرداروں کاسماجیاتی پس منظر" میں سماج میں عورت سے متعلق مختلف رجحانات کاجائزہ لیتے اورہررجحان کی کی گہرائی تک جھانک کراس کوافسانے سے جوڑدیتے ہوئے نمایاں کرتے ہیں۔

اس کتاب کی ایک اورخوبی جوبلکہ راقمہ کے خیال میں سب سے بہترین خوبی ہے یہ وہ ہے کہ موضوع کے تقاضے پرافسانوں کامختصراوردلنشین اندازمیں تعارف ہواہے۔اردوادب میں اہم اوربڑے افسانہ نگاراوران کے افسانے درج ہیں مگرسارے افسانے پڑھے نہیں جاسکتے،خاص طورپرمنٹو اورعصمت کے ان گنت افسانے چھپ گئے ہیں،اوران کے بےشمارایسے افسانے ہیں جن میں عورت مرکزی کردارہو،وہ سب پڑھنے کے لیے دشواری ہوتی ہے۔یہ کتاب منٹواورعصمت کے جن افسانوں میں عورت کااہم کرداررہاہے،ان کامختصراورپرکشش پیش کرتے ہوئے ان کی شناخت کروانے کے لیے سنسنی خیزماخذسمجھی جاسکتی ہے۔

۔ ڈاکٹروفایزدان منش

(برادرِ عزیز و محترم پرویز شہریار کے کلامِ ذی وقار سے بصد اختصار)

چشمِ حیواں

فاطمہ تبسم (●)

بھوک کی حمایت میں

بھوک تو بھوک ہے
بالائے ناف بھوک ہو
یا زیرِ ناف
بھوک لگتی ہے تو
آدمی مچل جاتا ہے
بھوک مارکسی ہو
یا فرائیڈی
بھوک لگتی ہے تو
آدمی باغی ہو جاتا ہے

شجرِ ممنوعہ تک سے
گریز نہیں کرتا ہے انسان
باغِ بہشت کے مکینوں کو
اسی پاداش میں
زمین کے سینے پر اُتار دیا گیا تھا، ایک دن
عرش سے فرش پر آنے کے بعد
اُن کے اعضائے جنس
عیاں ہو گئے تھے
تو گویا
بالائے ناف بھوک نے
زیرِ ناف بھوک کو
ایک کبھی نہ ختم ہونے والے
رشتے میں
کر دیا تھا مربوط
تب سے آج تک

گندم سے آسودہ ہوتے ہی آدمی
ناف کی نشیبی وادیوں میں
محوِ سفر ہو جاتا ہے
تا کہ
دُنیا کے سب سے اولیں انسانی جوڑے
آدم اور حوا سے
خود کو جوڑ سکے
سکوت موت کی علامت ہے اگر
تو اس علامت کو جامد ہونے سے بچائے
اس سکوت کو توڑ سکے
چشمِ حیواں میں غوطہ زن ہو جائے
بادبانِ کشتی نصب کرے
اپنی حمایت میں
ہوا کا رخ موڑ سکے

بھوک تو بھوک ہے
بھوک لگتی ہے تو
آدمی باغی ہو جاتا ہے
اپنے پرائے کا فرق بھی نہیں کرتا ہے انساں
ایک بے چہرہ سی لڑکی کی خاطر
قابیل نے کر دیا تھا ہابیل کا خون
تب سے آج تک
اِس دھرتی کی چھاتی پر
آدمی بہاتا ہے خون
اِس کے تحت الشعور میں
دراصل، موجود ہے، آج بھی
آدمی کی وہی جبلی بھوک
آدمی کا وہی ازلی جنون

بھوک تو بھوک ہے
بھوک لگتی ہے تو
آدمی باغی ہو جاتا ہے

مرزاغالب : اُستادِ ریختہ

وہ دُرِیتیم
وہ دُرِناسفتہ
کہ قدرت نے جسے
اپنے دستِ خاص سے پروان چڑھایا
امواجِ حوادث کے تھپیڑوں نے جسے ہردم
متحرک اور سرگرم رہنا بھی سکھایا
سمندر کی گہرائیوں میں جو غرق آب رہا برسوں
وہ سچا موتی جسے
صدف نے اپنی آغوش میں سنبھالا برسوں
وہ جب ساحل پر سمندر کی چٹانوں سے ٹکرایا
نامساعد حالات نے جب، اُسے خوب ترشا ترشایا
وہ دُرِیتیم
کہ نہ تھا جس کے سر پر
چچا اور باپ کا سایہ
وہ اپنے آباواداد کی املاک پر
پلتا رہا برسوں
وہ سنگ ناتراشیدہ
جو راہِ آب جو میں رُلتا رہا برسوں
تب جا کے کہیں منصۂ شہود پر وہ آیا
شہرت کی سونامی نے اسے بالآخر
بلند و بالا مقام پر اُچھالا
فارسی دانی پر اپنی بڑا ناز تھا جسے
وہ تصحیح کار بنا پادشاہ کا پھرنے لگا اِتراتا
قلعہ معلّٰی تک گیا
دیوانِ خاص کی مسند بھی سنبھالا
غزل اور قصائد میں بڑا نام کمایا
خلعت و خطاب و اسناد و انعام بھی پایا
یوں رفتہ رفتہ، وہ دُرِناسفتہ
وہ بختِ محسن کش، وہ طالع خفتہ
بن گیا بالآخر
رشکِ فارسی سے
اُستادِ ریختہ، ہاں! اُستادِ ریختہ

بڑا شہر اور تنہا آدمی

دسمبر کا مہینہ اور دلّی کی سردی
ستاروں کی جھلملاتی جھرمٹ سے پرے
آسمان کے ایک سنسان گوشے میں جیسے
پونم کا ٹھٹھرا ہوا کوئی چاند
بادلوں میں کھاتا ہے متواتر ہچکولے
تنہا مسافر
اور دور تک کہرے کی چادر میں لپٹی
بلکھاتی سڑکیں
دھند کی غبار میں کھویا ہوا انڈیا گیٹ
ٹھنڈ میں ٹھوکریں کھاتا مسافر
خوش نصیب ہے،
بادلوں میں گھس جاتا ہے چاند
میری کرسمس کی رونقیں پھیلی ہیں، تمام
ستاروں سے روشن سجے دھجے بازار
لذیذ کھانوں کی خوشبوئیں، جہاں پھیلی ہیں ہر سو
بازار کی گرم فضاؤں میں
مے کی سرمستی میں ہے ڈوبا شباب
تنہا مسافر کی
چند روزہ مسافت بھی کیا ہے، یارو!
ہم وطنوں سے دور
اپنوں سے دور
جمنا تٹ پر جیسے بن مانجھی کے، ناؤ
بوٹ کلب کے سرد پانی میں جیسے
تیرتا رُکتا ہوا حباب
تنہا مسافر سوچتا ہے
کوئی ہے جس کا وہ ہاتھ تھام لے ہولے ہولے
کوئی ہے جو اُس کے ساتھ کچھ دور چلے ہولے ہولے
دھند میں کھوئی ہوئی منزلیں
طویل سڑکیں
اور تنہا مسافر
جیسے پونم کا ٹھٹھرا ہوا کوئی چاند
بادلوں میں کھاتا ہے متواتر ہچکولے

بنتِ حوا سے خطاب

تمہارے پیڑ بدن پر
نئی نئی کونپلیں جو اُبھر رہی ہیں ابھی
تمہاری لچکیلی شاخ ہائے شجر پر
ننھی ننھی کلیاں جو آہستگی سے آنکھیں کھول رہی ہیں
تمہارے نشیب و فرازوں پر
تنوں کے مخصوص زاویوں پر
کنوارے بدن کے جو پھول کھل رہے ہیں ابھی
تمہیں خبر نہیں کہ
تمہارے نازک اندام پر
جلدوں کی ہزاروں لاکھوں مسام پر
خوشبوؤں کی لپٹیں جو بکھر رہی ہیں
تمہارے گرد و پیش کی فضائیں
اس کی تپش سے لہک رہی ہیں
تمہارے نازک ثمر آور بطن پہ
برگ و بار جو نمودار ہو رہے ہیں
اُس پر جو اک چاندنی سی پسر رہی ہے
وہ شام رنگ بھنوروں کو دیوانہ
سرخ مائل بلبلوں کو مستانہ
چاک گریباں عاشقوں کو عارفانہ کر رہی ہیں سبھی
تمہارے نافِ تن کی کستوری میں
وہ جادوئی کشش ہے
کہ جس کے گرد اگرد اپنی اپنی مدار پر
اَن گنت رشی مُنی
صدیوں سے تپسیہ کر رہے ہیں
صوفی و سنت ایک عالم ہو میں غرق ہو کے
اپنی اپنی نفس اور اندریوں سے
برابر مجاہدہ کر رہے ہیں سبھی
تمہیں خبر نہیں کہ
یہ سورج
یہ چاند ستارے یہ ثریا یہ کہکشاں
تیری ہی ذات سے ہیں سبھی وابستہ
نظامِ کائنات کا ایک بھی ذرہ
نہیں ہے تیری الفت سے مبرّیٰ
تو ہی اس اقلیم حیات کی ہے روح رواں
تیرے ہی دم سے یہ جہانِ رنگ و بو ہے روشن روشن
تیرے ہی دم سے چلتا ہے یہاں کاروبارِ گلشن
گھورے کی پستی سے تا اوجِ ثریا
چار بانگ عالم میں ہے تیرا ہی چرچہ
تمہیں خبر نہیں کہ
تمہارے ہی دم سے
یہ دُنیا ہے سرسبز و شاداب و شاداں
تمہارے ہی دم سے
ہے یہ تابندہ
تمہارے ہی دم سے
ہم سب ہیں زندہ

☆

جاگو کسان جاگو

شوریدہ سر دماغ کسی اور ہی اُلجھن میں ہے
تغزل کے پنکھ لگا کے اُڑ نہیں سکتا
کیونکہ
خیال
سماجی ذمّے داریوں
انسانی رشتوں کے عجب بندھن میں ہے
طاؤسِ قلم
ردیف اور قافیے کے گھنگھرو پاؤں میں باندھ کے
کاغذ کی بساط پر ناچنے سے قاصر ہے
بحور و اوزان کے دائرہ در دائرہ حصار میں
اس کا دم گھٹتا ہے
طاؤسِ قلم
مرغِ بسمل کی طرح ناچنا چاہتا ہے، دیوانہ وار
آج تو اِس پر شیوا کے تانڈو کا آہنگ ہے طاری
ہندوستان جو کبھی کہلاتا تھا-------

'سونے کی چڑیا'
جہاں دھرتی صدیوں سے
سونے، ہیرے اور موتی اُگلا کرتی تھی
جواز مینہٗ قدیم سے ہی
کرشی پردھان دیش تھا
اُسے آج عالمی سیاست کے جبر نے
بازارواد کے قہر نے
اِس قدر کر دیا ہے مجبور
کہ آتم ہتیہ کر رہے ہیں کسان یہاں
اور بھوکے مر رہے ہیں مزدور

سربراہانِ اقتدار کی ہوس نے
کسانوں کے مسائل کی ایک عرصے سے ان دیکھی کی ہے
یہی اسباب ہیں کہ آج
ماؤوادیوں اور مارکسیوں نے مل کر
بھوکے، ننگے اور بے گھر آدی واسیوں کی ریلی کی ہے
ایوانِ اقتدار میں آج پھر کھل بلی سی ہے
جاگو کسان جاگو
اپنی اُٹھتی ہوئی پیٹ کی اِس آگ سے
قصرِ سلطاں کو ہلا دو
خوابیدہ حکمراں کو جگا دو
کہ ایشیا میں دورِ انقلاب کا ہو چکا ہے آغاز
سامنت وادوں اور جاگیرداروں کا جاتا رہا، اب دبدبہ
عام آدمی نے آخر چکھ لیا
انقلاب کا مزہ
بدل چکا ہے، اب انساں کا مزاج
ظلمتوں کی رات اب چھٹنے کو ہے
نئی روشنی کا ہوگا
اب ہر شے پہ راج
ہاں!
ایسے دورِ انقلاب میں، اگر
طاؤسِ قلم
ردیف اور قافیے کے گھنگھرو پاؤں میں باندھ کے
کاغذ کی بساط پر ناچنے سے قاصر ہے
تو کوئی غم نہیں!

تو کوئی کیسے غزل لکھے

جب انسان مر رہا ہو
تو کوئی کیسے غزل لکھے
غزل کے لیے
جنوں چاہیے
جنوں کے لیے وفا ضروری ہے
انسان مر رہا ہو جب بھوکا ننگا
وفا کے بدلے جب ملتا ہو
جور و جفا
تو کوئی کیسے غزل لکھے
جب دہقاں کی جواں لڑکیاں
بازاروں میں گھسٹتی ہوں
جب کسان کے بیٹے
جنگلوں اور گپھاؤں میں ہوں پوشیدہ
محافظوں نے لگائی ہو جب گھات
مزدوری مانگنے پر
جب ملتی ہو
انھیں اموات
تو کوئی کیسے غزل لکھے
انسان جب ہو
دانے دانے کو محتاج — ایک طرف
دوسری طرف
گوداموں میں سڑتے ہوں اناج
تو کوئی کیسے غزل لکھے
حق گوئی پر
جب کاٹ لی جاتی ہو زبان
فریادرس
ہاتھوں کو جہاں جھکا دیا جاتا ہو
جب اپنے ہی ملک میں
ہم وطنوں سے ملتی ہوں پسپائیاں
جب انسان
نکسلائٹ اور خودکش بمبار
میں بدل جائے
ہائے! صد افسوس اور ہائے
تو کوئی کیسے غزل لکھے

ایک منفرد افسانہ نگار

ڈاکٹر سید احمد قادری
(بھوپال)

پرویز شہریار کا افسانوی سفر تین دہائیوں سے زائد پر مشتمل ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ ان دہائیوں میں انھوں نے اپنے افسانوی سفر میں کئی سنگ میل قائم کرتے ہوئے معاصر افسانوی منظر نامہ میں اپنی ایک خاص اور منفرد پہچان بنانے میں کامیاب ہیں۔

ان کے ابتدائی دور کے افسانوں مثلاً ''سایہ سایہ جنگل''، ''کام ہی روشنی''، ''نئی روشنی کا آخری ڈرامہ'' اور ''شیطان'' وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں ابتدائی نقوش واضح ہیں اور ذہن کے تار چھیڑنے میں کوئی خاص کامیاب نظر نہیں آتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے ان کا شعور بالیدہ ہوتا گیا، فہم وادراک کی روشنی ملنے لگی اور حیات وکائنات کو سمجھنے اور سمجھانے کی آگہی ہوتی گئی۔ فکر وفن سے بھرپور ایک خاص انداز میں ان کے افسانے سامنے آتے ہیں۔ جو بتدریج مطالعہ ومشاہدہ اور افکار ونظریات کے ساتھ نمو پاتا ہے۔ اس امر کا اعتراف پرویز شہریار کو بھی ہے، لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی نوجوانی میں پہلا افسانہ 1980 میں لکھا جب میں دسویں جماعت کا طالب علم تھا، یہ افسانہ ''پندار'' پٹنہ کے 6/ستمبر 1980 کے شمارے میں ''چمبل کی دسویں رانی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس طرح، میرے ادبی سفر کا آغاز 1980 سے ہوتا ہے۔ آغاز سفر میں جدیدیت کے رجحان سے بھی اثرات قبول کیے اور چند ایک علامتی اور تجریدی افسانے بھی لکھے۔ ''قوس'' کے ایک خصوصی شمارہ ''نیا افسانہ، کچھ نئے نام'' میں مختصر تعارف کے ساتھ ایک علامتی افسانہ ''نئی روشنی کا آخری ڈرامہ'' کے عنوان سے 1985 میں شائع ہوا۔ 1986 میں ''شب خون'' میں ''سایہ سایہ جنگل'' شائع ہوا تو شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا کہ پرویز شہریار جمشید پور کے نئے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن جلد ہی افسانے میں کہانی پن، بیانیہ اور حقیقت نگاری کی فوقیت کے ادراک اور شعور کے سبب میری واپسی کہانی کی پرانی ڈگر پر ہوگئی۔''

(شجر ممنوعہ کی چاہ میں، ص-vii)

اس وقت تک پرویز شہریار نے افسانے کے فن پر تقریباً اپنی گرفت مضبوط کر لی اور متنوع موضوعات پر ایسے خوبصورت اور معنویت سے بھرپور افسانے لکھے، جو دل ودماغ پر گہرے اثرات مرتسم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ایسے افسانوں میں ''جرم ضعیفی کی سزا''، ''پھول کا بوجھ''، ''نیا سورج نیا سویرا'' وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

پرویز شہریار کے پہلے افسانوی مجموعہ ''بڑے شہر کا خواب'' میں شامل ان افسانوں کی جس طرح پذیرائی ہوئی، اس سے انھیں کافی حوصلہ ملا اور ان کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا۔ جس سے اپنے افسانوں کے حوالے سے فکر وفن کی نئی دنیا بسانے میں وہ کامیاب ہوئے۔

پرویز شہریار کو اپنے افسانوی سفر میں زندگی کی بہت ساری تلخ حقیقتوں سے واسطہ پڑا۔ حیات وکائنات کے نت نئے رنگ وروپ دیکھے۔ جنھیں متنوع موضوعات کے تحت اپنے مخصوص کردار کے ساتھ ہم آہنگ کرتے ہوئے واقعات کے ارتباط وتسلسل سے معنی خیز منظر نامہ تیار کیا۔ ان کے افسانوں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے افسانوں میں نئے تجربات، عصری موضوعات اور تہہ در تہہ زندگی کے عرفان کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ بدلتے وقت نے جو انگڑائیاں لی ہیں۔ سیاسی، سماجی، معاشرتی، اور اقتصادی سطح پر جو تبدیلیاں سامنے آ رہی ہیں اور ان تبدیلیوں سے ہماری تہذیب واقدار جس طرح متاثر ہو رہے ہیں، ان بدلتے منظر نامے پر، پرویز شہریار کی بڑی گہری نظر ہے۔ اپنے افسانوں انھوں نے شہر کی چکا چوند کو نئے ابعاد سے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی یہ بات پوری طرح صداقت پر مبنی ہے کہ شاہکار فن پارے کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے وقت کا ادبی دستاویز بھی ہوتا ہے۔ اپنے اعتراف میں پرویز شہریار لکھتے ہیں:

''افسانہ نگار اپنے معاشرے کا نبض شناس ہوتا ہے۔ افسانہ نگار جس سماج میں اور جس دور میں جی رہا ہوتا ہے، اس کے فن پارے میں اُس دور کے سماج کی دھڑکن سنائی دینی چاہیے۔ اس کے فن پارے مین واقعات اور بشری محاکات بعید از امکانات نہیں ہونے چاہیے۔ اس کے کردار کے حرکات وسکنات سے اس معاشرے کی تہذیب کی جھلک مترشح ہونی چاہیے۔ کسی شاہکار فن پارے کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے وقت کا ادبی دستاویز بھی ہوتا ہے۔''

(شجر ممنوعہ کی چاہ میں، گفتنی، ص-xii)

اس تناظر میں پرویز شہریار کے کئی افسانے ایسے ہیں، جو شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ افسانہ ''شجر ممنوعہ کی چاہ میں'' ایک ایسا افسانہ ہے، جو شہر کی مادّی زندگی میں دولت مندوں کی تہذیبی اور اخلاقی انحطاط اور ازدواجی رشتوں کی پامالی کا اعلانیہ ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے:

''میں ایک خود ساختہ انسان ہوں، تم جانتی ہو، میں سڑک سے اُٹھ کر یہاں تک پہنچا ہوں۔ جہاں دُنیا کی عظیم الشان چیزوں تک آج میری رسائی ممکن ہو پائی ہے۔ آج میں جب چاہوں، حسین سے حسین دوشیزہ کو اپنے بستر کی زینت بنا سکتا ہوں۔ یہ سب میں نے اپنے عزیز ترین جذباتی رشتوں کو کھو کر حاصل کیا ہے۔ اس مشینی دور میں، اپنے سچے اور معصوم جذبات کا میں نے خود اپنے ہاتھوں سے خون کیا ہے۔

تم جانتی ہو، میں ایک مابعد جدید انسان ہوں۔ میں ان سب چیزوں

سے کسی بھی قیمت پر تیاگ نہیں لے سکتا۔ میں سنیاسی بن کر جینا نہیں چاہتا۔ یہ زندگی صرف ایک بار ہی ملی ہے۔ لہٰذا، میں اس سے لطف اُٹھانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی جنسی تشنگی کو تہہ دامن دبا کے مہاپرش اور مہاتما بننے کا آڈمبر نہیں رچ سکتا.....''

(شجر ممنوعہ کی چاہ میں، ص-8)

ازدواج کی عارضی ادلا بدلی، بڑے شہر میں بڑے (امیر) لوگوں کے لیے خوبصورت جنسی کھیل اور مشغلہ ہے۔ لیکن اس جنسی مشغلہ میں جس طرح سماجی اور تہذیبی رشتے تار تار ہوتے ہیں۔ ایسی حیوانیت سے حیا اور شرم لہولہان ہوتی ہے، پاکیزگی اور نسوانیت بے حیائی میں بدلتی ہے۔ بڑی خوبصورتی سے اور فنکارانہ انداز میں شہری زندگی کے اس کھیل کو افسانہ نگار نے اپنے اس افسانہ میں دکھایا ہے۔

''اوّل اوّل مرد وزن خوشنما پوشاکوں میں ملبوس یہاں وہاں گھوم ٹہل رہے تھے۔ لیکن جوں جوں موسیقی کی دھن میں تیزی آتی گئی، ان کے جسم کپڑوں سے بے نیاز ہوتے چلے جاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے، مادر زاد انسانوں کا وہاں ایک جم گھٹا سا نظر آنے لگا تھا۔ وہ سب کسی اور ہی دُنیا سے آئے ہوئے دُم کٹے جانور معلوم ہوتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ عریانیت کوئی معیوب چیز نہیں ہے۔ جب خدا، گوڈ اور ایشور نے ہمیں اسی روپ میں بنایا ہے تو پھر اس پر سے یہ آورن کیوں اوڑھا جائے۔ ننگے رہنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ جب ہم دوسروں کی بیویوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں تو ہمارے اندر منفی توانائی پیدا ہوتی ہے جس کا انخلا ضروری ہے۔ اس طرح سے آزادانہ رہ کر ہم جس استری سے جی چاہے سنبھوگ کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ استری بھی آپ کے اندر کشش محسوس کرتی ہو۔''

(شجر ممنوعہ کی چاہ میں، ص-4)

بے شرمی اور بے حیائی کے اس جنسی کھیل اور تفریح میں کچھ عورتیں ایسی ضرور ہوتی ہیں، جو صرف اپنے شوہر کی خوشی کے لیے بحالت مجبوری شامل ہونے میں خود کو مجبور پاتی ہیں، ان کی روح اندر اندر زخمی ہوتی ہے۔ لیکن مغربی تہذیب کے حصہ بننے والے ایسے شوہر کو اپنی بیوی کے زخم خوردگی کا احساس کہاں ہوتا ہے۔

''وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے بناؤ سنگھار کر کے کلب لے جاتا۔ میرے گورے گورے انگوں میں ایک قدرتی کساؤ برقرار تھا اور میرے جوبن کے اُبھار بھی ماند نہیں پڑے تھے۔ لیکن اندر سے میں خود کو کمزور محسوس کرنے لگی تھی۔ میں اپنے شوہر کی خوشی کے لیے وہ سب کچھ کر رہی تھی جس سے کہ وہ خوش رہے۔ مجھے غیر مردوں کے ہاتھوں میں جھولنے، ان کی بانہوں میں مچلنے اور اپنے ہونٹوں کے زوایے میں ان کی زبان کی پھسلن محسوس کرنے میں کچھ مزہ نہیں آتا تھا۔ لیکن جب اپنے شوہر کے سامنے دوسرا مرد آپ کے وجود کو جھنجھوڑتا ہے تو یقیناً آپ کے اپنے مرد کے اندر رقابت اور حسد کا ایک شعلہ سا لپک اٹھتا ہے اور وہ اس کی تپش میں جھلس کر اپنے اندر کی گرمی دوسری عورتوں کے اندر جا کر ٹھنڈا کرتا ہے۔ یہ شعلوں سے کھیلنے کا ایک غیر فطری عمل ہے۔ لیکن یہی کام میرے شوہر کے اندر ہر بار جینے کی ایک نئی امنگ پیدا کر دیتا تھا۔ کئی ماہ تک آنکھ مچولی کا یہ سفلی کھیل چلتا رہا۔ اُس کے اندر تیزی سے تبدیلی آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہماری ازدواجی زندگی میں ایک ایسا بھی موڑ آیا، جب مجھے اس کی خوشی سے نفرت اور چڑھ سی ہونے لگی۔''

(شجر ممنوعہ کی چاہ میں، ص-5,6)

''شجر ممنوعہ کی چاہ میں'' عصری اور شہری زندگی میں پنپ رہے مغربی کلچر کی غیر مہذب فکر و عمل کی نقاب کشائی کرنے والا افسانہ ہے۔ ایسے فکر و عمل سے احتجاج اور بغاوت کا احساس کرانے والا پرویز شہریار کا ایک دوسرا افسانہ ''سہاگ کا خون'' ہے۔ جس میں بچہ کی پیدائش میں ناکام رہنے والا شوہر اولاد کے لیے، ایک تانترک بابا کے نام پر تبادلہ ازدواج کے جنسی کھیل کے لیے اپنی بیوی کی آنکھوں میں امید کی جوت جگاتا ہے اور دیویانی بچّے کے حصول کے لیے تانترک بابا کے پاس جانے کے لیے رضامند ہو جاتی ہے۔

''دراصل، دیویانی ماں بننا چاہتی تھی۔ یہ خواہش اُس کی فطرت کے عین مطابق بھی تھی لیکن وہ مرد کے تعاون کے بغیر ایک ادھوری عورت تھی۔ اُس کا شوہر اس کی طرف التفات ہی نہیں کرتا تھا۔ اس میں بھی وہ اپنا ہی قصور سمجھتی تھی اور یہ فکر اُسے اندر ہی اندر کسی گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی۔

اچانک، اس کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر اُسے اُمید کی ایک کرن سی نظر آئی، جب اُس کے شوہر نے مہمانوں سے بھری محفل میں اسے تحفے کے طور پر انڈیا کا ٹکٹ دے کر بتایا تھا کہ وہ لوگ انڈیا کے ایک ضلع گڑگاؤں میں کسی تانترک بابا کے پاس جا رہے ہیں۔ ''تانترک بابا بہت پہنچے ہوئے مُنی تھے۔'' ایسا لوگ کہتے ہیں۔ یہ بات دیویانی کے شوہر نے اُسے بتائی تھی۔ تانترک بابا اپنی تپسیہ اور سادھنیہ سے رات کی رات عورت کی گود ہری کر دیتے تھے۔ یہ سب سُن کر دیویانی بہت مسرور ہوا تھی۔''

(شجر ممنوعہ کی چاہ میں، ص-33)

لیکن تانترک بابا کے یہاں تو ماجرا ہی کچھ اور تھا:

''اُس رات دیویانی اپنے شوہر کی ہر خواہش، ہر ارمان پورا کر دینا چاہتی تھی۔ کیونکہ اُس نے اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ اُس رات کی صبح کبھی نہیں آئے گی۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ تانترک بابا کوئی رشی منی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ڈھونگی آدمی ہے۔ انسان کے روپ میں وہ ایک حیوان ہے۔

اُس رات بیویوں کی ادلا بدلی ہونے والی تھی۔

اُسے غُصّہ اس بات کا نہیں تھا کہ تانترک بابا ایک ڈھونگی اور پاکھنڈی تھا۔ ایسی خبریں تو وہ آئے دن اخباروں میں پڑھتی رہتی تھی۔ اُسے غُصّہ تو اس بات کا تھا کہ، اُس کے اپنے شوہر نے اُسے دھوکے میں کیوں رکھا؟

دیویانی ویسے تو سولہ سنسکاروں پر چلنے والی پنڈتائن تھی لیکن ان

سب کے باوجود وہ ایک عورت بھی تھی۔ایک ایسی بھرپور عورت جس کا خون گرم تھا۔وہ جینا چاہتی تھی ۔اور جینے کا حق مانگنا اُس کے نزدیک کوئی جرم بھی نہیں تھا۔دنیا کا کوئی قانون اُسے جینے کے حق سے روک نہیں سکتا تھا۔مگر یہاں تو اُس کے شوہر نے اُس کے ساتھ دشواس گھات کیا تھا۔دیویانی اپنے اُجڈ شوہر کو اس گھناؤنے جرم کے لیے کبھی معاف نہیں کرسکتی تھی۔اُس رات وہ سب کچھ ہوگیا جو قطعی نہیں ہونا چاہیے تھا۔''

(شجرممنوعہ کی چاہ میں،ص-36)

دیویانی کی عصمت زبردستی تارتار کی جاتی ہے اور المناک پہلو یہ ہے کہ دیویانی کو شوہر کی مدد سے جنسی ہوس کا شکار بنایا جاتا ہے۔اپنی آبروریزی اور احساس ندامت واحساس گناہ سے دیویانی اپنی عزت اور عصمت کی خاطر وہ اپنے شوہر سے انتقام لیتی اور اپنے شوہر کے سینے میں خنجر اتار دیتی ہے۔اس افسانہ میں ایک عورت کے فطری انتقامی جذبے کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

عصری تناظر میں پرویز شہریار کا افسانہ ''لو اِن ریلیشن سے پرے'' بھی ایک اچھا خوبصورت اور متاثر کرنے والا افسانہ ہے۔آج کے صارفی دور میں جبکہ ہر شئے پر صارفیت حاوی ہے۔اس کا بہت ہی عمدہ اظہار اس افسانہ میں ملتا ہے:

''صارف سماج میں جہاں ہر چیز بکاؤ ہوتی ہے، جہاں ہر سامان کا مول بھاؤ ہوتا ہو، وہاں اگر ایک نوعمر کھلنڈرے مرد کو کسی بھرپور عورت کے ساتھ گزر بسر کرنا پڑے تو بھلا اس میں کسی کو کیا حرج ہوسکتا ہے؟''

(شجرممنوعہ کی چاہ میں،ص-15)

سیاہ فام شمبھو ناتھ سنگھ اور نازک اندام پدمجا کو وقت اور حالات نے بہت قریب کردیا اور دونوں اپنی محدود آدمی میں ایک ہی کمرے میں رہنے پر مجبور ہیں۔دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی ضرورت بھی بن جاتے ہیں۔اس محبت اور ضرورت کا امتحان اس وقت ہوتا ہے، جب پدمجا کو امریکہ سے نئی ملازمت کا آفر آتا ہے۔شمبھو ویزا دیکھ کر جدائی کے تصور سے اداس ہوجاتا ہے، لیکن پدمجا شمبھو کے پیار اور اس کے خلوص کو ویزا کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہوئے ویزا کے کاغذات کو ٹکڑے ٹکڑے کرڈسٹ بین میں ڈال دیتی ہے۔ یہاں پر پرویز شہریار نے تکنیکی طور پر یہ غلط لکھا ہے کہ ویزا آگیا۔امریکہ کا ویزا متعلقہ شخص کے پاسپورٹ پر ہی پرنٹ کیا جاتا ہے۔

بہرحال اس افسانہ میں پرویز شہریار نے صارفی دور میں بھی محبت کی آفاقیت کے ساتھ ساتھ جنسی ضرورت کو حسین پیرائے میں بیان کیا ہے۔اس افسانہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ صارفیت کے اس عہد میں ذات پات، رنگ روپ اور علاقائیت کی حد بندیوں کو منہدم کرکے محبت کے فطری تقاضوں کو اہمیت دی گئی ہے۔

پرویز شہریار کا ایک افسانہ 'ہم وحشی ہیں'، بے اختیار کرشن چندر کے مشہور افسانہ ''ہم وحشی ہیں'' کی یاد دلاتا ہے۔وقت بدل گیا، لیکن فرقہ واریت کی شدت وہی رہی۔1964 سے لے کر گجرات یعنی 2002 تک جس طرح فرقہ وارانہ ہم آہنگی، یکجہتی اور گنگا جمنی تہذیب کو زہر آلود کیا گیا۔اس سے انسانیت کراہ اٹھی۔لیکن زہر پھیلانے والوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں۔انھیں تو انسانی لاشوں پر سوار ہوکر اپنا سیاسی قد بلند کرنا ہے۔فرقہ واریت کے موضوع پر یوں تو بہت سارے افسانے لکھے گئے، لیکن پرویز شہریار کا یہ افسانہ اپنی اثر انگیزی کے باعث منفرد ہے۔

''اقلیتی فرقوں پر ظلم ہوتے دیکھ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا گویا ہم کسی پانچ ہزار سال پرانے سماج کے دلت طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔جہاں ندی کے ایک کنارے پر بھی کسی دلت بچے کے پانی پی لینے سے دوسرے کنارے اونچائی پر کھڑے کسی دھرم اچاریہ کا پانی جوٹھا ہوجاتا ہے اور اس ارتکاب جرم کے لیے اُسے کڑی دھوپ میں کسی سوکھے درخت سے باندھ دیا جاتا ہے۔اُس کے ننگے جسم پر کوڑے برسائے جاتے ہیں۔اس کے بعد اس کے ماتھے پر سات پشتوں تک دھرم اچاریہ کے ونشوں کی غلامی لکھ دی جاتی ہے۔میں سوچنے لگا۔کیا ہم اس مہذب دنیا میں جانوروں سے بھی بدتر انسان ہوگئے ہیں کہ جن پر آزاد بھارت کا سنودھان نہیں بلکہ اب بھی منواسمرتی کے نی یم لاگو ہوتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال بن کر رہ گیا تھا جس کا جواب کسی کے پاس بھی نہ تھا۔''

(شجرممنوعہ کی چاہ میں،ص-43,44)

اس افسانہ میں پرویز شہریار نے اپنے موضوع کے گرد جس قدر وسعت اور معنویت پیدا کی ہے، اگر اسے ناول کی شکل دے دیں تو فرقہ پرستی کے موضوع پر بہت اچھا اور اہم ناول ہوسکتا ہے۔

افسانہ ''دس سروں والا بجوکا'' کو افسانہ نگار نے اپنے تخلیقی فہم و فراست سے عصری معنویت بخشی ہے۔پریم چند کا ہوری جس کی عمر پچھتر سال ہوچکی ہے۔اس کا بیٹا گوبردھن تعلیم حاصل کرکے آئی آئی ٹی میں پروفیسر ہوگیا ہے۔بدلتے وقت اور حالات کا تضاد بڑے فنکارانہ انداز میں اس افسانہ میں سامنے آتا ہے۔

''دور غلامی میں جب انگریزوں کا راج پاٹ تھا۔لال پگڑی اور خاکی وردی والا ایک سپاہی بھی گاؤں سے گزر جاتا تو اسے دیکھ کر لوگ باگ خوف سے کانپ اٹھتے تھے۔اس قدر رعب تھا کبھی اُن کا، ہم ہندوستانیوں پر۔

لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ہماری اپنی حکومت ہے۔پرشاسن بھی اپنا ہے۔اپنی عدالت ہے اور پولیس بھی ہماری اپنی ہے۔نہ مہاجن گلا دباتا ہے نہ لگان کی وصولی کا خوف ہے اور نہ ہی زبردستی۔کیسے اچھے دن آگئے ہیں۔جیسے جی چاہے جیو۔جیسے جی چاہے کھاؤ، جیسے جی چاہے پیو!''

(شجرممنوعہ کی چاہ میں،ص-63)

دورِ غلامی کے حالات اور عصری حالات میں کس قدر فرق آگیا

ہے۔ ہوری کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا ہے۔ اپنے کھیت کی بہت اچھی فصل دیکھ کر اس کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور وہ اپنی بیوی دھنیا سے کہتا ہے:

''میرا بڑے شہر کو ہجرت نہ کر کے گاؤں میں رہنے اور اپنے پرکھوں کی زمین پر کاشت کرنے کا فیصلہ کتنا صحیح ہے۔''

دھنیا گڑ کی کچھ بھیلیاں اور ایک لوٹا کنویں کا تازہ کھینچا ہوا ٹھنڈا پانی رکھ کر ایک طرف بیٹھ گئی اور حقہ کے لیے چلم تیار کرنے لگی۔

''ایشور کی دیا سے آج ہم کسی کے محتاج نہیں ہیں۔'' دھنیا نے کہا۔

''ہم پوتی کی شادی میں دل کھول کر خرچ کرنے کی چھمتا رکھتے ہیں۔''

''دھنیا! تم بس دیکھتی جانا، ہم اپنی پوتی کا بیاہ کس دھوم سے دھام سے کریں گے۔''

ہوری نے یہ بات چلم کا کش لگاتے ہوئے کہی۔ ''دنیا، سماج سب عش عش کرتے رہ جائیں گے۔'' (شجر ممنوعہ کی چاہ میں، ص-64)

لیکن ہوری کے توقعات اور اس کی خوشیاں اس وقت ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں، جب گاؤں میں اپنی پوری مضبوطی سے پاؤں پسارے نکسل، ہوری کی شاندار گیہوں کی فصل میں سے ایک چوتھائی حصہ تاوان کے طور پر دھمکی بھرے خط کے ذریعہ مانگتے ہیں۔ اس خط کے ملتے ہی ہوری کے سارے سپنے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔ غلامی کے دور سے نکل کر بظاہر آزاد فضا میں کس قدر خوف و دہشت نے گاؤں میں اپنے پنجے گاڑ دئے ہیں، اس کا اندازہ اُسے اس وقت ہوتا ہے۔ عصری تناظر میں غیر منقسم بہار کے گاؤں کی جو صورت حال تھی اور اب بھی ہے۔ اس خوفناک ماحول کی عکاسی بڑے فنکارانہ انداز سے پرویز شہریار نے اس افسانے میں کیا ہے۔

پرویز شہریار اپنے افسانوں کے حوالے سے یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہیں کہ وہ عصری سماج اور معاشرت کے نبض شناس ہیں۔ فکری اور فنی محاسن نے ان کے احساسات و جذبات کو حسن و معنی کی نئی فضا کی تعمیر و تشکیل میں اہمیت اور معنویت سے مربوط کیا ہے۔ پرویز شہریار سے امید کی جاسکتی ہے کہ آنے والے دور میں وہ اپنے افسانوں کے ذریعے موجودہ دور کے معاشرتی، تہذیبی اور اقتصادی حالات کو مترشح کریں گے، جن کی حیثیت یقینی طور پر دستاویزی ہوگی۔

۔ شجرہ ممنوعہ کی چاہ میں ۔

لو اِن ریلیشن شپ میں صرف شادی نہیں ہوتی لیکن تعلقات میاں بیوی جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں تین سالوں میں ویسے مواقع بہت کم دیکھنے کو ملے جس کی وجہ صاف ہے کہ افسانہ نگار ان جوڑوں کو اس سے آگے کی ایک نئی دنیا میں لے جانا چاہتا تھا جو اس ریلیشن سے پرے ہے۔ اور اس الگ دنیا کی شروعات کے لئے افسانہ نگار ایک طرح کا ماحول تیار کرتا ہے اور افسانہ کے آخر میں یہ دکھایا جاتا ہے کہ پدمچا شمبھو کو چھوڑ کر نیویارک جانا چاہتی ہے ۔انٹرویو بھی دیتی ہے۔ کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ ویزا بھی آجاتا ہے۔ لیکن پھر دونوں کے درمیان کچھ ایسا ہوتا ہے کہ پدمچا اُسے پھاڑ کر ڈسٹ بین میں پھینک دیتی ہے۔ یہاں کلائمکس میں جو ڈرامائی انداز ہے اس سے افسانے کو کچھ حد تک نقصان پہنچ سکتا تھا۔ لیکن اسے پرویز نے فنی مہارت سے سنبھال لیا جس سے اس کی معنویت میں اضافہ ہی ہوا۔ اس آخری رات پدمچا شمبھو کی انگلی تھامے ایک ایسے حسین اور جواں اقلیم کی سیر پر لے گئی جہاں صرف اور صرف سچی محبت کرنے والے جوڑے ہی جاسکتے ہیں۔ اس رات کے بعد صبح کا قصہ کچھ اس طرح بیان ہوا ہے کہ شمبھو نے اُسے اٹھا کر ایک گلاس پانی کے ساتھ احتیاط کے طور پر پریوینو پلس کھانے کے لئے دیا تھا تبھی وہ اس کی اس ادا پر فرط مسرت سے لپٹ جاتی ہے کہ ''اب مجھے پری وینو پلس کی ضرورت نہیں ہے۔'' ساتھ ہی ساتھ وہ تکیہ کے نیچے سے ویزا نکال کر ڈسٹ بین میں ڈال دیتی ہے اور کہتی ہے۔

''اب میں نیویارک نہیں جاؤں گی.....اسٹوپڈ مجھے پیسہ نہیں.....پیار چاہئے.....پیار!''

شمبھو کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔

ایک عورت کو مرد سے کیا چاہئے۔ تحفظ اور پیار۔ پیسہ بعد کی چیز ہے۔ پدمچا کو اس رات جب تحفظ کے ساتھ وہ پیار ملتا ہے جس کی وہ متلاشی ہے۔ اسے یقین نہیں آتا کہ وہ شخص جس کے ساتھ لو اِن ریلیشن میں اتنے دنوں سے رہ رہی تھی وہی اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دے سکتا ہے۔ اس خیال نے اس کی سوچ کو ہی بدل کے رکھ دیا۔ وہ خوشیوں سے پاگل ہو جاتی ہے۔ نیویارک نہیں جا کر اپنے اس ریلیشن سے آگے نکل جاتی ہے اور اس کے ساتھ شادی رچا لیتی ہے۔ اس موضوع پر ایک کامیاب افسانہ آپ اسے کہہ سکتے ہیں۔ ویسے جوڑے کے لئے بھی ایک طرح سے اس میں سوچنے کا مقام ہے کہ ہمیں عارضی لو ان ریلیشن شپ نہیں بلکہ ایک ایسا رشتہ چاہئے جو پوری زندگی ایک دوسرے کو استحکام بخش سکے۔

۔ ڈاکٹر اختر آزاد

افسانوں کا منظرنامہ

منظر کلیم
(جمشید پور)

بغیر کسی دہائی کا ذکر کیے ایک سرسری نگاہ اگر ہم حالات پر ڈالیں تو ہمیں کوئی دہائی ایسی نظر نہیں آتی جو بغیر کسی تغیر کے ختم ہوئی ہو۔ انسانی ذہن ہر زمانے میں تبدیلیوں کی کشاکش سے عبارت ہے۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی، مذہبی وثقافتی نقطۂ نظر صرف اُس سے متصل ہوتے رہتے ہیں اور ایک اضافی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ تبدیلیاں ذہنوں کی مرہون منت ہوا کرتی ہیں۔

جب تبدیلیاں ہوتی ہیں تو روایات کے بُت بھی ٹوٹتے ہیں۔ نئے افکار اُس کی جگہ لیتے ہیں۔ شعبہ زندگی کے ہر سطح کو اس عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔

پھر پورے نظام میں تبدیلی کا عمل بڑی آہستگی سے لیکن مسلسل جاری ہوتا ہے۔ اور اس تبدیلی سے اگر سب سے زیادہ کوئی متاثر ہوتا ہے تو وہ انسان ہے، جس نے سماج بنایا۔ جہاں وہ حاکم بھی ہے اور محکوم بھی۔ یہیں سے ہمارے سماجی ساخت کی تقسیم شروع ہوتی ہے۔ اور شاخ در شاخ بنتی چلی جاتی ہے۔ وقفے وقفے سے اس کی تصویر بدلتی رہتی ہے۔ اور اِن تصویروں میں رنگ بھرنا اُس عہد میں سانس لینے والے فنکاروں کا کام ہوا کرتا ہے جسے معاشرے کا سب سے حساس طبقہ کہا جاتا ہے۔ جس کی نگاہ ہزار پردوں کو چیر کر حقیقت کی متلاشی ہوتی ہیں۔ حالانکہ اس ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے کبھی وہ مصلحت بھی مصالحت کا شکار بھی ہوتا ہے۔ لیکن بیشتر اوقات وہ غیر جانب دار رہتا ہے۔ یہی غیر جانب داری اُس کی تخلیق کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔ وہ جو کچھ انگیز کرتا ہے۔ اُس کی تصویر دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ پیرایہ اظہار کچھ بھی ہو۔ لیکن حقیقت سے گریز اُسے آزمائش میں ڈالتا ہے۔ کیونکہ قاری ہونا اُس کی توقعات فنکار سے ہمیشہ حقیقت کے پیش کش کی متمنی ہوتی ہیں۔

خاص طور پر جب اُردو میں افسانہ نگاروں کے تعلق سے گفتگو ہوتی ہے تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے کہ اُنہوں نے اپنی ذمہ داری کو کہاں تک قاری کی توقعات کے مطابق پورا کیا۔

یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے کہ افسانہ نگار کی ذمہ داری کا دائرہ کار کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے؟ سرِ دست یہ میرا موضوع نہیں۔ صرف یہ عرض کروں گا کہ 1980 کے بعد افسانہ نگاروں کی جو صف سامنے آئی ہے اُن کی سب سے بڑی دین حقیقت نگاری کی وہ صورت ہے جو ایک جمہوری نظام اور آمریت پسند نظام میں جینے والے فنکاروں کے مابین موجود ہوا کرتی تھی۔

آج کا افسانہ نگار سماجی حقیقتوں سے آنکھیں دوچار کرتا ہے۔ وہ اس کی خامیوں اور خواہشوں سے صرف نظر نہیں کرتا بلکہ اُس کے پس پردہ اُن عوامل کی بھی تلاش کرتا ہے جس کے سبب سماجی اقدار متاثر ہوتے ہیں۔ اِن کے قلم سے جو افسانے ہم تک پہونچے ہیں، اُن میں بیشتر نئی فضا، نئے پن کا احساس دلاتے ہیں۔ سوال اہم یہ ہے کہ یہ نیا پن ہے کیا؟ کیا موضوعات بدل گئے ہیں؟ کیا اسلوب میں تبدیلی آگئی ہے؟ یا پھر اپنے پیش روؤں کی طرح محض تجربے کی تبدیلی سے مطمئن ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نئے افسانے کا جو خمیر اُٹھا ہے، ان میں تینوں عناصر مخلوط صورت میں موجود ہیں۔ موضوعات کی دنیا پھیل گئی ہے۔ اظہار کے پیرائے، اجزائے ترکیبی کے محتاج نہیں رہی تجربے کی بات تو ہر صورت میں موجود رہتا ہے۔

ہمارا عہد سیاسی اور غیر سیاسی دونوں طرح کی تبدیلیوں سے گزر رہا ہے۔ عالمی منظرنامے پر صرف ایک نظر ڈالیں پھر کہنے کو کچھ باقی نہیں۔

آبادی سے لے کر پانی کا مسئلہ، نسلی اور تہذیبی منافرت، فرقہ پرستی، دہشت گردی، انسداد دہشت گردی کے نام پر سرکاری دہشت گردی، انتہا پسند تنظیموں کا عروج، طاقت ور ملکوں کی جارحیت، سیکولرزم اور عدلیہ کی پسپائی، گجرات، 9/11 عراق، افغانستان، یمن، شام کے حالات نے اُس میں محرومی اور بے بسی نے پورے منظرنامے کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ سوچ کی سمت کہاں سے کہاں جا پہونچی ہے۔ آج کا فنکار ان سارے مسائل سے دوچار ہے۔ وہ ان مسائل کا ذکر کرتے خاموش نہیں رہنا چاہتا بلکہ اپنے میسر لہجے میں احتجاج بھی کرتا ہے۔ جس تیز رفتاری سے تبدیلیاں سامنے آرہی ہیں اس عہد میں اس کا تصور بھی محال ہے۔ اور فنکار کو ایسے حالات کا سامنا ہے جہاں Information کا سیلاب ہے کہ اس میں بہا جارہا ہے۔ حیرت انگیز اور چونکا دینے والی باتیں تو اخبارات میں ہوتی رہتی ہیں، افسانوں میں بھی کبھی یہ صورت حال دکھائی دیتی ہے۔ چونکانا خبر کا مقصد ہوسکتا ہے۔

لیکن افسانوں میں یہ مقصد اور فن کی صورت میں اُبھرتا ہے۔ روزانہ کی زندگی میں ایسے واقعات وحادثات رونما ہوتے ہیں جسے سُن کر ہم چونکتے بھی ہیں۔ لیکن دوسرے ہی دن اُس سے بھی زیادہ دلدوز خبر سننے کو ملتی ہے اور اُس کی Contimity اتنی تیز ہوتی ہے کہ حیرت زدہ یا چونکنے کی کیفیت بھی ختم ہوکر رہ جاتی ہے۔ ذہین فنکار کبھی بھی حیرت انگیزی کو اپنا مقصد نہیں بناتا۔ اُس کے نزدیک واقعہ کا پس منظر اور پیش منظر دونوں کی اہمیت ہوتی ہے جو انسانی شعور کے دریچوں کو کھول کر رکھ دیتا ہے۔ 1980 کے بعد لکھنے والوں میں یہ خوبی بدرجہ اتم نظر آتی ہے جنہوں نے موجودہ حالات خواہ وہ ملکی ہوں یا غیر ملکی دونوں پر پوری نظر رکھتا ہے۔ تبدیلی کو صرف تبدیلی نہیں سمجھتا بلکہ اُس کے مضمرات کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

میں یہاں چند ایسے فنکاروں کا ذکر کروں گا جنہوں نے پوری سنجیدگی اور فکرمندی سے تخلیقی کام انجام دیے، وہ کسی مخصوص مکتبہ فکر سے تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ بغیر کسی بیساکھی یا گیمر کا سہارا لیے اپنی شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے۔ میری مراد احمد صغیر، شاہد اختر، خورشید اکرام، خورشید حیات، خالد جاوید، مظہر سلیم، پرویز شہریار، اختر آزاد، اسلم جمشید پوری، نیاز اختر، غزال، ضیغم، شائستہ فاخری، ثروت خاں، کہکشاں پروین، حنا فاروقی، تبسم فاطمہ وغیرہ وغیرہ۔

ان نام ناموں میں ایک نام پرویز شہریار کا ایسا ہے جن کی انفرادیت

کے کئی اسباب ہیں۔ میرے اس مختصر سے مضمون کا مقصد اُن کے افسانوں کے حوالے سے یہ طے کرنا ہے کہ وہ کون سی سرزمین ہے جہاں تجربات کی ایک دنیا آباد ہے اور جہاں انھوں نے اپنے لیے موضوعات کشید کیے ہیں۔

پرویز شہریار کا تعلق شہر جمشید پور سے ہے۔ یہی ان کی تعلیمی اور ادبی جولان گاہ ہے۔ ان دنوں دہلی جیسے شہر میں مقیم ہیں اور پرسکون ہیں۔ میں نے لفظ پرسکون کا استعمال جان بوجھ کر کیا ہے کہ اُن کی تخلیقات میں ان دونوں شہروں کا عکس ملتا ہے۔ چھوٹے اور بڑے شہروں کا فرق موجود ہے۔ اُس کی محرومیاں اور کثافتیں موجود ہیں۔ میں اپنے مطالعے کو اسی حد تک محدود رکھنے کی کوشش کروں گا۔

پرویز شہریار کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا'' بڑے شہر کا خواب''2003 میں شائع ہوا۔ دوسرا''شجر ممنوعہ کی چاہ میں''2014 میں سامنے آیا۔ ان دونوں مجموعہ کی اشاعت میں آٹھ برس کا وقفہ ہے۔ اُن کی پہلی کہانی ''چمبل کی دسویں رانی'' پٹنہ سے شائع ہونے والے دیبکلی ''پندار میں 9 ستمبر 1980 کے شمارے میں چھپی۔ پریم چند کی کہانی ''عیدگاہ'' ہے انھیں کہانیاں لکھنے پر اکسایا کہیں کہیں پریم چند کی چھاپ بھی ان کی کہانیوں میں نظر آتی ہے۔ اول وہ جدیدیت سے متاثر ہوئے اور اس رجحان کے تحت چند افسانے بھی لکھے۔

ایک نظر اُن کے خاص افسانوں پر''جرم ضعیفی کی سزا''،''شال باف کی بیٹی''،''نیا سورج نیا سویرا''،''کھوئے ہوئے جستجو''،''میرے طوفان بم بہ بم''،''جولان گاہ کی حد''،''سایہ سایہ جنگل''،''شجر ممنوعہ کی چاہ میں''،''لوان ریلیشن سے پرے''، ''دس سروں والا بجوکا''،''سلوا جڈوم کہاں جائیں'' اور''بتولن ڈائن کیسے بن گئی'' و غیرہ۔ یہ لازم نہیں کہ دوسرے بھی اس فہرست سے اتفاق کریں۔ اِن دونوں مجموعے کے مطالعے کے بعد میں جس نتیجے پر پہونچا ہوں کہ بیشتر افسانوں کے موضوعات الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک بات قدرے مشترک دکھائی دیتی ہے۔

انسانی زندگی حالات کے قطبین میں کس طرح جیا کرتی ہے۔ سکھ دکھ، عیش وآرام، محبت ونفرت، ایمانداری وبے ایمانی کی یکسانیت کے باوجود کسی طرح سے رویوں میں فرق آتا ہے۔ بات ذرا کھل کر کہوں تو پرویز شہریار کے افسانے میں نے دو حصوں میں تقسیم کیے ہیں۔ اول ایسے جو چھوٹے شہر یا پھر دیہاتی زندگی سے متعلق ہیں دوم ایسے جو''میٹرو'' شہر کی زندگی کا عکس پیش کرتے ہیں۔ پرویز شہریار کو ان دونوں علاقوں کا خوب خوب تجربہ ہے۔ اور اپنے مشاہدے کی عینک سے جو کچھ انگیز کیا اُسے اپنے افسانوں میں پوری ہنرمندی کے ساتھ پیش کر دیا۔ بہتر ہوگا کہ افسانہ نگار کی رائے خود افسانوں کے متعلق کیا ہے جانیں۔

''میرا ماننا ہے کہ دنیا میں جو چیز بھی موجود ہے اُن کے ہونے کا کچھ جواز ضرور ہے۔ گھاس کی پتی سے لے کر کہکشاں کی دودھیا روشنی تک کوئی بھی شئے بلاوجہ وجود میں نہیں آتی ہے۔ اُس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ کہانی، قصے یا افسانہ کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ مقصد جتنا مقبول عام اور اعلیٰ ہوگا، افسانہ بھی اتنا پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔۔۔ افسانہ نگار جس سماج میں جس دور میں جی رہا ہوتا ہے۔ اُس کے فن پارے میں اُس دور کے سماج کی دھڑکن سنائی دینی چاہیے۔ واقعات اور بشری محاکات بعید از امکانات نہیں ہونے چاہیے۔ اُن کے کردار کے حرکات وسکنات سے اُس معاشرے کی تہذیب کی جھلک دکھائی دینی چاہیے۔'' (شجر ممنوعہ کی چاہ میں، ص 11)

اب دیکھنا یہ ہے جن اقدار پر وہ یقین رکھتے ہیں۔ اُسے اُنھوں نے اپنے افسانوں میں کتنا اور کیسا برتاؤ ہے۔ میں یہ بات پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اُن کے خیالات ونظریات کی جھلک اُن کے افسانوں میں دکھائی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے قدرت کی بنائی اُس وسیع دنیا کا کچھ تو سبب ہے اور مقصد بھی۔ انسان کا وجود اُس کی سب سے بڑی وجہ ہے، رہی بات مقصد کی تو ایک رشتہ جو بندہ اور بندگی میں ہے اُس کے کئی مقاصد میں سب سے اہم مقصد بھی یہی ہے۔

میں نے اپنی توجہ پرویز شہریار کے افسانوں پر مرکوز کی ہے جو میں نے اپنی آسانی کے لیے وضع کی ہے یعنی چھوٹے شہر اور قصباتی زندگی یا پھر بڑے شہر اور اُس میں پنپتی زندگی۔ یہاں یہ بات بھی کہنا چاہوں گا کہ پرویز شہریار کی پیدائش اور تعلیم شہر جمشید پور میں ہوئی۔ اور وہ بھی چھوٹے شہر کے ایک چھوٹے سے قصبے میں اپنے اُس ماحول میں انھوں نے جو کچھ دیکھا، بھوگا، برتا وہ تجربہ انھیں بہت کام آیا۔ پھر اچانک دہلی جیسے شہر میں مزید تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں یہ چھوٹا شہر ان سے چھوٹ گیا۔ یہاں کی حیرت ناکیاں، ماحول، رشتے، اطوار سب کچھ چھوڑے ہوئے شہر سے بالکل الگ تھے۔ ان دونوں ماحول میں اور کسی بات کی مماثلت نہ تھی سوائے اس کے کہ دونوں جگہوں میں انسان بستے ہیں۔ دراصل اسی فرق، اور اُس کی تصویر ان کے انسانوں کی بڑی خوبی ہے۔ پرویز شہریار صرف جانکاری ہی نہیں (بلکہ مجھے یقین ہے کہ کچھ ان کے ذاتی تجربات بھی شامل ہوں) بلکہ چھوٹے اور بڑے شہروں کی ان خوبیوں اور خامیوں سے واقف ہیں۔ دو سطح پر جینے والوں کی روشن اور رویے بالکل الگ ہوتے۔ اُن مضمرات کی تلاش ہم شہریار کے افسانوں میں کرتے ہیں۔

''اس کا مرض جب بڑھ گیا تو وہ رات دیر تک شراب پی رہا تھا اور اپنی بیوی، بیٹی اور اپنے داماد کے نام جی بھر کے گالیاں نکالتا رہا تھا۔ صبح محلے والوں نے بتایا کہ اس شخص نے اتنی گالیاں اسے پہلے کبھی نہیں بکی تھیں۔ دس بارہ دنوں میں سے اُس کی حالت میں کافی سدھار آ گیا تھا، لیکن اچانک کل رات — ہڈیوں کو چھید دینے والی سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور اُس سے بھی زیادہ تلخ گالیاں بک رہا تھا۔ اچانک رات کے آخری پہر وہ یکا یک بالکل خاموش ہو گیا۔''

(بڑے شہر کا خواب، جرم ضعیفی کی سزا، ص-7)

''بیٹا! میں اچھی ہوں، تم فکر مت کرو، گھر میں سب آرام سے ہیں تم اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔ تمہیں جتنے پیسوں کی ضرورت ہوگی لکھو، کہیں سے بھی بندوبست کر کے بھیج دوں گی۔ ہاں! پچھلے دنوں طبیعت ذرا خراب ہو گئی تھی، گرمی کی وجہ سے ناک سے کچھ خون آ گیا تھا۔ تم اپنی صحت کا خیال رکھو گے۔ زیادہ محنت نہ کرنا۔ وقت پر کھانا کھا لیا کرو گے اور دیر تک رات میں مت جاگنا، ورنہ فجر کی نماز قضا ہو سکتی ہے۔''

''بیٹا! مجھ سے اب سائیکل نہیں چلتی۔ چشمہ کا شیشہ بھی گر کر ٹوٹ گیا ہے۔ آصف کو اسکول لے جانا اور اسے ہوم ورک کرانا، یہ کام بھی مجھ سے نہیں ہو پاتا

ہے۔اس برسات میں پچھواڑے کی کچی دیوار بھی گر گئی ہے،لکڑی والا بجلی کا کھمبا، دیمک کھا جانے کی وجہ سے گر گیا ہے۔اس سال چھت کی شہتیر بھی ٹوٹ گئی ہے۔اسے بدلوانا ضروری ہے۔تم جیسے بھی ہو سکے پڑھائی کے ساتھ کچھ کام کرنے کی کوشش کرو۔''

(بڑے شہر کا خواب، حالات کے مارے،ص-39)

''آزادی کے چالیس سال بعد ملک کہاں سے کہاں نکل گیا۔ دنیا کتنی ترقی کر گئی اس کے کچھ ساتھی پاکستان چلے گئے، کچھ وہاں سے بھی ہجرت کر کے لندن اور امریکہ پہونچ گئے۔لیکن آج تک وہ اپنے آبا و اجداد کے اسی شکستہ مکان میں رہتا ہے۔پچھلے کئی برس سے اُس نے مکان کی مرمت کا ارادہ کیا تھا لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی بات آڑے آجاتی۔''

(بڑے شہر کا خواب،شال باف کی بیٹی،ص-53)

''ہمارے کھیت جب کئی دنوں تک مسلسل سوکھے پڑے رہ گئے اور لہلہاتی فصل ہماری آنکھوں کے سامنے جھلس گئی میرے برسہابرس سے پہاڑ، جنگل گاؤں میں جمے ہوئے تھے ایک دم اکھڑ گئے۔میرے باپ نے مجھے ریل گاڑی پر بٹھا کر آخری بار تلقین کی تھی۔بیٹا!اپنے تیز تیز قدموں کو آخری منزل تک کبھی رکنے مت دینا۔''

''میرے کئی ایک ساتھی بٹھا دیے گئے ہیں، کچھ تو عارضی ملازمت پر ہی کمپنی خود اختیاری ریٹائرمنٹ کے لیے مجبور کر رہی تھی۔لیکن اگر واقعی ایسا ہو گیا تو مجھ جیسے مزدور کا کیا حشر ہوگا؟ جو اپنے کھیت کو بجلی کی قلت کے سبب چھوڑ چکا ہے۔جس کے گھر پر جوان بہنیں ہر ماہ دس تاریخ کو منی آرڈر کا انتظار کرتی ہیں۔ جس کا بوڑھا باپ اب تیز تیز قدموں سے چل نہیں سکتا، ماں کو بلڈ پریشر ہے دوا بغیر ناغہ روز کھانا ضروری ہے۔جس کا بھائی اسکول کی فیس کے لیے پوسٹ آفس میں آ کر بار بار دریافت کرتا ہے۔شہر سے کوئی خط آیا۔''

(بڑے شہر کا خواب، جولان گاہ کی حد،ص-64)

''دیکھیے صاحب! ہم کو سماج سے کوئی مطلب نہیں۔''میرا تجسس بڑھ گیا میں نے خاموش رہ کر اُسے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا بھرپور موقع دیا۔''میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے اور نہ ہم کو کسی سے مطلب بھاڑ میں جائے سماج اور سماج کے لوگ'' وہ شاید سماج کے معنی صرف اس کے اپنے گاؤں کے لوگ ہی سمجھ رہا تھا۔''

(بڑے شہر کا خواب، بات رے، ترا بھولپن،ص-83)

''اس نے بھوک کی شدت سے بے حال ہو کر جب کروٹ بدلا تو نالے کی دیوار کے اوپر سے لال قلعے کی اونچی فصیل نظر آ رہی تھی۔ جہاں آزاد بھارت کا پرچم لہرا رہا تھا،اس نے پھٹی ہوئی چادر کے سوراخ سے دیکھا،ایک موٹا سا بڑی توند والا شخص جو شکل اور لباس سے کوئی سیٹھ معلوم ہوتا تھا، بغل میں چمڑے کا بیگ دبائے کھڑا پیشاب کر رہا تھا۔اس نے سوچا ذیابطیس کا مریض ہے شاید اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ پیشاب کی بدبو کا ایک زوردار بھبکا آیا اور اس کے نتھنوں میں سرایت کرتا ہوا گزر گیا۔''

(بڑے شہر کا خواب، نیا سورج، نیا سویرا،ص-93)

درج بالا اقتباسات میں نے ان کے پہلے مجموعے میں شامل افسانوں سے لیے ہیں۔ان اقتباسات میں جو بات مشترکہ طور پر اُبھرتی ہے وہ کرداروں کے سماجی پس منظر،گھریلو حالات،ضرورت، بے بسی،مجبوری، ذمہ داری اور ایک اچھی زندگی کی خواہش کا منظر ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ہجرت کے نام پر انسانیت کے بڑے قرض چکائے۔ہجرت کسی بھی، کسی طرح کی بھی ہو اپنے اندر امیدوں اور تمناؤں کا ساگر رکھتی ہے۔چھوٹے قصبے کے لوگ بڑے شہروں سے توقعات رکھتے ہیں اور بڑے شہروں کے لوگ اور بڑے شہر سے۔ پرویز نے اپنے افسانوں میں ایسے ہی کرداروں کا معاشی پہلو ذہنی اور نفسیاتی حالت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔بلکہ سچائی تو یہ کہ معیشت کے سبب پیدا ہونے والے ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کی خوبصورت ترجمانی کی ہے۔

کردار خواہ وہ بوڑھا ہو جو عمر کے اس حصے میں ہے جو پورے خاندان کے لیے ناکارہ ہو چکا ہے۔اس کے بیوی بچوں نے اس وقت اس کا ساتھ چھوڑا جب اسے ان سب کی زیادہ ضرورت تھی۔ غصے اور بے بسی کے عالم میں ایک نارمل آدمی بھی غیر اخلاقی حرکتوں پر اُتر آتا ہے۔ اور اپنی بھڑاس خاندان سے، سماج سے اور اپنے آپ سے نکالنے کے لیے الگ الگ راہ تلاش کرتا ہے۔ پرویز نے بوڑھے کے حالات کی ترجمانی میں جس پہلو کو خاص طور پر ابھارا ہے وہ ایسے انسان کی خودغرضی، جب تک اپنے اندر ہمت، طاقت تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت انسان میں موجود ہوتی ہے تب تک سب ٹھیک ٹھاک لیکن ان میں سے کسی ایک کی کمی اس کے اندر آتی تو بے اعتنائی کا سلسلہ نہیں رکتا اور ایک وقت آتا ہے جب وہ اپنے ہی گھر میں تنہا رہ جاتا ہے۔افسانہ'' جرم ضعیفی کی سزا''ایک ایسے ہی بوڑھے کی داستان ہے جسے پرویز نے خاندانوں میں موجود اس حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔

افسانہ''حالات کے مارے''قصباتی زندگی اور معاشی طور پر کمزور لوگوں کا ترجمان ہے۔ایک ایسے خاندان کا نقشہ ہے جس میں بوڑھے ماں باپ، بچے کا واحد سہارا ان کا بیٹا ہے جو باہر کہیں پڑھ رہا ہے۔گھر کے حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں ماں کی پوری تائید بیٹے کے ساتھ ہے۔ بڑی ہمت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے بیٹے کو تلقین کرتی ہے۔اور اپنی بیماری کو چھپائے رہتی لیکن بیٹا سچائی سے واقف ہے۔ باپ نامساعد حالات سے اسے باخبر کرتا رہتا ہے۔اور اپنی مجبوری بھی بیان کرتا ہے۔ اور نصیحت کے طور پر کچھ کام کرنے کی تلقین بھی۔ بیٹا اس حقیقت سے واقف ہے۔اس کے علاوہ گھریلو ذمہ داریاں۔اندازہ کریں ایک ایسے لڑکے کی ذہنی حالت کا جو باہر شہر میں پڑھتا ہے اس امید پر کہ اسے اچھی نوکری ملے گی۔حالات میں سدھار آئے گا، ضرورتیں پوری ہوں گی۔دکھ سکھ مل کر بانٹ لیں گے۔ جہاں جہاں صرف دکھ ہی دکھ ہوں اور اس کے مداوا کی کوئی صورت نہ ہو۔امید کے سارے در بند ہوں ایسے میں کوئی کیسے دلاسہ دے، سمجھائے اور بھروسہ دلائے۔ پرویز شہریار کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اپنی جزئیات نگاری پر کافی دسترس ہے قصے کو بیان کرتے وقت بہت چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کی نظر ہوتی ہے۔اس کی وجہ سے قاری کے سامنے پوری تصویر فلم کی مانند چلتی رہتی ہے۔چھوٹے اور قصباتی علاقے میں رہنے والے ہر دوسرے خاندان میں یہ تصویر نظر آئے۔میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ پرویز شہریار نے یقیناً کئی ذاتی تجربات کا سہارا اپنے افسانوں میں لیا ہے۔اور کامیاب ہیں۔

''چہارسُو''

گاؤں میں بگڑتے ہوئے حالات نے لوگوں کو شہر کی جانب مراجعت پر مجبور کیا۔ امیدوں کی ایک دنیا بسائے، آنکھوں میں چند خواب لیے شہر میں آنے والا انسان شہر کی چکاچوند سے متاثر تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پہنچنے والی تلخ حقیقتوں سے واقف نہیں ہوتا۔ نتیجے کے طور پر نہ گاؤں کا رہتا ہے نہ شہر کا۔ وہ واپس جا نہیں سکتا اور شہر ہے کہ سرکتا جا رہا ہے۔ پاؤں کہاں جمے۔ نئے اور بستے ہوئے شہر کی اپنی ضرورتیں ہیں اور تقاضے بھی۔ جو اس دور میں شامل ہوا اسے بہت کچھ کھونا ہی پڑتا۔ گاؤں سے آئے بھولے بھالے لوگ ان پیچیدگیوں سے پوری طرح سمجھ نہیں پاتے اور اسے بہاؤ میں بہتے چلے جاتے ہیں۔ جہاں سے واپس پلٹنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ اور ان کے پیچھے انتظار کرنے والی آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ ''جولان گاہ کی حد'' میں پرویز شہریار ایسے ہی دکھ بھرے حالات کی ترجمانی کی ہے جہاں شکستگی ہے، ٹوٹتے خواب ہیں، مجبوری ہے اور ضروریات کی شدت ہے۔ اور ان سے وابستہ انسان کی مجبوریاں ہیں اور اس کے حدود۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ایسے مناظر عام پر دیکھنے کو ملیں گے بس دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔

میں پھر اسی گاؤں کی جانب لوٹتا ہوں جہاں سے انسان مختلف اسباب کی وجہ سے شہر کا رخ کرتا ہے۔ اور اسباب ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی بغاوت اور ملال بھی اس کا سبب بن جاتا ہے۔ ''ہات رے تیرا پھولین'' ایسے ہی خاندان کا قصہ ہے جو میاں بیوی اور بچے پر مستعمل ہے۔ شوہر کام کی تلاش میں شہر میں ہے اور پیچھے اس کی بیوی فطری تقاضوں سے مجبور بدراہ ہو جاتی ہے۔ یہ خبر اس پر بجلی بن کر گرتی ہے اور وہ اپنی بیوی سے ہی نہیں بلکہ پورے سماج پر تھوکنے لگتا ہے۔ لیکن جب ذرا ابال کم ہوتا ہے تو اسے اپنی بیوی کی معصومیت اور اس کی مجبوری پر ترس آنے لگتا ہے۔ لیکن ملال ہے کہ تھمتا نہیں۔ اسی کشمکش میں وہ اپنے بچے کے سہارے سب کچھ بھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ پرویز نے کردار کی صرف ذہنی ہی نہیں نفسیاتی کیفیت کو بھی بہت خوبی کے ساتھ اجاگر کیا۔ کس طرح خاندان بنتے اور اجڑتے ہیں۔ قدموں کے فاصلے جیوں جیوں بڑھتے ہیں، دلوں کے فاصلے بھی اسی رفتار سے بڑھتے جاتے ہیں۔

کچھ سیاسی اور کچھ ذاتی دکھ اور مجبوری میں گھومتا افسانہ ''شال باف کی بیٹی'' ایک اپنے کشمیری بوڑھے کا قصہ ہے جس کی زندگی کا دارومدار سیاحوں کی آمد اور ان کی خدمت پر ہے۔ کشمیری بوڑھا اپنا جوان بیٹا کھو چکا ہے۔ ایک بیٹی رہ گئی ہے بیٹا دہشت گرد کے ہاتھوں گیا، سرکار نے غداری کا الزام الگ لگایا۔ ملک اور مٹی سے اس کی محبت اور دہائی کام نہ آسکی اور عمر کی اس دہلیز پر ہے جہاں وہ زور سے چیخ کر احتجاج بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن زندگی کی گاڑی تو کھینچنی ہے۔ پہاڑوں پر آباد چھوٹے سے گھر میں بیٹی اس کی کل کائنات ہے۔ اس کی ساری زندگی برفیلے پہاڑ اور کھائیوں کی نذر ہو چکی ہے۔ آسودگی کس چیز کا نام ہے وہ نہیں جانتا۔ ایماندار اور خوددار ہے۔ لیکن زمانے کی چالاکیوں سے ناواقف ہے۔ اس لیے پورے سسٹم کی عیاریوں کا شکار ہے۔

خفت، مجبوری، بے بسی اور خوف کے ملے جلے ماحول میں جینے والا بوڑھا پورے کشمیری منظرنامے پر علامت کے طور پر ابھرتا ہے۔ پرویز نے صرف ایک بوڑھے کی کہانی نہیں بیاں کی بلکہ ان تمام مقامات پر ہونے والے حالات کا بیان کر ڈالا جہاں یہ صورت حال موجود ہے۔ میں ایسے افسانے کو عالمی منظرنامے میں دیکھتا ہوں۔ اور نظر ڈالیں تو اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں رہے گا۔

افسانہ ''نیا سورج نیا سویرا'' اپنے عنوان سے ہی امیدوں کا مظہر ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ انسان امیدوں کے سہارے ہچکولے لیتا نئی زمین تلاش کرتا ہے۔ اور نئی زمین اسے بدلے میں کیا دیتی ہے۔ افسانہ ''نیا سورج نیا سویرا'' اس کا ترجمان ہے اور شاید اگر میں غلط نہیں تو اسی افسانے سے پرویز شہریار کے افسانوں کا دوسرا پہلو شروع ہوتا ہے جسے میں نے ''بڑے شہر کے حالات'' کا نام دیا ہے۔

دوسرے مجموعے ''شجر ممنوعہ کی چاہ میں'' ایسے کئی افسانے ہیں جس کی بنیاد پر میں نے یہ رائے قائم کی ہیں۔ گاؤں اور قصبات کی زندگی حقیقت سے قریب ہے۔ شہر میں حقیقت کو بنائے رکھنے کے لیے دکھاوے اور (Mask) کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیوں شہر آپ سے یہی چاہتا ہے جو باتیں گاؤں میں عیوب شمار ہوتے ہیں یہاں ''اسٹیٹس سمبل'' بن جاتا ہے۔ پیسے کی ریل پیل بھی ہے۔ مصلحت اور مصالحت بھی ہے۔ دھوکہ، مکر و فریب سب کچھ ہے۔ انسان وہی ہے لیکن جگہ اور حالات نے اس کے رویوں میں کس قدر تبدیلی لائی ہے، پرویز شہریار کے افسانوں میں بخوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔

''ازدواج کی عارضی ادلا بدلی اور فرسودہ رشتہ میں نئی بہار آجاتی ہے۔ جس سے رشتے کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور محبت کے بوسیدہ شجر پر نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔''

''ہم محبت کے رس میں بھیگے ہوئے تھے۔ ہمیں غیر مرد کی آغوش میں سپردگی کے لیے خود ہمارے شوہر آمادہ کر رہے تھے۔ ان کی مدد سے ہم اپنے لباسوں کی قید سے انتہائی حساس طریقے سے دھیرے دھیرے آزاد ہو رہے تھے۔ ہمارے جسم کے تمام رونگٹے کانٹے دار گرگٹوں کی طرح کھڑے ہو جاتے تھے۔ جوں جوں مردانہ ہاتھوں کے لمس سے ہماری حساس جلدیں مس ہوتی جاتیں تھی۔ اوپر سے نیچے تک ہمارے اعضا بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہے تھے..... کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کون سا ہاتھ اپنے اور کون سا پرائے مرد کا ہے۔ پورے بدن میں کپکپاہٹ سی دوڑ رہی تھی۔ ہم پر بے خودی اس قدر طاری تھی کہ کچھ بھی سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ ہر پل بلکہ ایک ایک پل کے ہزارویں حصے میں بھی احساس کی لاکھوں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہمارے جنسی غدود میں اس قدر ہلچل مچی ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ پراکرتی اور پرش کے اس ملن نے فطرت کے کاموں میں دخل در معقولات کر کے جوالا مکھی، طوفان اور سیلاب تینوں کے گیٹ بیک وقت کھول دیے ہیں۔ اور ہم خس و خاشاک کی طرح جنسی ہیجان کے سیل رواں میں بہتے جا رہے تھے۔''

(شجر ممنوعہ کی چاہ میں، ص-2)

یہ افسانے مجھے کئی لحاظ سے کافی پسند ہے۔ اول تو اس کا موضوع دوسرا انسان کی زندگی کا تاریک پہلو، پھر افسانے کی کیفیات بیان، منظرنگاری اور انجام کی تلخی سب کچھ پرویز نے اس میں بھر دیا ہے۔ یہ ایسے شہر کا بیان جو مہذب اور ترقی یافتہ کہلاتا۔ پیسے کی جائز یا ناجائز آمدنی کا استعمال مختلف طریقوں اور مختلف مقامات پر الگ الگ ڈھنگ سے ہوتا ہے۔ جلد حاصل ہوئی دولت کے

استعمال کے طریقے بھی نکل آتے ہیں۔ اعلیٰ سوسائٹی میں اپنی پہچان بنانے کے لیے انسان وہ سب کچھ کرتا ہے۔ جس کا تصور تمام صورت میں ممکن نہیں۔ نائٹ کلب یا Soho Club کی ایک توسیعی شکل Hidden Club ہیں۔ یہ کلب ایسی کئی طرح کی پارٹیاں منعقد کرتی ہیں جہاں انگریزی میں کہہ سکتے ہیں۔ Where the men and women meet to enjoy sex بڑے شہر میں اگر ایسے مقامات نہ ہوں تو وہ پسماندہ شہر کہلائے گا۔ قد اور اعلیٰ طبقے کی سربراہی اور نگرانی میں چلنے والے ایسے کلب کو نہ فطرت کے قوانین کا خوف ہے نہ حکومت کے قوانین کا۔ بس پیسہ دیجیے اور تماشہ دیکھیے۔

Beach Party, Health Club, Massage Club, Reverse Orgy اور Orgy Swana Bath ان ہی خواہشات کی تکمیل کی خاطر وجود میں آئے۔ یہ انسان کی وہ ابتدائی محرومیاں ہیں جو پیسے کے سبب ناتکمیلیت کا شکار ہیں اور جب گھل کھیلنے کے مواقع ملے تو وہ ایک ہی جست میں سارے حدود پھلانگ جانا چاہیں گے۔ ''شجر ممنوعہ کی چاہ میں'' ایسے حالات کو پیش کرتا ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل ضرور ہے لیکن بڑے شہروں کی شان میں اضافے اور کشش کا سبب بھی۔ پرویز نے اس افسانے کے حوالے سے اس لعنت کے طفیل پیدا ہونے والے انجام کو پچھتاوے اور لاحاصلی کے حوالے کیا کہ یہی حقیقت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شہریار جس مہارت سے ''درون'' کا قصہ بیان کیا ہے وہ چونکانے والا نہ بھی ہو تو جذبات نگاری اور منظر نگاری میں حسن کا اضافہ ضرور کیا ہے۔ وہ نہ صرف حالات کو سمجھتے ہیں بلکہ اس کی تہہ میں موجود ناکامیوں سے بھی واقف ہیں۔ جنسی لذت پرستی کے اس اعلیٰ طبقے کے کھیل نے ہزاروں گھر اجاڑ دیے لیکن یہ کہ پھر اس Modernity کا کیا ہوگا۔

''بھوک کی جبلت نے ان دونوں کو ایک کروڑ بیس لاکھ کی گنجان آبادی والے شہر میں ایک چھت کے نیچے، ایک ہی کمرے کے اندر بلکہ ایک ہی بستر پر سونے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ کہتے ہیں بھوک چاہے ناف کے اوپر کی ہو یا ناف کے نیچے کی — بھوک تو بھوک ہوتی ہے۔ جب لگتی ہے تو انسان باغی ہو جاتا ہے۔''

''پدمجا کو بھی دنیا بھر کے مردوں کی اوچھی نظروں سے خود کو بچانے کے لیے فوری طور پر الگ بوائے فرینڈ کی ضرورت تھی جس کی مضبوط بانہوں اور چوڑے چکلے سینے کو وہ بوقت ضرورت اپنے تحفظ کے لیے ڈھال کے طور پر استعمال کر سکے۔''

''ان تین برسوں کے ابتدائی دور میں ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ ان کے سارے اصول وضوابط جو بھی انھوں نے اپنے لیے بنائے تھے وہ سب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ کرسمس کے موقع پر شمپین کے سرور نے کبھی انھیں ایک درجے میں مدغم کر دیا تو کبھی ہولی کے موقع پر بھنگ اور رنگ نے مل کر ساری حدیں پھلانگ دیں۔ لیکن ہر بار ہوتا یہ تھا کہ پدمجا خود ہی نرس تھی کوئی نہ کوئی ''پری وینٹو ادویہ'' لے لیا کرتی تھی۔''

(شجر ممنوعہ کی چاہ میں، بِلو ان ریلیشن سے پرے، ص-25)

''اس رات پدمجا شمبھو کی انگلی تھام کے اسے ایک ایسے حسین اور جواں اقلیم سیر پر لے گئی جہاں سچی محبت کرنے والے مرد اور عورت کے جوڑے ہی جا سکتے ہیں۔ اور وہاں جانے کے بعد زندگی اور موت کا کوئی فرق معنی نہیں رکھتا۔۔۔ تبھی پدمجا نے فرطِ جذبات میں آکر شمبھو کو اپنے گلے لگا لیا اور پوری قطعیت کے ساتھ اعلان کر دیا۔

''اب مجھے 'پری وینٹو پلس' کی ضرورت نہیں۔''

(اِدھان ریلیشن سے پرے، ص-27)

شہریار نے افسانے کی ابتداء میں ہی قاری کے لیے اتنی آسانی ضرور پیدا کر دی کہ پڑھتے وقت وہ جذبات میں نہ بہہ کر اس حقیقت کو مدنظر رکھے جو بڑے شہروں کی ودیعت ہیں۔ انسان کس طرح کن حالات میں جیتے اور رہتے ہیں۔ مجبوریاں کیا کچھ کرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ رشتے کس طرح بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ انجان لوگوں کے بیچ اگر کوئی بات Common ہوتی ہے تو ان کی ضرورت اور اس کی تکمیل میں جہاں کبھی مصلحت کام آتی ہے تو کبھی مصالحت۔ یہ افسانہ اسی ضرورت کی تصویر پیش کرتا ہے۔ بڑے شہروں کا ایک عذاب یہ بھی ہے کہ رہائش کا مسئلہ بہت گمبھیر ہے جس کا اثر طرز رہائش پر پڑتا ہے۔ اسی طرز رہائش کی صورت کبھی مجبوری اور کبھی سمجھوتے کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ ''بِلو ان ریلیشن سے پرے'' بڑے شہروں کے طرز نو اور سمجھوتے کے نتیجے میں وجود میں آنے والے اثرات کا غماز ہے۔

پدمجا اور شمبھو دو الگ الگ مقامات اور چھوٹے شہر سے نوکری کی تلاش میں بڑے شہر میں ہیں۔ دونوں ایک سی صورت حال کا شکار ہیں جس نے ان کے نام، کام اور دھام تینوں کو مغلوب کر رکھا ہے۔ اور ہر طرح کے سمجھوتے پر مجبور ہیں۔ کبھی کبھی یہ مجبوری خوش آئندہ پیغام بھی لے کر آتی ہے۔ اور دلوں میں نفرت کی جگہ محبت لے لیتی ہے۔ پھر تقدس کے سارے بندھن ٹوٹ کر فطری تقاضوں میں مدغم ہو جاتے ہیں۔

ایسے کئی گھر شہروں میں موجود ہیں جن کے آباد ہونے کے لیے تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ یہ داستان پوشیدہ ہے۔ یہاں اخلاقی قدریں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ مصلحت کوشی کئی ایسے فیصلے لینے پر مجبور کرتی جس کا گمان اسے نہیں ہوتا۔ کبھی ان فیصلوں پر ذہنی قربت یا خاندانی پس منظر آڑے آتا ہے لیکن نباہ کی صورت نکل جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو کیا کریں؟

پدمجا اور شمبھو بھی یہاں انہیں حالات کے گھیرے میں ہیں۔ لیکن انسان کے اندر یہ خوبی موجود ہے کہ وہ ہر حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

گرچہ پچھلے ان دو افسانوں میں جنس کا پہلو شامل ہے۔ لیکن جنسیت کا شکار نہیں جس سے حظ اٹھایا جائے۔ بلکہ ضرورت اور تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے پرویز شہریار اسے سطحی ہونے سے بچایا بھی اور اس کی اہمیت کو بتایا بھی۔

''قصہ دراصل یہ تھا کہ دیویانی کے شوہر پردیپ پر اثر ہے۔ انٹرنیٹ' پر ایک شوٹنگ کا معاہدہ کیا تھا۔ اس معاہدے کے تحت اسے گڑگاؤں کے اس شخص کے گھر ایک شب کے لیے تبادلہ ازدواج کرنا تھا۔ ہوتے ہوتے انتظار کے لمحات آخر ختم ہوئے۔ ادھر دیویانی ان باتوں سے بے خبر تا ترک بابا کے

خیالوں میں اس قدر غرق ہوگئی تھی اپنے ہونے والے بچوں کی کلکاریاں سنتے سنتے اوران کے ننھے منے ہاتھوں کی گدگدیوں سے محظوظ ہوئے کب گڑگاؤں کی اس کوٹھی میں پہونچ گئی اسے پتہ نہیں چلا۔''

(شجر ممنوعہ کی چاہ میں، سہاگ کا خون، ص-35)

''آج دیویانی کی ہزاروں راتوں کی پیاس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ چکی تھی۔ آج دیویانی نے اپنے ہونٹوں پر چھائی ہوئی برسوں کی پیاس کو اپنے شوہر کے خون سے بجھالی تھی۔'' (سہاگ کا خون، ص-38)

اس افسانے میں ''شجر ممنوعہ کی شاہ میں'' والی تھوڑی مماثلت تو ہے۔ لیکن عورت کے کرداروں میں فرق ہے۔ اور نمایاں فرق ہے۔ شجر ممنوعہ کی چاہ والی عورت نے خود کو حالات کے سپرد کردیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے شوہر کی خوشنودی کی خاطر اور تباہی کے دہانے تک چلی گئی۔ اس کے برعکس ''سہاگ کا خون'' کی عورت نے اپنی تقدس کی پامالی کا بدلہ اپنے شوہر سے لیا۔ وہ اس بات کو برداشت نہ کرسکی اور اپنے شوہر کی کمینگی کا بدلہ اس کو قتل کرکے لیا۔ دراصل یہ حالات اور نفسیات کا قصہ ہے۔ یوں بھی عورت کی نفسیات کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ کب کہاں اور کیسے فیصلے لے گی، اندازہ لگانا مشکل ہے۔

شہریار کے اس افسانے کو میں ''شجر ممنوعہ کی چاہ میں'' سے جوڑ کر دیکھتا ہے۔ ویسے بھی ان کے اندر یہ خوبی موجود ہے کہ وہ تقابلی صورت حال کو بہت مؤثر ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔

جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے کچھ افسانے ایسے ہیں جس پر دیہی اور کچھ ایسے جنہیں ہم شہری تناظر میں دیکھتے ہیں۔ لیکن اب صورت حال بدلتی ہے۔ گاؤں اور شہر میں اب صرف راستوں کا فرق رہ گیا ہے۔ ورنہ گاؤں بھی اب شہر کا حصہ بنتے جارہے ہیں۔

اب کھلیانوں میں پریم چند کا بجوکا نہیں بلکہ بندوق دھاری نکسلائٹ کا راج ہے۔ پہلے ساہوکار، زمیندار تھے اب غنڈے، شہدے اور جبراً چھین لینے والے لوگ ہیں۔ انھیں ہر طرح کا تحفظ حاصل ہے۔ ان کی مدد سے الیکشن لڑے جاتے ہیں۔ ان کے خلاف کوئی بول نہیں سکتا۔ ہوری اور دھنیا کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ نظام ویسے کا ویسا ہے۔ تبدیلی اگر آئی ہے تو پہلے ایک سر والا بجوکا تھا اب دس سروں والا (یعنی ساہوکار، غنڈے، زمیندار، لیڈر اور نکسلائٹ) ہے اور وہ کھڑا ہماری لاچاری، بے بسی کا صرف مذاق اڑا رہا ہے۔ افسانے کا اختتام دیکھیے۔

''بجوکا کا زہر خند مسکراہٹ میں لپٹا ہوا چہرہ ایک دم سے اس کے تصور میں گھوم گیا۔ بجوکا کے راون کی طرح دس سر نکل آئے تھے۔ اور وہ اس کی بے بسی پر زوردار قہقہے لگا رہا تھا۔''

ہوری نے انگوچھے سے اپنے ماتھے کے پسینے پوچھے اور زیر لب بڑبڑایا۔ ''اب پتا چلا۔ کولین اس وقت کھیت میں کھڑا کیوں مسکرا رہا تھا۔'' دھنیا کچھ نہ سمجھ سکی اور خالی خالی سی ہوری کا منھ تکتی رہ گئی۔''

(شجر ممنوعہ کی چاہ میں، دس سروں والا بجوکا، ص-65)

آج ہوری اور دھنیا کی جگہ ہم سب ہیں۔ کھیت کی جگہ کرپٹ سسٹم تو ہے۔ اس سسٹم کے چلانے والے اتنے طاقتور اور عیار ہیں کہ ہم چاہ کر بھی اپنا منھ نہیں کھول سکتے۔ صرف تصویر بدلی ہے باقی کچھ نہیں بدلا۔

ایک اور کہانی کا ذکر کرتے بات کو سمیٹنے کی کوشش کروں گا جس کا تعلق ایک خاص علاقے کی سرکاری مہم اور اس کے منفی نتائج پر مبنی ہے۔ کبھی کبھی سرکاری فیصلے اس قدر احمقانہ ہوتے ہیں کہ ایک مسئلے کو حل کرنے کے پیچھے جو تجویز ہوتی ہے اس کے نتیجے میں دس مسائل اور کھڑے ہوجاتے ہیں۔۔۔ ''سیلوا جڈوم کہاں جائیں'' ایک ایسی ہی کہانی ہے۔ شہریار نے اس کہانی میں شہری اور دیہی زندگی کا ملا جلا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ طرز معاشرت کے ساتھ ذہنیت اور مسائل کی نوعیت بھی سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

''ہم صنعتی شہر سے گاؤں بلکہ جنگل اور پہاڑوں کے دامن میں منتقل ہوگئے تھے۔۔۔''

''شہر کے لوگ سورج چڑھنے کے بعد آرام سے بستر پر استراحت سے اٹھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ اس کے برعکس تھا۔۔۔''

معلوم ہوا کہ منھ اندھیرے ہی ڈھیکی میں دھان کوٹا جارہا ہے۔۔۔ مزدور کسان آگ میں بھنی سوکھی مرچ اور نمک کے ساتھ اس لال چاول کے بھات کو پیٹ بھر کے کھانے کے بعد کام پر نکل جاتے ہیں۔

(شجر ممنوعہ کی چاہ میں، سیلوا جڈوم کہاں جائیں، ص-69)

آدبی باسی کلچر، ان کی معاشرت، رسوم ان کی معصومیت اور بچھڑے پن کی بہترین عکاسی اس افسانے میں موجود ہے۔ انھیں نہیں خبر کہ دنیا کس سمت میں جارہی ہے اور نہ کوئی خبر لینے والا ہے۔ وہ چکی کے دونوں پاٹ میں پس رہے ہیں۔ وہ قوانین جو شہر میں بیٹھے لوگ بناتے ہیں۔ اور اس قانون کی دھجیاں اڑانے والے ماؤنواز جو گاؤں میں پلتے ہیں ''اونگا'' جیسے لوگ کے لیے جینا بھی مشکل مرنا بھی۔

پرویز شہریار نے اس افسانے میں کمال کی منظر نگاری کی ہے۔ پورا نقشہ یوں کھینچا ہے کہ پوری تصویر ایک فلم کی مانند چلتی نظر آتی ہے۔ سیاسی بازیگری، بدنیتی اور معصومیت پر مبنی شہریار کی کامیاب کہانیوں میں سے ایک ہے۔

میں نے اپنی آسانی کے لیے صرف چند کہانیوں کا سہارا لیا۔ اور ایک مخصوص دائرے میں اپنی بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ 1980 کے بعد لکھنے والوں میں پرویز شہریار کا اہم نام ضرور ہے۔ لیکن کچھ ان کی فطرت یا مزاج اور کچھ ادبی خیموں کی برکات کہ وہ قارئین کے لیے ''تیسرا آدمی'' بن کر رہ گئے۔ ادھر ایک مثبت قدم اٹھانے اور ادبی حلقوں نے اپنی غفلت محسوس کی ہے۔ یہ مانتے ہوئے کہ انھیں اس بات سے غرض نہیں ہمیں حق گوئی سے کام لینا چاہیے۔ میں خاص طور پر پرویز شہریار کا شکر گزار ہوں کہ وہ اپنے سابق شہر جمشید پور کو بھولے نہیں۔ جمشید پور جابجا ان کے افسانوں میں موجود ہے۔ عبدالرزاق کھڑکپوری کے بعد یہ واحد فنکار ہیں جنھوں نے اپنے کئی افسانوں میں جمشید پور کو لاکھڑا کیا ہے۔

ان کی بے پناہ پوشیدہ صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے میرے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے کہ ان کی خصوصیات کو اجاگر کرسکوں۔

منٹو اور عصمت شناسی

ڈاکٹر محمد کاظم
(دہلی)

''منٹو اور عصمت دونوں نے سگمنڈ فرائڈ کے زیر اثر اپنے افسانوں میں کرداروں کے نفسیاتی تجزیے سے کام لیا ہے۔ فرائڈ کے اصول کے مطابق انسان کا عمل، ردعمل، اس کا ہر قول اور فعل دراصل بنیادی جبلتوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں جذبات اور بالخصوص جنسی جذبات کو جب دبایا جاتا ہے تو وہ اصل میں دبتے نہیں بلکہ تحت الشعور میں چلے جاتے ہیں اور جب بھی موقع آتا ہے تحت الشعور سے ابھر آتے ہیں۔''

ان جملوں کے خالق ایک افسانہ نگار، شاعر اور فکشن کے نقاد ڈاکٹر پرویز شہریار نے صاف کر دیا ہے کہ عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو نے اپنے افسانوں کے کردار تخلیق کرتے وقت کس نظریے کو سامنے رکھا ہے۔ یہاں مقصود بھی یہی ہے کہ عصمت اور منٹو کے افسانوں کے کرداروں کو پرویز شہریار کی نظر سے دیکھا جائے۔ پرویز شہریار نے 1980 میں افسانہ لکھنا شروع کیا اور دہلی آنے کے بعد تواتر سے مضامین بھی شائع ہوئے۔ ان کا اصل میدان افسانہ نگاری ہونے کی وجہ سے انھوں نے اپنی تحقیق کا موضوع بھی افسانے کو ہی بنایا۔ ان کی خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے منٹو اور عصمت کے افسانوں کے نسوانی کرداروں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان دونوں افسانہ نگاروں کے عورت کے تصور کو نہایت کامیابی سے پیش کیا۔ ان کی کتاب 'منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور' کے عنوان سے 2011 میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد 'راجندر سنگھ بیدی کی ناول نگاری' 2017 میں اشاعت کی منزل سے گزر کر قارئین کی داد و تحسین حاصل کی۔ ان کتابوں کے علاوہ دو افسانوی مجموعے 'بڑے شہر کا خواب' (2005) اور 'شجر ممنوعہ کی چاہ میں' (2014) کے ساتھ ساتھ دو شعری مجموعے 'بڑا شہر اور تنہا آدمی' (2009) اور 'بھوک کی حمایت میں' (2017) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری اور شاعری کے حوالے سے کئی مضامین نظر سے گزرے ہیں۔ گزشتہ دنوں ان کی کتاب 'منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور' اور ایک مضمون 'منٹو اور عصمت کے افسانوں کا فنی تقابل' کے مطالعے کا موقعہ ملا۔ اس مطالعے کے دوران علم ہوا کہ پرویز شہریار صرف ایک افسانہ نگار نہیں ہیں بلکہ افسانہ شناس بھی ہیں۔ یہاں پرویز شہریار کی عصمت اور منٹو کے نسوانی کرداروں کے مطالعے پر میں اپنی گفتگو کو مرکوز کرنا چاہتا ہوں۔

اردو افسانے کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک ہی دور کے دو ایسے افسانہ نگار نظر آتے ہیں جنھوں نے سماج اور سماج کے ٹھیکیداروں کی پروا کیے بغیر بلا خوف ایسے موضوع پر افسانے لکھتے رہے جن کا مطالعہ تو دوران کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بھی لوگ کتراتے تھے۔ یہ دو افسانہ نگار ہیں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی۔ ان دونوں افسانہ نگاروں نے عورتوں کے جنسی پہلو کو اپنا موضوع خاص بنایا ہے۔ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر متعدد افسانے لکھتے ہوئے بہت سے ایسے کردار تخلیق کیے جو نہ صرف ان کے افسانوں کے اہم کردار ہیں بلکہ اردو افسانے کے یادگار کرداروں میں شامل ہیں۔ منٹو کے کرداروں میں پیشہ ور طوائفیں اور ان کے دلال ہیں تو کچھ کردار ایسے بھی ہیں جو خود پیشہ نہیں کرتیں لیکن دوسروں سے کرواتی ہیں۔ ایسے کرداروں میں وہ بھی شامل ہیں جو کم سن اور نوجوان لڑکیوں کا خیال رکھتے ہوئے اسے کسی کے حوالے نہیں کرتیں۔ اسی طرح قاتل، جیب کترے، غنڈے یا دوسرے مجرم نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ یہ تمام بظاہر منفی کردار نظر آتے ہیں لیکن ان کے اندر مثبت قدریں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ اور افسانہ ختم ہونے پر احساس ہوتا ہے کہ ان گندگیوں میں بھی کیسے کیسے جواہر موجود ہیں۔ اسی طرح عصمت چغتائی کے افسانوں میں نسوانی کرداروں کو فوقیت حاصل ہے اور ان میں گھریلو خواتین مختلف صورتوں میں نظر آتی ہیں۔ کبھی ساس کی شکل میں تو کبھی نند اور بھاوج کے روپ میں، کبھی بہن اور ماں کی شکل میں تو کبھی نانی اور دادی کے روپ میں دکھائی دیتی ہیں۔ عصمت کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے بوڑھی سے لے کر بچی تک کے کرداروں کو اس طرح سے تراشا ہے کہ وہ درنایاب کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ ان کرداروں کو اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہوئے دونوں افسانہ نگاروں نے جس بے خوفی اور ہمت کا ثبوت پیش کیا ہے وہ دوسرے افسانہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتا۔ ان تمام گوشوں پر پرویز شہریار نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ منٹو اور عصمت کے افسانوں کے کردار کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''عصمت اور منٹو نے اپنے کرداروں کا بڑے بے خوف، بے باک اور نڈر ہو کر نتائج کی پرواہ کیے بغیر نفسیاتی تجزیہ پیش کیا۔ انھوں نے عموماً ایسے انسانوں کو اپنے افسانوں کا کردار بنایا، جنھیں سماج اکثر رد کر دیتا ہے۔ عصمت نے خاص طور سے عنفوان شباب کے دور سے گزرتی ہوئی دوشیزاؤں کی جنسی گھٹن اور نفسیاتی کشمکش کو اپنا موضوع بنایا ہے۔''

اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے منٹو کے کردار کے بارے میں وہ کہتے ہیں:

''کچھ ایسی ہی کیفیت منٹو کے کرداروں کی ہے۔ خاص طور سے جب وہ کسی بے راہ روی کی شکار نچلے طبقے کی سن بلوغ کو پہنچتی ہوئی لڑکی یا دوسرے الفاظ میں ویمپ یا طوائف کی زندگی کو منظر عام پر لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ منٹو نے زیادہ تر گھر سے باہر کی عورتوں خاص طور سے بازار کی عورتوں کی زندگی پر قلم اٹھایا ہے جب کہ عصمت نے گھر کی چار دیواری کے اندر کی پردہ نشیں عورتوں کی زندگی پر زیادہ لکھا ہے۔''

ان اقتباسات کا مطالعہ کرتے ہوئے پرویز شہریار کی فکشن شناسی کے ساتھ ساتھ منٹو اور عصمت کے کرداروں کی نفسیات کی شناخت اور ان کی پیش کش پر ناقد کی دسترس کا احساس ہوتا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ پرویز شہریار نے منٹو اور عصمت کے کرداروں کی شناخت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'منٹو نے زیادہ تر گھر

سے باہر کی عورتوں خاص طور سے بازار کی عورتوں کی زندگی پر قلم اٹھایا ہے تو عصمت نے گھر کی چار دیواری کے اندر کی پردہ نشیں عورتوں کی زندگی پر زیادہ لکھا ہے۔اس جانب اب تک اس انداز سے روشنی نہیں ڈالی گئی تھی۔

پرویز شہریار نے منٹو اور عصمت کے کرداروں کی شناخت کرتے ہوئے نہ صرف ان کا نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے بلکہ ان دونوں افسانہ نگاروں پر کس طرح کے فلسفہ اور نفسیات کے اثرات ہیں اس جانب بھی اشارے کیے ہیں۔ہم جانتے ہیں کہ منٹو اپنے افسانوں میں زندگی کے مختلف فلسفے کو پیش کیا ہے تو عصمت بھی اس سے عاری نہیں ہیں۔منٹو سیاہ تحت پر سفید چاک سے لکھتے ہیں تو عصمت بھی ان کے آس پاس ہی نظر آتی ہیں لیکن ان کا زاویہ قدرے مختلف ہے۔منٹو گھر کے باہر بازار اور اس کے خریدار پر نگاہ مرکوز رکھتے ہیں تو عصمت گھر کے اندر کی حرکات و سکنات پر بطور خاص نظر رکھتی ہیں۔دونوں ہی افسانہ نگار اپنے تجربات ومشاہدات کو فنی شکل میں جس انداز سے پیش کرتے ہیں یہ انھیں کا خاصہ ہے۔پرویز شہریار نے منٹو اور عصمت پر اثر انداز فلسفے کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''عصمت کے فن پر منٹو کی طرح او۔ ہنری اور موپاساں کے اثرات تو نہیں پڑے البتہ جہاں تک مغرب کے اثر کا تعلق ہے تو برناڈ شا کے فن کے ڈرامائی اثرات ان کے کرداروں پر ضرور مرتسم ہوئے ہیں۔ان کے ہر کردار ایک مسلسل حرکت اور عمل کے ذریعے اپنے پرپرزے نکالتے رہتے ہیں جن سے کردار کا ایک فطری ارتقا ہوتا رہتا اور اس کے شعور کے نہاں خانوں میں کلبلاتا ہوا ضدی ،شریر اور چنچل بچہ نمایاں ہو جاتا ہے۔مثلاً افسانہ 'ساس' کی کھلنڈری سی بہو ہر دم اچھل کود کرتی رہتی ہے۔ساس اگر ڈانٹ رہی ہے تو وہ کھڑی پنجرے میں طوطے کو پنکھے کی تیلیوں سے چھیڑتی رہتی ہے۔گھر کے کام کاج کے دوران بھی وہ شوہر سے چھیڑ چھیڑ کرتی رہتی ہے۔کبھی اس کے چونٹی کاٹ لیتی ہے۔کبھی آم کی گٹھلی چوس رہی ہے۔کبھی محلے بھر کے بچوں کے ساتھ کود کڑے کر رہی ہے۔غرض یہ کہ ڈرامے میں جس طرح حرکت (Movement) اور عمل (Action) کے ذریعے سیرت کو روشنی میں لایا جاتا ہے۔اسی طرح عصمت کے یہ کردار بھی حرکت وعمل کے ذریعے اپنے اوصاف ظاہر کرتے ہیں۔''

یہاں پرویز شہریار نے او۔ ہنری اور موپاساں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کردار نگاری اور ان کے اندر موجود حرکات وسکنات کی نشاندہی کی ہے تو عصمت کے فن کو اجاگر کرتے ہوئے کردار نگاری کے ایک نئے گوشے اور اس کی منفرد خوبی پر روشنی ڈالی ہے۔اسی طرح انھوں نے منٹو کے کئی اہم کرداروں کی نفسیات اور ان کے فنی محاسن کو دلائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ افسانے میں کردار کے تمام پہلوؤں کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔اشارے کنایے میں کرداروں کی خوبیوں اور انفرادیت کو پیش کیا جاتا ہے۔لیکن منٹو اور عصمت کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ افسانے کا تانا بانا اس طرح تیار کرتے ہیں کہ کردار کی خوبیاں اور خامیاں بتدریج سامنے آتی جاتی ہیں۔ان کے اکثر کردار افسانے کے قارئین کے ذہن میں داخل ہو کر ان کے حافظے کا ایسا اٹوٹ حصہ بن جاتے ہیں کہ پھر وہ کبھی محو نہیں ہوتے۔اس جانب اشارہ کرتے ہوئے پرویز شہریار لکھتے ہیں:

''اگرچہ افسانوں میں کردار کا بھرپور ارتقا دکھانا مشکل ہوتا ہے۔پھر بھی عصمت اور منٹو جیسے فنکاروں نے اپنے مشاہدے کی باریک بینی اور فنی چابکدستی سے ثابت کر دیا ہے کہ فنکار کا تخیل چاہے تو قطرہ میں دجلہ اور جز میں کل کے نظارے بھی بڑی کامیابی سے پیش کر سکتا ہے۔شرط یہ ہے کہ فنکار کو اپنے کرداروں کے ذہنی کوائف سے مانوس ہونا چاہیے۔''

یہ حقیقت ہے کہ جب افسانہ نگار اپنے کردار پر مکمل غور وخوض کے بعد اسے فن پارے کا حصہ بناتا ہے تو وہ نہ صرف منفرد ہوتے ہیں بلکہ یادگار کرداروں میں شامل ہو جاتے ہیں۔یادگار کردار ہونے کے لیے ضروری نہیں کہ وہ سادگی سے پر ہو بلکہ پیچیدہ کردار بھی یادگار کرداروں کی فہرست میں شامل ہو سکتے ہیں۔اس کی عمدہ مثال عصمت اور منٹو کے کردار ہیں۔عصمت کے زیادہ تر کردار سادہ ہیں تو منٹو کے اکثر کردار پیچیدہ ہیں۔اس کے باوجود دونوں افسانہ نگاروں کے کردار اردو فکشن کے اہم کرداروں میں شامل ہیں۔اس کی نشاندہی کرتے ہوئے پرویز شہریار نے تفصیل سے لکھا ہے۔مثال کے طور پر ان کا یہ اقتباس دیکھیں:

''عصمت چغتائی کے بیشتر کردار سادہ اور نمائندہ ہوتے ہیں۔جب کہ منٹو کے بیشتر کردار پیچیدہ ہیں، وہ حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔منٹو کے کردار مثالی نہیں ہیں۔انھیں کسی بھی طرح قابل تقلید نہیں کہا جا سکتا ہے۔ان کے یہاں کردار کی پیشکش میں تنوع پایا جاتا ہے۔ان کے کرداروں میں صرف مزاج ہی کا فرق نہیں ہوتا بلکہ ماحول اور شخصیت کا بھی فرق ہے۔تمدن اور ذہنی سطح کا بھی فرق ہے۔منٹو کا قلم انھیں پورا انفرادی حسن اور نوک پلک بخشتا ہے۔وہ اپنی شخصیت کے تقاضے کے مطابق روبہ عمل ہوتے ہیں۔ان کے کردار زیادہ تر شہری ہیں۔سلطانہ انبالہ سے دلّی آئی ہے۔سردار بیگم لاہور کی 'پیداوار' ہے اور بمبئی میں رہتی ہے۔زینت، الماس اور اقبال کشمیر سے آ کر بمبئی اور لاہور کی رانی منڈی میں آباد ہیں۔کلونت کور پنجاب کی، شاردا جے پور کی اور کانتا منگلور کی رہنے والی ہیں۔یہ سب بڑے شہروں میں آباد ہیں۔ان کے مسائل بھی شہری زندگی کے مسائل ہیں۔''

اس اقتباس سے ایک جانب عصمت اور منٹو کے کرداروں کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری جانب پرویز شہریار کے عمیق اور بغور مطالعے کا علم ہوتا ہے۔آپ نے غور کیا کہ انھوں نے کس انداز سے منٹو کے مختلف شہری کرداروں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان کرداروں کے مختلف شہروں کے سفر اور ان کے قیام کے مقام کو پیش کیا ہے۔یہ حقیقت ہے کہ شہر میں رہنے والے لوگ گاؤں کے لوگوں سے مختلف ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں تو گھر کی چہار دیواری میں رہنے والی خواتین باہر رہنے والی عورتوں سے قدرے مختلف فکر رکھتی ہیں۔اس کی بہترین مثال عصمت اور منٹو کے افسانوں کے کردار اور اس کی نفسیات کے طور پر ہمیں مل جاتے ہیں۔پرویز شہریار نے ایسے کم وبیش تمام کرداروں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

عام طور پر سماج میں یہ مانا جاتا ہے کہ نیک آدمی ہی نیکی کی باتیں یا برتاؤ کرسکتا ہے اور بد سے اس کی امید نہیں کی جاتی۔ اس روش اور ذہنیت کی نفی عصمت اور منٹو کے کردار کرتے ہیں۔ عصمت نے مثبت کرداروں کو منفی انداز میں پیش کیا ہے منٹو نے منفی کرداروں کو مثبت کام کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ ان نکات کو پرویز شہریار کی زبان میں دیکھیں:

''عصمت نے سماج میں مثبت قدروں کے حامل سمجھے جانے والے کرداروں میں منفی پہلو تلاش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جب کہ منٹو نے منفی قدروں کے حامل نظر آنے والے کرداروں کے اندر مثبت پہلو دریافت کی ہے۔ ایسے کرداروں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔''

عصمت چغتائی شرفا کے درمیان ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مشاہدات و تجربات کو جس انداز میں پیش کرتی ہیں وہ ان کا حصہ ہے۔ خصوصاً نسوانی کردار کو جس انداز سے پیش کیا ہے وہ انفرادیت کا حامل ہے۔ پرویز شہریار کہتے ہیں کہ ''عصمت چغتائی اپنے نوجوان نسوانی کرداروں کی گھٹی گھٹی جنسی منسلکات کے بیان میں خود بھی بیچ بیچ میں کود پڑتی ہیں اور برجستہ و بے اختیار بولنے لگتی ہیں۔'' اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ عصمت خود اس سماج کا حصہ ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ عیب میں شامل ہے کہ تخلیق کار خود کردار میں شامل ہو کر اپنی بات بولنے لگے۔ ایسی غلطی منٹو نہیں کرتے۔ ہاں ان کو اگر محسوس ہوتا ہے تو خود کا کردار افسانے میں شامل کرتے ہیں اور پھر اپنی بات کہتے ہیں۔ اس جانب بھی پرویز شہریار نے اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''منٹو کے یہاں ہر کردار اپنی الگ شخصی پہچان رکھتا ہے۔ خود منٹو (افسانہ نگار) اور منٹو (کردار) میں بڑا فرق موجود ہوتا ہے۔'' مستحسن طریقہ بھی یہی ہے کہ افسانہ نگار اور کردار میں فرق ہونا چاہیے۔ جب کبھی افسانہ نگار اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے تو واحد متکلم کے طور پر خود کو افسانے میں شامل کر لیتا ہے اور منٹو نے اپنے کئی افسانوں میں یہ طریقہ اپنایا ہے۔

پرویز شہریار نے منٹو اور عصمت کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ایک اور اہم پہلو کی عکاسی کی ہے کہ منٹو اپنے کرداروں کے حلیے کے ساتھ ساتھ اس کے لباس کا بیان بھی کرتے ہیں جب کہ عصمت کے یہاں یہ مفقود ہے۔ اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

''منٹو اپنے نسوانی کرداروں کے لباس کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ کلونت کور قمیض پہنتی ہے۔ شاردا، سوگندھی اور شکنتلا دھوتی باندھتی ہیں۔ سلطانہ اور جانکی شلوار پہنتی ہیں اور موذیل ڈھیلا ڈھالا چغہ۔ منٹو کے برخلاف عصمت کے یہاں عمومی طور پر نسوانی کپڑوں کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں ہے اور نہ ہی کوئی تفصیل ملتی ہے۔ مگر جہاں کہیں ان کا تفصیلی بیان ہوا ہے وہاں عصمت نے منٹو کی طرح محض تذکرتا بیان نہیں کیا ہے بلکہ ان کے ذریعہ گہری معنویت پیدا کی ہے۔''

یہاں پرویز شہریار نے دونوں افسانہ نگاروں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے منٹو کے افسانوں کے کردار اور اس کے لباس کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف باریک بینی سے ان افسانوں کا مطالعہ کیا ہے بلکہ ان کرداروں کی نفسیات کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار کے مقاصد کو بھی سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہم سب واقف ہیں کہ انسان کے لباس اور اس کے زیب تن کرنے کے طریقے سے اس کی سماجی و تہذیبی حیثیت اور اس کے اقدار کا اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے خاندانی پس منظر سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کے کرداروں کی شناخت میں ان کے حرکات و سکنات سے ان کے پیشے کا اندازہ ہوتا ہے تو لباس اور اس کے پہننے کے طریقے سے ان کے خاندان اور رہن سہن کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح عصمت کے ان افسانوں کی خوبی زیادہ بہتر طور پر عیاں ہوتی ہے جس میں کرداروں کے لباس کا ذکر قدرے تفصیل سے ملتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ منٹو نے جو کچھ بیان کیا ہے براہ راست اور بے باکی سے کیا ہے جب کہ عصمت نے اکثر اشارے کنایے کا سہارا لیا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ منٹو کے کھلے پن میں جو پردہ ہے وہ عصمت کے پردے میں کھلا پن ہے۔ منٹو سب کچھ کہنے کے باوجود بہت سے نکات کو پردے میں رکھتا ہے اور وہ پردہ افسانہ ختم ہونے کے بعد اٹھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منٹو کے افسانے کا قاری افسانہ ختم ہونے کے بعد ایک بار پھر فلیش بیک میں جا کر ان واقعات و حادثات کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد ہی کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ گویا تیز دھوپ میں بھی سایے کا احساس کرتا ہے جب کہ عصمت کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ ان نکات کی جانب پرویز شہریار اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''منٹو کے یہاں ہر چیز دن کی تیز دھوپ کی طرح روشن ہے۔ منٹو حقیقت کو براہ راست بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی لاگ لپیٹ اور پردہ نہیں ہے لیکن عصمت کا فن اشاریت کا فن ہے۔ چاند کی پرکشش میٹھی روشنی اور مہیب اندھیروں کا فن ہے۔ عصمت نے اپنے فن کو فوٹو گرافی کے مترادف قرار دیا ہے لیکن 'بھول بھلیاں' میں یہ فوٹو گرافی روشنی سے زیادہ پرچھائیوں کا فن بن کر ابھری ہے۔ جہاں پرچھائیاں اجالوں سے زیادہ معصوم اور دلفریب نظر آتی ہیں۔ جب عصمت نے 'پردہ کے پیچھے' لکھا تو 'پردہ کے پیچھے' عصمت کے فن کا استعارہ بن گیا۔ اشاریت نے ان کے افسانوں کو ایک منفرد شناخت بخشی۔ اس کے بعد سے عصمت نے واقعات کے ساتھ کرداروں کے مظاہر کو بھی اشاروں اور کنایوں میں بیان کرنا شروع کر دیا (منٹو نے ان مظاہر کو خوبصورت استعاروں اور تشبیہوں میں بیان کیا ہے)۔''

منٹو کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نسوانی کرداروں میں اکثریت گھر کے باہر کی عورتوں کے کردار ہیں۔ ان میں بھی بازاری عورتوں کو فوقیت حاصل ہے۔ ان کرداروں پر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منٹو کو ان عورتوں کے سلوک اور اطوار سے بخوبی واقفیت ہے۔ اس کے برخلاف عصمت کے یہاں جو گھریلو عورتوں کے کردار ہیں ان کی نفسیات کا تو علم ہوتا ہے لیکن عادات و اطوار پر کم کم روشنی پڑتی ہے۔ اس حوالے سے پرویز شہریار کا مطالعہ اور اس کی مثالیں دیکھیں:

''منٹو کی فنکاری کا میدان گھر سے باہر کی عورتوں کی کردار نگاری ہے۔

خاص طور سے بازاری عورتوں کے سلوک اور اطوار (Behaviour) سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ اس کی مثالیں شاردا، کانتا، شکنتلا، سوگندھی، سلطانہ، موذیل، جانکی، ممی، الماس، اقبال، پیرن، زینت، سردار بیگم، نواب، ہلاکت، کلونت کور، 'سوکینڈل پاور کا بلب' کی طوائف اور 'ڈرپوک' کی ویشیائیں ہیں حتیٰ کہ 'بُو' کی گھاٹن لڑکی 'فرسٹ کلاس مجسٹریٹ' کی گریجویٹ بیٹی اور 'مصری کی ڈلی' کی کشمیری چرواہن بھی گھر سے باہر کی یعنی غیر پردہ نشیں عورتیں ہیں۔ ان کی کردار نگاری میں منٹو کو قدرت حاصل ہے۔ وہ پوری معروضیت کے ساتھ اور مکمل غیر جانبداری سے ان کی زندگی کو من وعن پیش کر دیتے ہیں۔ انھیں ایسی عورتوں کی مجبوریوں اور بے بسی سے ہمدردی ہے۔

اس کے برعکس منٹو کے یہاں جب کبھی گھر کے اندر کی پردہ میں رہنے والی عورتوں کا ذکر آتا ہے تو وہ 'باسط' کی بیوی اور 'ٹوٹو' کے میاں بیوی جیسے پھسپھسے کردار پیش کرتے ہیں کیونکہ وہ نہیں جانتے ہیں کہ ان گھروں کے اندر بچھو پھوپھی، منھی کی نانی، ساس، بہو بیٹیاں، چھوٹی آپا اور 'جڑیں' کی اماں اور 'لحاف' کی بیگم جان جیسا کردار بھی اپنی دنیا آپ پیدا کر کے زندہ رہتا ہے۔ 'جیتا ہے اور خوب جیتا ہے۔'

اس کے برعکس عصمت کو ہر عمر کی پردہ نشیں خواتین کی اندرونی زندگی کے پیش کش میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ یہی ان کے فنکاری کا اصل میدان ہے۔''

آپ نے دیکھا کہ منٹو اور عصمت کے کردار اور ان کی نفسیات پر پرویز شہریار کی کس طرح کی نظر ہے۔ دونوں ہی افسانہ نگاروں نے جنسی مسائل کو موضوع بناتے ہوئے منفرد انداز میں کرداروں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ عصمت چغتائی نے گھر کے اندر کی خواتین کے جنسی مسائل کو فنکاری سے پیش کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم جنس پرستی (Lesbianism) پر عصمت سے پہلے اس انداز سے کسی اور نے نہیں لکھا ہے تو بہت سے اندرون خانہ کے ایسے مسائل کو انھوں نے طشت از بام کیا ہے جس کے بارے میں باتیں کرنا بھی اس وقت تک معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ان کرداروں کی پیش کش کو دیکھتے ہیں تو کہیں بھی غیر فطری ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ کردار اپنی فکر اور اطوار کا حامی دکھائی دیتا ہے۔ پرویز شہریار نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے مثالوں کے ساتھ اپنا مطالعہ پیش کیا ہے:

''عصمت کے کردار بالکل فطری ہیں۔ ان کے عمل اور ردعمل پر ان کے اپنے ماحول کے اثرات موجود ہیں۔ بیگم جان کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی ہیں اور نہ ہی کسی نوکر چاکر سے ناجائز تعلق قائم کرتی ہیں، لیکن پردہ کے اندر اور بند کمروں میں وہ دنیا بھر کے غنڈوں کی سی دہشت مچاتی پھرتی ہیں۔ ان کی اپنی الگ دنیا ہوتی ہے جہاں بلا ناغہ دہشت گردی کے باوجود وہ کچی امولیاں تک کی بھیج کر چٹنی بنانے سے باز نہیں آتیں۔''

پرویز شہریار نے منٹو اور عصمت کے نسوانی کرداروں کا مطالعہ کرتے ہوئے نہ صرف ان افسانہ نگاروں کی نفسیات کو پیش کیا ہے بلکہ ان کے پیش کردہ کرداروں کی نفسیات اور انفرادیت بھی نمایاں ہوتی ہیں۔ انھوں نے کردار کی مناسبت سے ان کی زبان کا انتخاب کرتے ہوئے اسے نہایت فنکاری سے پیش کیا ہے۔ عصمت کو اندرون خانہ خواتین کی زبان پر دسترس حاصل ہے تو منٹو کو گھر کے باہر خصوصاً بازار کی خواتین کی زبان پر مہارت ہے۔ منٹو کے کردار شہری ہیں اور ان کا تعلق مختلف شہروں سے ہے۔ اس مناسبت سے ان کرداروں کی زبان پر غور کرتے ہیں تو وہ مختلف نظر آتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ منٹو کو مختلف شہروں کی زبان کا نہ صرف علم تھا بلکہ اسے کردار کی زبان بنانے پر دسترس حاصل تھی۔ اسی طرح عصمت نے گھر کے اندر رہنے والے مختلف طبقات اور پیشہ کے کرداروں کو مختلف زبان عطا کیا ہے۔ ان نکات پر روشنی ڈالتے ہوئے پرویز شہریاران دونوں افسانہ نگاروں کی کردار نگاری کا تقابل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''منٹو اور عصمت کی کردار نگاری کا فرق، دراصل، ان کے زاویہ نگاہ کا فرق ہے۔ منٹو نے مرد کی حیثیت سے نسوانی کرداروں کو پیش کیا ہے۔ لہٰذا، ان میں نرینہ لمس (Male-touch) کی صلابت موجود ہے۔ جب کہ عصمت نے عورت ہونے کے ناطے ان تجربات، احساسات اور جذبات کی عکاسی کی ہے۔ لہٰذا، ان پر ایک نسائی لمس (Female-touch) نمایاں ہے۔ ان کی اپنی نسائی حسیت نے ان میں نزاکت، لطافت، نرمی اور سبک روی پیدا کر دی ہے — یہی بنیادی فرق ہے، جو منٹو اور عصمت کے نسوانی کرداروں کی تمام تر مماثلت کے باوجود، اپنی جگہ قائم ہے۔''

یہ حقیقت ہے کہ منٹو اور عصمت نے نسوانی کرداروں کو پیش کرتے ہوئے مختلف انداز فکر سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ منٹو نے مرد ہونے کے باوجود خواتین کے کردار کو جس انداز سے پیش کیا ہے، عصمت اس سے مختلف انداز اختیار کرتے ہوئے خاتون خانہ کو انفرادیت کے ساتھ سامنے لاتی ہیں۔ منٹو کے پیش کردہ اُن کرداروں پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کردار اپنے زمانے کے طور طریقے سے بے زار نظر آتے ہیں۔ ان کے اندر اپنے دور کے موجودہ نظام اور اس کے رویے سے بے چینی اور انحراف کرنے کا رویہ دکھائی دیتا ہے۔ خواہ وہ اندرون خانہ ہو یا بیرون خانہ یا بازار ہی کیوں نہ ہو، وہ بغاوت کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ منٹو کے کردار انتہا پسندی تک اختیار کرنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ اس کے برعکس، عصمت کے کردار ایک خاص مقام تک اپنی آواز پہنچانے کے بعد خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ شاید اس کی وجہ درون خانہ ہونا ہو۔ اور بعض اوقات تو عصمت کے کردار اکہرے نظر آتے ہیں یعنی وہ جیسے شروع میں ہوتے ہیں ویسے ہی آخر تک رہتے ہیں۔ جب کہ منٹو کے کردار شروع میں جیسے ہوتے ہیں افسانہ کے خاتمے پر ان میں تبدیلی آچکی ہوتی ہے۔ اس حوالے سے بھی پرویز شہریار نے غور و فکر کے بعد جن الفاظ میں اپنی فکر کو پیش کیا ہے، آپ بھی دیکھیں:

''ہم عصمت کے کردار سے شروع میں جن ذاتی اور شخصی خصوصیات کے ساتھ متعارف ہوتے ہیں۔ وہ اُن ہی خصوصیات کے ساتھ آخر تک قائم رہتے ہیں، ان میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔ خصوصاً نسوانی کرداروں کی سیمابی کیفیت، بانکپن اور تڑپ آخر تک قائم رہتی ہے۔ لیکن منٹو کے نسوانی کرداروں

میں ان کے شخصی کوائف یکا یک جُل دے جاتے ہیں۔ان سے تعارف کے وقت جو رائے قائم ہوتی ہے، وہ آخر میں ایک جھٹکے کے ساتھ پاش پاش ہوجاتی ہے۔ ان کے کردار بے چین اور بے کل ہیں، ہمیشہ ایک حال میں نہیں رہتے۔موذیل، ممی، جانکی، سوگندھی ان سبھوں کے کردار میں بنیادی تبدیلی کے ذریعہ ارتقا عمل میں آتا ہے اور ہمارے قائم شدہ تصورات یک لخت بدل جاتے ہیں۔''

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ پرویز شہریار نے منٹو اور عصمت کے کرداروں پر گفتگو کرتے ہوئے کن نکات کو ملحوظ رکھا ہے۔وہ افسانہ نگار اور شاعر ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک جانب کردار کی ساخت پر ان کی نظر ہوتی ہے تو دوسری جانب اس کی جزیات اور رویے ان کے پیش نظر رہتے ہیں۔اپنے مطالعے کے دوران وہ کردار کو اس کے ارتقائی مراحل سے گزرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں اور پھر اس کی جسامت، لباس اور بول چال پر غور وخوض کرنے کے بعد اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے مطالعے سے گزرنے کے بعد منٹو اور عصمت کا کردار جس صورت میں نظر آتا ہے، اس سے پہلے اس جانب کم کم ہی توجہ دی گئی ہے۔اس سے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ پرویز شہریار نے صرف منٹو اور عصمت کے افسانوں کا ہی مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ داستانوی ادب پر بھی ان کی نظر ہے۔تبھی تو اپنی کتاب 'منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور' کا خاتمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''منٹو اور عصمت کے یہاں عورت کا تصور داستانوی ادب کی طرح ساوی اور رومانوی ادب کی طرح نوری محض نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں عورت اپنی زمین کی خوشبو سے عبارت ہوتی ہے۔زندگی کی کھردری سچائیوں کا سامنا کرتی ہے۔ان کے یہاں حال سے فرار اور ماضی میں پناہ لینے کی خو نہیں ملتی ہے، بلکہ حالات کے تحت وہ بدلتی ہے۔اس کا اپنا مکمل اور انفرادی وجود ہوتا ہے۔حالات کے نشیب وفراز سے گزرنے کے باوجود اس کا عورت پن اپنی فطری ماہیت کے ساتھ کہیں نہ کہیں برقرار رہتا ہے۔''

پرویز شہریار کی منٹو اور عصمت شناسی پر اپنی گفتگو کو سمیٹتے ہوئے اگر یہ کہوں کہ انھوں نے ان دونوں افسانہ نگاروں کے افسانے کے مطالعے کے بعد ان کے اہم کرداروں کی جو شبیہ پیش کی ہے، وہ نہ صرف نیا ہے بلکہ انفرادی ہے۔ان کے اس مطالعے کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ انھوں نے کرداروں کے نفسیات واطوار پر خاص توجہ دی ہے تو یہ نشاندہی بھی کی ہے کہ عصمت کے اہم کردار درون خانہ سرگرم عمل ہیں تو منٹو کے کردار گھر سے باہر اور بازاروں میں رچتے بستے ہیں۔پرویز شہریار نے ان دونوں افسانہ نگاروں کے نسوانی کرداروں پر گفتگو کرتے ہوئے ان کے لباس اور اس لباس کی مدد سے کرداروں کی شناخت اور حرکات وسکنات میں ملنے والی سہولت کی بھی نشاندہی کی ہے۔انھوں نے بتایا ہے کہ منٹو نے کرداروں کے لباس کا زیادہ فنکارانہ ذکر کیا ہے جس سے عصمت کے افسانے عاری نظر آتے ہیں۔اسی طرح ان نسوانی کرداروں کی ذہنی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک جیتے جاگتے اور سانس لیتے ہوئے انسانی خصوصیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔کردار کی ذہنی کیفیت کا اظہار ان کی زبان سے بھی ہوتا ہے کیوں کہ دونوں ہی افسانہ نگاروں کو زبان کے استعمال پر کمال حاصل ہے۔عصمت درون خانہ کی زبان کا استعمال نہایت فنکاری سے کرتی ہیں تو منٹو بازار اور مختلف شہروں میں رہنے والے کرداروں کی مختلف زبان کو نہایت کامیابی سے پیش کرتے ہیں۔منٹو کے کئی کردار ایسے ہیں جو خود ایک شہر سے دوسرے شہر کا سفر کرتے ہیں ایسے میں ان کی زبان پر ان شہروں کے اثرات کا دکھائی دینا فطری ہے اور ایسے کرداروں کو اس طرح کی زبان میں پیش کرنے میں منٹو کامیاب ہیں۔ان تمام گوشوں پر پرویز شہریار نے نہ صرف روشنی ڈالی ہے بلکہ دلائل کے ساتھ ان کرداروں سے متعلق نئے گوشوں کی نشاندہی کی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پرویز شہریار فکشن اور اس کی تنقید پر نہ صرف نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کا مطالعہ کرنے کے بعد جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ اس صنف ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

۔ افسانوں کی للکار ۔

پرویز شہریار کے افسانے یوں تو سماج میں پھیلی منافرت، تشدد، مذہبی جنون، صنف نازک پر مظالم وغیرہ کا بڑی خوبی سے احاطہ کرتے ہیں۔میں نے اپنی فطرت اور ذاتی دلچسپی کے مدِ نظر محبت پر لکھے گئے، ان کے چند افسانوں پر اپنی ناقص رائے دینے کی کوشش کی ہے۔پرویز شہریار دور حاضر کے نوجوان افسانہ نگار ہیں۔تقریباً تین دہائیوں پر محیط ان کا افسانوی سفر قاری کو سماجی فلاح وبہبود کی طرف مائل کرتا دکھائی دیتا ہے۔لو اِن رِلیشن سے پرے، 'شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں'، 'اسکاؤٹ گرل' یہ تین افسانے میرے دل ودماغ پر اپنا گہرا اثر مرتب کر گئے۔تینوں افسانے میں نے وقفہ وقفہ سے پڑھے لیکن کہیں نہ کہیں میں ان کرداروں سے اپنے کو بندھا ہوا محسوس کرتی رہی۔مرد ہو کر ڈاکٹر پرویز اپنی ذہنی پرواز کی اونچائیوں میں کس طرح عورت کے ممتا اور شفقت کے بے پناہ جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔یہ میرے لئے متحیر کن امر ہے۔بحیثیت خاتون افسانہ نگار میں نے اکثر وبیش تر ایسا پایا کہ مرد افسانہ نگار عورت کی بے کراں محبت کا بیان اس قدر گہرائی سے نہیں کر پاتے، جس طرح عورت اپنے افسانوں میں کر لیتی ہے کیونکہ وہ تمام احساسات وجذبات ہم خواتین جیتی ہیں۔ جب کہ مرد کو ان باریک اور گہرے احساسات کے لئے حد درجہ مشاہدہ وباریک بینی درکار ہوتی ہے۔اور یہی اہم نکتہ ڈاکٹر پرویز کو ممتاز افسانہ نگار بناتا ہے۔ موجودہ حالات میں انسانی اخوت وبھائی چارے سے کافی دور نکلتے جارہے معاشرے میں باہمی رشتوں کے بکھراؤ اور تہذیبی قدروں کی پامالی کے تحفظ کے لئے یقینی طور پر پرویز شہریار کے افسانے ایک مثبت مستحکم کوشش ہے لیکن ابھی بہت دور تک انھیں اپنے افسانوں کی للکار کو پہنچانا ہے۔

۔ ڈاکٹر رخشندہ روحی مہدی

گمشدہ آدمیت کی متلاشی نظمیں

ڈاکٹر سعادت سعید
(لاہور)

پرویز شہریار نے تحقیق، تنقید، افسانہ نگاری اور شاعری کے میدانوں میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ انہوں نے ترسیل وابلاغ کے معاملات سے گہری دلچسپی لیتے ہوئے صاف، سادہ اور شستہ اردو میں اپنے دل کی باتیں کیں ہیں۔ شاعری اور افسانہ نگاری میں ان کی پرکار سادہ بیانیوں کے اندر سے علامتوں کے اکھوے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ شہری زندگی کی عصری قباحتوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ انہوں نے اپنے تخلیقی ویژن کی روشنی میں بڑے شہروں پر اثر انداز ہونے والے معاشی، ثقافتی، سماجی اور نو آبادیاتی رویوں کو جا بجا نشانہ تنقید بنایا ہے۔ ان کے متون کو مابعد جدید متون کے دوائر میں رکھ کر پرکھنے سے ہمارے عصری مقامی اور عالمی ماحول کا کریہہ المنظر ننگا پن سامنے آتا ہے۔ انسان نے انسان کو جس طرح نئی طرز کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے اس کی کئی شکلیں پرویز شہریار کے تخلیقی متون میں نظر اسکتی ہیں۔

سرمایہ دار آقاؤں کو
مزدور اور کسان سے ڈر لگتا ہے،
اسی طرح ستہ کا سکھ بھوگ رہی
سیاسی جماعتوں کو بھی
جمہوریت میں
بھوکے ننگے کروڑوں نوجوان سے ڈر لگتا ہے
حد تو ہے کہ
اب، وقت ایسا گراں ایا ہے
سنسان سے اور نہ بیابان سے ڈر لگتا ہے
بلکہ
دن دھاڑے
بھیڑ میں چلتے ہوئے انسان کو
(انسان سے ڈر لگتا ہے) (کیوں ڈر لگتا ہے)

صباح الدین عبد الرحمٰن کہ جنہوں نے ۱۹۸۵ء میں ایوان غالب میں ''غالب، ذوق اور ظفر'' سیمینار کے دوران منعقد ہونے والی ایک ادبی تقریب کی صدارت کی تھی اور مجھے اپنی طویل نظم ''فنون آشوب'' کا ایک اقتباس پڑھنے پر انہوں نے علمی سطح پر داد دی تھی اور کہا تھا کہ میری کتاب ''ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے'' میں موجود ثقافتی سپرٹ اسی صورت آگے بڑھ سکتی ہے کہ شاعر اپنی تہذیب اور ثقافت سے نابلد نہ رہے۔ اردو زبان کی نمایاں لفظیات ہندوستان کے سنہری زمانوں کی تہذیب وتمدن کے آثار سمیٹے ہوئے ہے۔ معاصر دہر پرستانہ دور میں اس تہذیب کی یاد اور اس پر عمل خاصہ مشکل نظر آتا ہے کہ جس میں مسجدوں کے صحنوں کی سی کشادہ دینی تھی، جسم وروح کی طہارت اور پاکیزگی کا پورا پورا خیال رکھا جاتا تھا، سچائی اور صداقت کو انسانیت کا معیار سمجھا جاتا تھا، لوگ صوفی سنتوں کے بتائے ہوئے انسانی رستوں پر چلا کرتے تھے۔ صباح الدین عبد الرحمٰن نے جس دور کے تمدنی جلووں کی بات کی ہے اس میں بادشاہ صوفیوں اور قلندروں سے گہری نسبتیں رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ''اللہ اکبر'' کے معنی کیا تھے اور وہ اس پر کتنا عمل کرتے تھے سرِ دست اس سے غرض نہیں ہے لیکن یہ بات ضرور سامنے رکھنی چاہیے کہ اس دو لفظی مرکب کو جہاں کسی کی توصیف کے سلسلے میں بولا جاتا ہے وہاں اس کو مشعل راہ بنا کر دنیاوی فرعونوں، شدادوں اور نمرودوں کا سر بھی جھکایا جا سکتا تھا۔ یہ الفاظ جابر سلطان کے سامنے اظہار حق کے ضمن میں بھی مدد ومعاون تھے۔

دنیاوی طاقتیں سامراجی سربراہ، راجے، ملوک، بادشاہ، آمر، جاگیر دار اور سرمایہ دار سب کے سب جھوٹے خدا بن کر عامتہ الناس پر ظلم وجبر کے سلسلے روا رکھتے ہیں ان کے خلاف اعلائے کلمتہ الحق وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جو ان فانی دہشت بازوں کو خدائی مخلوق قرار دے کر ان کے تکبر، غرور اور انانیت کو پرکاہ کی وقعت نہیں دیتے۔ وہ یہ کام ''اللہ اکبر'' کے الفاظ پر یقین رکھتے ہوئے کر گزرتے ہیں۔ تجارتی اور صارفی سماج میں کلیدی حوالہ جلب زر ہے۔ محبتوں اور عقیدتوں کو بھی منڈی نفسیات کی روشنی میں نئے انداز سے اپنایا جا رہا ہے۔ روحانیت، ایمان اور مقدس رنگ ونشاں سب کے سب کاروباری سلسلوں میں ڈھل گئے ہیں۔

عقیدت کے نام پر ہو رہا ہے کاروبار
سبز وسیاہ، سرخ وزعفران
چاند، ستارے، اوم اور کرپان
خدائی رشتوں کے علائم
روحانی رشتوں کے نشان
بن گئے ہیں سب دُکان (اللہ اکبر)

ان جنجالوں سے نجات پانے کے لیے اس رستے کا انتخاب لازمی ہے کہ جس پر چل کر انسان اپنی موت کو یاد کرتے ہوئے وحدتِ جمال خداوندی سے اپنا رشتہ جوڑ لے۔ اس کے نتیجے میں وہ کبر، طمع اور خوف کے رویوں کو ترک کر سکتا ہے۔ پرویز شہریار مولانا روم اور اقبال کے نقطہ نظر کی پیروی میں یہ سمجھتے ہیں کہ انسان اگر اپنے سینے میں روح مطلق کی روشنی کا سراغ لگا لے تو وہ صاحبِ کشف وکمال ہو کر موت کو مات دے سکتا ہے اور ''شہوت وخشم وطمع وغرور'' کے سرور ونشہ کو چھوڑ کر اپنے اندر کے انسان سے ہمکلام ہو سکتا ہے۔ یہ ہمکلامی اسے صوفی، ولی، غوث اور قطب کے درجے کی جستجو کی طرف مائل کر سکتی ہے۔ یہ اسے جیتے جی امر ہو جانے کی راہ پر لے آتی ہے۔ ''صوفی ہر دم مست قلندر'' تبھی ہوتا ہے جب وہ اللہ کو تہ دل سے اکبر مان کر ہر نوع کی فروشا فروشی سے کنارہ کشی کر لیتا ہے۔

رالف ایلی سن نے انویزیبل مین کے نام سے جو ناول لکھا ہے وہ اپنے سماجی اور ثقافتی حوالوں میں موجود خفیہ وارداتوں کا نقیب بھی ہے۔ اس خیال کے

ڈاندے کہیں ٹی ایس ایلیٹ کی نظم میکاویٹی دی مسٹری کیٹ سے بھی ملتے نظر آتے ہیں۔یعنی یہ بلی ہر جگہ موجود ہوتی ہے اور جب کوئی اسے پکڑنے کا قصد کرتا ہے تو وہ وہاں موجود نہیں ہوتی۔تاریخ کے بائیں یا دائیں ہاتھ کے پراسرار کرشمے اکیسویں صدی میں ویسے ہی موجود ہیں جیسے بیسویں صدی کی علمی دوغلاہٹ،فکری مغالطوں، سرمایہ دارانہ یدھوں، منڈی آفرینیوں، انسان کشیوں کے پس منظر میں موجود تھے۔کوئی بھی ایسی صورت حال کو دیکھ کر خدا کو پکارنے کی طرف ضرور متوجہ ہو گیا''مرے وجود کے بھیدوں کو جاننے والے۔۔۔مرے خدا مرے دل (مجید امجد)'' ابلیسی تماشے اگر جاری ہوں تو شاعر خدا سے کسی تدبیر کی بابت ضرور کچھ کہے گا۔

عہد حاضر میں سارتر کی وجودیت اور مارکس کی مارکسزم کے فکری افکار نے مادی اعتبار سے انسان کی انسانی بازیافت کے جن سلسلوں کی جانب اشارے کیے ہیں پرویز شہر یار کی نظم'' وجود کا چقماق'' میں ایک زاویے سے ان سے استفادے کا پیغام موجود ہے۔دشت جنوں،افکار کا ہجوم،زندگی کی سنگلاخی،الجھاتی دنیا، لامتناہی خیال نئے انسان کا گھیراؤ کر چکے ہیں۔ان کی وجہ سے اس کے اندر ایسے الاؤ بھڑک اٹھے ہیں کہ جن سے نجات پانا اس کے لیے ضروری ہو چکا ہے۔خارجی ماحول بھی ''تنفس میں آگ بھر رہے ہیں''۔شاعر کا خیال ہے کہ باہر کی آگ سے انسان شاید خود کو بچا بھی لے مگر اس کے اندر کی آگ زیادہ خطرناک ہے۔یہ آگ احساس کی آگ ہے۔شاعر کا احساس جو ہمہ وقت اس کے سینے کو آتشکدہ بنائے رکھتا ہے۔وجودی ضمیر اسے چین سے نہیں رہنے دیتا اور اسی طرح سے دنیا کے دکھ درد اس کے احساس پر کاری ضربیں لگاتے رہتے ہیں۔اگر شاعر کے اندر اس کے احساس کی موت واقع ہو جائے تو ہی وہ اس الاؤ سے بچ سکتا ہے۔

مجھے ڈر ہے کہ
سارا کا سارا جنگل
جل کے خاکستر ہو نہ جائے کہیں
باہر کی آگ سے تو بچا لوں گا خود کو مگر۔۔۔
خدشہ ہے
اپنے اندر کی آگ سے
نہ جل جاؤں کہیں
مانا کہ
دشمنوں کی یلغار سے
ضربِ کاری کھا کر بھی سنبھل جاؤں گا
لیکن۔۔۔
خودی کے اُس مقام پر آج میں کھڑا ہوں! شہر یار
زمانے کے تیر نظر سے گر بچ بھی گیا
اپنی شدتِ احساس سے
وجود کے چقماق سے
جل جاؤں گا!! (وجود کا چقماق)

پرویز شہر یار نے اپنے سماج اور دنیا میں انسانوں کو کسمپرسی کی حالتوں میں بھی دیکھا ہے''بھوک کی حمایت میں''،''بڑا شہر اور تنہا آدمی''،''یہ کون سا شہر ہے''،''فلسطینی بچے کا گیت''،''ایشیا جاگ ذرا''،''محنت کشوں کے نام''،''بزدل قوموں کیآقاؤں کے نام'' جیسی نظمیں تخلیق کر کے آج کے انسان کے بحران کو ایک باطنی طور پر حساس شاعر کی آنکھ سے دیکھا ہے۔وجود (مرد۔عورت) سے متعلقہ معاملات یا باطن شناسی کی جہت پرویز شہر یار کی نظموں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔''گم ہو گئی ہے کوئی شئے''،''تخلیق کا وہ لمحہ''،''بس اِک آخری سوال ہے''،''فقط ایک نقطہ''،''محبت کے اس بیکراں سفر میں''،''بنت حوا سے خطاب''،''حاصلِ سیرِ جہاں''،''وجود کا چقماق''،''خرد و جنوں کے درمیاں''،''تم نہیں سمجھو گی''،''جسم کے انڈیکس سے پرے''،''دو قدم'' کے عنوانات سے لکھی جانے والی نظمیں جہاں ایک سطح پر شاعر کی مشاہداتی بصیرت،فکری معنویت اور احساساتی آنچ کی نقیب ہیں وہاں ان میں اپنے عہد کی خبر گیری کا پہلو بھی نمایاں طور پر سامنے آیا ہے۔

پرویز شہر یار کی نظمیں معاصر دانش اور انسانی روح فرسائی کی متنوع جہتوں کو محیط ہیں۔وہ شاعری کو قافیہ پیمائی یا ردیف بندی کا مظہر نہیں سمجھتے۔اس چیخ کا نام جانتے ہیں جو انسان کو کسی نہ کسی طور بباطن منتشر کرتی ہے۔ہم نے جس دور میں آنکھیں کھولی ہیں اس کا عمومی وتیرہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے چشم بندی کا متقاضی ہے۔یہ طور شاعروں اور دانشوروں کو بھی ذات کے ڈربوں میں قید کیے ہوئے ہے یعنی کبوتر کو آنکھیں بند کرنے کی تلقین کی جا رہی ہے اور بلی کو جھپٹاؤ کا عندیہ دیا جا رہا ہے۔وہ شاعر جو ضمیر کی بار برداری کو ذات شناسی کا لازمہ سمجھ لیتے ہیں انہیں آنکھیں کھول کر موجود اور آتی مصیبتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ان پر ترقی پسندی کا لیبل چسپاں ہوتا ہے یا نہیں وہ ان معرفتی حربوں سے سروکار نہیں رکھتے۔تاہم ان کی مزاحمتی سائیکی انہیں روشن خیال انسان دوستی کا رستہ دکھاتی ہے۔پرویز شہر یار کے خیال میں دنیا انقلابی آدرشوں سے مربوط ہوتی چلی جا رہی ہے۔ایسے میں شاعری کو بھی اپنا مثبت کردار ادا کرنا ہے۔نئے دور انقلاب میں،''اگر طاؤسِ قلم کو ردیف اور قافیے کے گھنگروؤں سے نجات پا کر خیالات کی ترسیل کا کام کرنا ہے۔اپنی نظم''نظم اپنی خوبصورتی کا صلہ چاہتی ہے''میں انہوں نے دوٹوک انداز میں کہا ہے کہ شاعر کے باطن سے نظم ایسے نمودار ہوتی ہے جس طرح پتھروں کا سینہ چیر کر جھرنے پھوٹتے ہیں۔شاعری میں فکر اور جذبے کی آمیزش سے شاعر خود کو نئی دنیا سے ہمکنار کر سکتا ہے شاعر کے احساساتی بطون کے آتش کدے کے خیالات و جذبات اپنے اظہار کے لیے نئے رستے بنا لیتے ہیں۔شاعر کے اندر موجود لاواشعور کی تمام بندشوں کو توڑ سکتا ہے۔یہ طشت از بام ہو کے کہرام مچا سکتا ہے۔شاعر نظم کو اظہار پانے سے روک نہیں سکتا۔سماج کی پروردہ خیالات کی موجیں نظم کی صورت حصار ذات سے باہر آ کر آبِ رواں اور موجِ بلا ہو جاتی ہیں۔اسے چشمہ کو چک سے آبشار بن کر ابلاغ کے مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں۔

نظم تو سماج کی پروردہ ہے شروع سے ہی
سماج میں وہ اپنا مرتبہ چاہتی ہے

تن کے آہنی قفس میں بھلا
کب تک رہ سکتی ہے مقید
نظم تو حصارِ ذات سے کچھ سوا چاہتی ہے
نظم ایک آبِ رواں ہے
نظم ایک موجِ بلا ہے
چشمہ کو چک سے آبشار ہُوا چاہتی ہے
نظم اپنے ہونے کا سبب ہونے کی وجہ چاہتی ہے
نظم آپ تک پہنچنے کا
حوصلہ چاہتی ہے!
نظم اپنی خوبصورتی کا
صلہ چاہتی ہے!!

(نظم اپنی خوبصورتی کا صلہ چاہتی ہے)

شاعر کا آزاد شعور اس کی شاعری کو بحرِ بیکراں کی جانب لے جاتا ہے کہ بندگی میں بقول علامہ اقبال زندگی جوئے کم آب بن جاتی ہے۔ شاعر کی نوائے پریشان سوالجھنوں کی جمع پونجی ہوتی ہے۔ اگر ''شوریدہ سر'' شاعر قوم کے نوجوانوں یا دوسرے افراد کو جگانا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خیالی اور تصوراتی کوہ قافوں سے نکل کر زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے۔ اس کے سامنے کسانوں، مزدوروں، عام آدمیوں کے مسائل و معاملات رہیں۔ ''تغزل کے پنکھ لگا کے'' اُڑنے والے شاعر بقول پرویز شہر یار سماجی ذمّے داریوں سے نجات پالینا چاہتے ہیں اور انسانی رشتوں کے بندھنوں سے فرار اختیار کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

طاؤسِ قلم
ردیف اور کے گھنگرو پاؤں میں باندھ کے کاغذ کی بساط پر ناچنے سے
قاصر ہے، بحور و اوزان کے دائرہ در دائرہ حصار میں
اس کا دم گھٹتا ہے
طاؤسِ قلم
مرغِ بسمل کی طرح ناچنا چاہتا ہے، دیوانہ وار
آج تو اِس پر شیوا کے تانڈو کا آہنگ ہے طاری

(جاگو کسان جاگو)

شاعر بحور و اوزان کے حصاروں میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ پرویز شہر یار نے نثری نظم میں موجود اس غیر عروضی آہنگ کی آنچیں محسوس کی ہیں جس میں ''طاؤسِ قلم مرغِ بسمل کی طرح ناچنا چاہتا ہے، دیوانہ وار؛ شیوا کے تانڈو کا آہنگ لیے۔ ہندوستان کہ جو کسی زمانے میں ''سونے کی چڑیا'' اور ''کرشی پردھان'' علاقہ تھا عالمی سیاست کی گلوبل و پلیجی ریشہ دوانیوں کے مکروہ سلسلوں کی وجہ سے کساد بازاری کا شکار ہو چکا ہے اور اس میں عام آدمی معاشی مجبوریوں سے تنگ آ کر ''آتم ہتیہ'' کی راہ دیکھتے ہیں۔

انسان جب ہو
دانے دانے کو محتاج — ایک طرف
دوسری طرف
گوداموں میں سڑتے ہوں اناج
تو کوئی کیسے غزل لکھے
حق گوئی پر
جب کاٹ لی جاتی ہو زبان
فریاد رس
ہاتھوں کو جہاں جھکا دیا جاتا ہو
جب اپنے ہی ملک میں
ہم وطنوں سے ملتی ہوں پسپائیاں
جب انسان
نکسلائٹ اور خود کش بمبار
میں بدل جائے
ہائے!
صد افسوس اور ہائے

(تو کوئی کیسے غزل لکھے)

پرویز شہر یار کے شعری مجموعے کا جوہر اس بھوک کی عکاسی ہے کہ جسے شکم اور روح کی بھوک کہا جاتا ہے۔ بھوکے کسانوں اور مزدوروں کے لیے ماؤاسٹوں اور مارکسیوں کی تحریکیں عوام کے حوصلوں کی نقیب ہیں۔ ماضی میں مولانا بھاشانی اور چارو موجمدار جیسے قائدین نے عوام کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا چاہا۔ یہ سلسلہ برصغیر میں مختلف شکلوں میں آج بھی جاری و ساری ہے۔ عالمی گاؤں کی سیاستوں کے پرستار ہوس پرست سربراہانِ اقتدار عوام کی بھوک ننگ اور بے گھریوں میں اضافہ کرتے چلے جارہے ہیں۔ اب کسان اور مزدور کاخِ امرا کے در و دیوار ہلانے کا عندیہ دے رہے ہیں۔ ''بھوک کی حمایت میں'' کا عنوان پرویز شہر یار کے شعور کی درست سمتی کا نشان دہ ہے۔

گندم سے آسودہ ہوتے ہی آدمی
ناف کی نشیبی وادیوں میں
اتر جاتا ہے
محو سفر ہو جاتا ہے
تا کہ
دنیا کے سب سے اولیں انسانی جوڑے
آدم اور حوا سے
خود کو جوڑ سکے
سکوت موت کی علامت ہے اگر
تو اس علامت کو جامد ہونے سے بچائے

اس سکوت کو توڑ سکے
چشمِ حیواں میں غوطہ زن ہو جائے
بادبانِ کشتی نصب کرے
اپنی حمایت میں
ہوا کا رخ موڑ سکے

(بھوک کی حمایت میں)

علی سردار جعفری کی طرح انہیں بھی احساس ہے کہ ایشیا جاگ رہا ہے۔اس میں دورِ انقلاب کی آمد آمد ہے۔اس لیے ''سامنت وادوں اور جاگیرداروں'' کا دورِ زوال شروع ہونے کو ہے۔

ذرا سوچو!
سارا مغرب گلوبل وارمنگ کو رو رہا ہے
اِدھر پورا کا پورا ایشیا غفلت کی نیند سو رہا ہے
کبھی کبھی
میرے ذہن میں
یہ خیال آتا ہے کہ
ہمیں کچھ نہ کچھ اقدام کرنا ہوگا
ہمیں قبل از وقت انتظام کرنا ہوگا
ہاں! ایشیا کو ہی
بڑھ کر یہ کام کرنا ہوگا
تمام ذمہ داریوں کو اپنے نام کرنا ہوگا

(ایشیا جاگ ذرا)

پرویز شہریار کی نثری نظمیں اپنے اندر جس تازہ آہنگ کو لیے ہوئے ہیں اس پر عروضی اوزان کی تک بند شاعری قربان کی جا سکتی ہے۔پنگلی اور میٹری نظموں کو درست اوزانی نظمیں ماننے والے عروضیے بوجوہ اپنے ساتھیوں کی فنی تضحیک کرنے سے باز نہیں رہتے۔پرویز شہریار مجھ سے دلیر شاعر ہیں انہوں نے عروضی بکھیڑے کو یہ کہہ کر نظر انداز کیا کہ ''میں نے اپنی ادبی زندگی کے اوائل سے ہی یہ محسوس کیا کہ، آپ اپنی قوم کے نوجوانوں سے خطاب تب ہی کر پاتے ہیں جب آپ ان کی ذہنی سطح پر جا کر ان کی زبان میں اور ان ہی کے انداز سے گفتگو کرتے ہیں۔ہمیں اپنے قاری ہدف کے پسندیدہ اور دلچسپ اسلوب میں ابلاغ کے مؤثر وسائل اختیار کرنے پڑتے ہیں۔چنانچہ، میں نے نثری نظم کو اپنے وسیلۂ اظہار کے طور پر اختیار کیا اور میری اولیں نظمیں ۱۹۸۰ء میں کولکاتا سے 'اخبارِ مشرق' میں شائع ہوئیں، جن کے عنوانات تھے، 'آدم اور حوا'، 'انتظار کے دوش پر' اور 'سن با تھ' وغیرہ ایسی نظمیں تھیں جو میرے نوجوان ادیب دوستوں میں بہت پسند کی گئیں۔ میرے لیے یہ بہت ہی امید افزا اور حوصلہ افزا مرحلہ ثابت ہوا، جس کی روشنی نے میرے آگے کے سفر کو آسان کر دیا۔''

ہمارے اس ''جان محمد خان'' (نظم ساقی فاروقی) کا سفر اس لیے آسان رہا کہ انہوں نے عروضیوں کی دہشت گردی کو ٹھوکروں پہ رکھا۔

شجرِ ممنوعہ کا پھل دانستہ چکھنا فطرت آدم کا قرینہ ہے۔قوم کے نوجوانوں سے خطاب کیوں ضروری ہے؟ سرسید احمد خان اور علامہ اقبال نے یہ کام کیوں کیا۔تو اس کے پس منظر میں مغلوبیت اور غلامی کا سوال ایک جزو لازم کے طور پر موجود ہے۔انگریزی حاکموں نے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے تحت ہندوستان سے پیار کرنے والے تمام ادوار سے تعلق رکھنے والے مقامی باشندوں کو ایک ایسی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے کہ جس کے نتائج نسل کشیوں کے متقاضی ہیں۔انگریزوں کی آمد سے قبل بدھوں کی نسل کشیاں بھی آریائی بدھ بازوں کی نفسیات کی مظہر تھیں۔

پھر مسلمانوں کے اقتدار کی طوالت کے لیے بھی کبھی باہمی تو کبھی دوسروں کی نسل ماری کے سلسلے جاری رہے۔تاہم انگریزی اقتدار کے خاتمے کے لیے ہندوستان کے آزادی پسند باشندوں نے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں۔اندرونی غداروں کی بدولت وہ ہندوستان پر قابض ہو کر ملکہ وکٹوریہ کا علم بلند کر گئے۔یہاں سے ہندوستانی انسان کا زوال شروع ہوا اور یہ زوال طویل سے طویل تر اس لیے ہوتا جا رہا ہے کہ مقامی باشندے مذہبی بنیادوں پر ایک دوسرے سے بھڑ رہے ہیں اور مرنے مارنے کی حکمت عملیاں اپنائے ہوئے ہیں۔دراوڑ کہتے ہیں ہندوستان ان کا ہے۔آریائی کہتے ہیں ہندوستان ان کا ہے۔سامی و عجمی کہتے ہیں ہندوستان ان کا ہے۔عیسائی کہتے ہیں ہندوستان ان کا ہے۔سکھ کہتے ہیں ہندوستان ان کا ہے۔کوئی یہ کہنے کو تیار نہیں ہے کہ جن مقامی باشندوں نے ہندوستان میں رہتے ہوئے یک دیوتا ازم، ہندو ازم، جین ازم، بدھ ازم، اسلام، عیسائیت اور دیگر مذاہب قبول کیے ہیں ہندوستان پر ان سب کا حق ہے۔مذہب بدلنے سے مقامیت نہیں بدل سکتی۔اس لیے ہر مذہبی سیکٹر اپنی اپنی حفاظت کے لیے اپنے اپنے نوجوانوں کو تیار کرتے ہوئے ہندوستان کے باشندوں کی ایکتا پر کاری ضربیں لگاتا چلا جا رہا ہے۔یہ مقامی زوال کب تک چلے گا اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔علامہ اقبال نے اپنی مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام شرق'' میں ایک بند ''اشکے چند بر افتراق ہندیاں'' کے عنوان سے بھی لکھا ہے۔اس میں ہندوستان کے باشندوں کی ایکتا کی بات کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ رود گنگا اور دریائے اٹک سے تعلق رکھنے والے ہندوستانیوں کو باہمی اتحاد پیدا کر کے انگریزی سامراج کو دیس نکالا دینا چاہیے۔لیکن اس کے برعکس ہندوستانی باشندوں نے آپس میں نسل کشیاں شروع کر دیں اور ہٹلر زدہ انگریز بغیر کوئی جان گنوائے ہندوستان چھوڑ گیا۔ہندوستان کے باشندوں کے باہمی مناقشے ایک نیشنالسٹ ہونے کے ناتے قائداعظم جناح اور مہاتما گاندھی نے دور کرنے کی کوشش کی تاہم انگریزوں سے ملی ہوئی مقامی قیادتوں نے دونوں قائدین کے تصورات کو شدید زک پہنچائی۔ہندوستان کی ایکتا ایک خواب کی صورت تو سامنے ہے لیکن نسل کشیوں کی منطق کے سبب یہ خواب ڈریکولائی بن چکا ہے۔

پرویز شہریار ایسے میں اقبال کی طرح خاکم بدہن ''خدا سے شکوہ'' کرتے ہیں۔گردشِ ایام کا تجزیہ کرتے ہیں۔ناخدا کے نہ ہونے کی بات کی جانب اشارے

کرتے ہیں۔ بزدل قوموں کے آقاؤں پر استعاراتی اظہار کرتے ہیں۔انہیں سانپوں کی سرسراہٹیں اور سپیروں کی ریشہ دوانیاں نظر آتی ہیں۔صندل کی خوشبو اور سانپ کی بات سنانی پڑتی ہے۔راون کی تلمیح سے مقامی معنی خیزی کو متشکل کرنا پڑتا ہے۔

پرویز شہر یار کا مزاج تصوف کی فکریات سے گہرے طور پر مربوط ہے۔ان کے شعری مجموعے ''بھوک کی حمایت میں'' جابجا ان رویوں کا اظہار ہوا ہے کہ جو دنیا کو ایک صوفی کی آنکھ سے دیکھے بغیر وجود میں نہیں آ سکتے تھے۔خود شناسی، انسان بلندی، بھائی چارگی، محبت بندی، کشادہ مشربی، قدر تلاشی، توکل پسندی، خدا جوئی، مومن عقلی اور اسی نوع کے بہت سے دوسرے رویے اس مجموعے کی فکر سازی سے گہری نسبت رکھتے ہیں۔اس مجموعے کی ایک نظم ''ایک نظم امیر خسرو کے نام'' میں اس عظیم صوفی شاعر کی نرالی اور اعلیٰ شخصیت کو کھلے دل سے خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔اور کہا گیا ہے کہ انہوں نے ''بھکتی کی نئی راہ نکالی'' اور سماع محفل، دف، قوالی کے سلسلوں سے نسبت رکھی۔وہ حضرت نظام الدین اولیا کے مرید خاص ہیں۔ان کی وساطت سے لوگ ''درِ شیخ المشائخ میں جھولی'' پھیلاتے ہیں۔وہ شاعری اور موسیقی کے میدانوں میں بھی بلند مرتبے کے حامل ہیں:

راگ راگنی سب تیرے باندی
موسیقی، رقص سب تیرے غلام
کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں
تیرے آگے، سب مانگے پانی
(ایک نظم امیر خسرو کے نام)

حضرت نظام الدین اولیا (رح) سے ان کی محبت بے بدل تھی۔پرویز شہر یار نے اس طوطیِ ہند کو ''گنگا جمنی تہذیب کا امین'' اور ''ہندو مسلم ایکتا کا نقیب'' قرار دیتے ہوئے اردو زبان پر ان کے احسان کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔اسی طرح سے اس مجموعے کی ان عنوانات والی نظمیں ''نئی دنیا کی خواہش''، ''اچھا لگتا ہے''، ''یہ سفر جاری رہے''، ''تعاقب اپنے ہمزاد کا''، ''تشکیک''، ''مکان''، ''مٹی کی عورت''، ''قصہ تیری چاہت کا''، ''راجستھان کی ایک نظم''، ''ایک نظم گلزار کے نام''، ''عاقبت کا توشہ''، ''ایک نظم امیر خسرو کے نام''، ''نظم اپنی خوبصورتی کا صلہ چاہتی ہے''، ''خدایا! ایسی کوئی تدبیر کر''، ''گوا کے ساحل پر لیٹی ہوئی دوپہر''، ''اللہ اکبر''، ''ابلیس دور کھڑا تماشائی ہے'' اپنی فکری اپج اور احساساتی نزاکت کے اعتبار سے عصری شعور سے مزین شاعر کے دل کی آوازوں سے معمور ہیں۔پرویز شہر یار کی نظموں میں موجود تلمیحات اور اسطوریں اس امر کی غماز ہیں کہ وہ ایسے علاقے کی سائیکی کا اظہار کر رہی ہیں کہ جس میں کعبہ و دیر کے سلسلے اپنی اپنی جگہ پر فیض رسانیاں کر رہے ہیں۔البتہ یہ ضرور ہے کہ انہوں ترک اسلام کی ضرورت محسوس نہیں کی اور قشقہ کھینچنے اور دیر میں بیٹھنے کے میری حوالے کو شاعرانہ حوالہ سمجھ کر نظر انداز کیا ہے۔انہیں غالب کے اس شعر کی نزاکت کا علم ہے کہ:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود کعبے کی پشت پناہی سے انہوں نے سرمو انحراف نہیں کیا۔نیا کلیسائی تاجرانہ ذہن بھی انہیں متاثر نہیں کر پایا۔انہوں نے نو آبادیاتی معاشی استحصال اور اس استحصال کے شیرازہ بند علم پر مومنانہ علم اور صوفیانہ بصیرت کو فائق رکھا ہے۔وہ اپنی تہذیب اور ثقافت سے مکمل طور پر جڑے رہے ہیں۔اردو زبان کی رائج لفظیات کے استعمال کو احسن جانتے ہوئے دہر پرستانہ دور میں اپنی ان روایات کو یاد رکھا ہے کہ جو کشادہ ذہنی کی علمبردار ہیں۔ان کی شاعری میں جسم و روح کی طہارت اور پاکیزگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔پرویز شہر یار نے اپنی انسان دوستی کا معیار سچائی اور صداقت کے اظہار کو بنایا ہے۔

Sex Object

پرویز شہر یار کے افسانے کی عورت نہ جنسی شئے (Sex Object) ہے نہ ہی سامان تعیش (Luxury Item) ہے اور نہ ہی نظروں کو لبھانے والی Eye-candy جیسی نمائش کی کوئی چیز۔ان کے افسانے کی عورت آج کے نئے یگ کی ماڈرن اور الٹرا ماڈرن عورتیں ہیں۔یہ عورتیں گذشتہ صدی کے رومانوی تحریک کے زیر اثر تخلیق پانے والے فکشن کی عورتوں سے یکسر مختلف ہیں۔ان میں بھی چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش بدرجہ اتم موجود ہے۔تاہم اپنے مکمل وجود کے احساس کے ساتھ وہ سماج میں اپنے نام و ناموس کے تحفظ اور اپنے اصولوں سے سمجھوتہ کیے بغیر زندگی کرنا چاہتی ہیں۔وہ پریستانوں کی پریوں کی طرح سماوی فضا میں معلق رہنا نہیں چاہتیں۔بلکہ اپنے چاہنے والوں اور پرستاروں سے جنسی اختلاط بھی اپنی شرائط پر قائم کرنا چاہتی ہیں۔انھیں معلوم ہے کہ اس معاملے میں کس حد تک جانا چاہیے۔وہ اب موم کی مریم اور سلولائڈ کی گڑیا بنی رہنا نہیں چاہتی ہیں۔وہ جنسی معاملات میں بھی اپنی شرائط ہی پر حد قائم کرتی ہیں یا حد سے تجاوز کرتی ہیں۔وہ اپنی پسند اور ناپسند کی ترجیحات کی بنیاد پر ہی کی کسی بھی تفاعل پر آمادگی ظاہر کرتی ہیں۔اب وہ مجبور و مقہور محض بن کر اللہ میاں کی گائے بنے رہنا نہیں چاہتیں۔وہ گوشت پوست کے زندہ انسانوں کی طرح جینا جانتی ہیں۔ان کے بھی اپنے دکھ درد ہوتے ہیں۔اپنے احساس کی تمام تر گہرائیوں میں وہ ڈوب کر جینا چاہتی ہیں۔

۔ رضوان بن علاء الدین

ماورائے ازدواج رفاقتوں کا بیانیہ

حقانی القاسمی
(دہلی)

کائنات سب سے بڑی کہانی ہے جس کے کروڑوں کردار ہیں۔ جب اس کہانی کا کلائمکس ہوگا تو اس دن کائنات ارضی کے سارے کردار اپنے حقیقی چہرے اور اعمال نامے کے ساتھ نظر آئیں گے۔ ابھی تو کہانی کے زیادہ تر کردار اپنے مصنوعی چہروں اور اعمال ناموں کے ساتھ ہی نظر آتے ہیں۔ اسی لیے زیادہ تر کہانیاں حقیقت سے ماورا ہوتی ہیں اور ان میں حقیقت سے زیادہ تخیل کی آمیزش ہوتی ہے۔

کہانی ہر عہد میں اپنی شکل وصورت تبدیل کرتی رہتی ہے۔ الگ الگ تہذیب وتمدن، سیاست وثقافت اور معاشرت سے کہانی کو نئی نئی صورتیں ملتی رہتی ہیں۔ ہر ملک، قوم اور تہذیب کا اپنا ایک بیانیہ ہے۔ خود انسان ایک بیانیہ وجود ہے اور بیشتر کہانیاں اسی وجود کے اردگرد طواف کرتی ہیں اور انسانی وجود کے حرکات وسکنات کو کہانیوں کا محور ومرکز بناتی ہیں، ان میں سے کچھ کہانیاں اجتماعی شعور کا حصہ بن جاتی ہیں اور الگ الگ ملکوں اور تہذیبوں میں سفر کرتی رہتی ہیں۔ یہ کہانیاں کسی خاص ملک اور قوم سے مخصوص نہیں ہوتیں بلکہ مشترکہ انسانی جذبات واحساسات سے منسوب ہوجاتی ہیں۔ ان کہانیوں کی کوئی ایک مخصوص زبان نہیں ہوتی بلکہ یہ مختلف زبانوں کا سرمایہ بن جاتی ہیں۔ پرویز شہریار کی بھی کچھ کہانیاں ایسی ہیں جو ماورائے زمان ومکاں اپنی شناخت قائم کرنے کی قوت رکھتی ہیں۔ انھوں نے افسانوی آرٹ سے اپنی ایک پہچان بنائی ہے۔ انھوں نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ فرد اور اجتماع کی کشمکش پر، ملک اور معاشرے کی صورتِ حال پر، سماجی اور سیاسی بحران پر اور ان کے علاوہ دیگر ممکنہ موضوعات پر بھی ان کی کہانیاں مل جائیں گی کیوں کہ آج ہر موڑ پر ایک کہانی دست بستہ نظر آتی ہے اور ہر چہرہ کہانی کا ایک موضوع بن سکتا ہے مگر سارا مسئلہ اس چہرے کو کہانی میں بدلنے کا ہے۔ یہی وہ آرٹ ہے جو کسی بھی فن کار کو دوام اور انہدام کے مرحلے سے بھی گزارتا ہے۔ چہرہ اگر کہانی کے فریم ورک میں پوری طرح فٹ بیٹھ جاتا ہے تو کہانی امر ہوجاتی ہے ورنہ چند ساعتوں ہی میں کہانی دم توڑ دیتی ہے۔

پرویز شہریار کے تمام افسانوں کے بارے میں کوئی حتمی رائے تو نہیں دی جاسکتی تاہم ان کے کچھ افسانے ضرور ایسے ہیں جو لوحِ زندگی پر اپنا نقش ثبت کرنے میں ضرور کامیاب ہوجائیں گے۔ ان ہی میں ایک افسانہ ہے 'شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں' اور دوسرا 'لیو اِن ریلیشن سے پرے'۔ ان کے یہ دونوں افسانے موضوع اور ٹریٹمینٹ کے اعتبار سے کامیاب ہیں اور ان دونوں میں ان کی پوری تخلیقی ہنرمندی محسوس کی جاسکتی ہے۔

پہلا افسانہ ایک ایسے موضوع سے متعلق ہے جو دل چسپ بھی ہے اور تحیر خیز بھی اور یہ ایک نئے رشتے اور ایک نئی راہ سے بھی روشناس کراتا ہے، جو آج کی اصطلاح میں swinging کہلاتی ہے۔ آج کی ایک خطرناک معاشرتی حقیقت جو لذتیت کی وجہ سے بنیادی معصومیت کھوتی جارہی ہے اور یہ ایک ایسی خوف ناک تجرباتی پناہ گاہ ہے جہاں رشتوں کی ساری منطق تبدیل ہوجاتی ہے اور انسان ایک ایسی دنیا کا اسیر ہوجاتا ہے جہاں رشتے اپنی حقیقی معنویت کھو بیٹھتے ہیں اور یہ رشتہ منقولہ جائداد میں تبدیل ہوجاتا ہے اور اس پرانے تصور کی تجدید ہوجاتی ہے کہ عورت ایک جنسی معروض کے ساتھ ساتھ ایک منقولہ جائداد بھی ہے۔ ازدواج کی ادلا بدلی اور جنسی رشتوں کی تکثیر وتکسیر پر انگریزی میں بہت سی کہانیاں لکھی گئی ہیں مگر اردو میں اس بولڈ موضوع پر لکھنے کے لیے جرأتِ مردانہ اور جسارتِ رندانہ چاہیے۔ پرویز شہریار اس افسانے میں اسی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے ممنوعہ علاقے میں داخل ہوگئے ہیں اور ایک ایسے موضوع کو چھیڑ دیا ہے جو بہت ہی حساس اور خطرناک ہے۔ انگریزی میں اس موضوع پر بہت سے ناول لکھے گئے ہیں۔ جنھیں Erotica کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ J.W.Snootz نے Swinging in Paradise، کوپر ایس بیکٹ نے A Lifeless Monogamous اور ڈینس ایسٹرن نے Swing Land کے عنوان سے ناول لکھے ہیں اور جنسی نشاط کی کائنات کے سربستہ راز کو بے نقاب کیا ہے۔ اس طرح کے ناول سے بہت بڑی معاشرتی حقیقت سامنے آتی ہے اور پتا چلتا ہے کہ ہمارا معاشرہ اپنے محور ومرکز سے منحرف ہوتا جارہا ہے اور ایک ایسی ذہنیت تشکیل پارہی ہے جو ازدواجی نظام کے تقدس کو اپنی لذت کوشی کی خاطر مجروح کررہی ہے۔ 'شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں' اس جنسی کھیل کا پراثر بیانیہ ہے جو آج معاشرے کے ایک مخصوص حلقہ میں خفیہ طور سے کھیلا جارہا ہے مگر یہ کھیل اب لوگوں کی تجسس کا مرکز بنتا جارہا ہے۔ اس افسانے کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے۔

''اس نے کہا تھا کہ ازدواج کی عارضی ادلا بدلی سے فرسودہ رشتے میں نئی بہار آجاتی ہے جس سے رشتے کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور محبت کے بوسیدہ شجر پر نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔'' یہ جملہ قاری کے ذہن میں تجسس اور تحیر کی ایک کیفیت پیدا کرتا ہے اور قاری لاشعوری طور پر اس کہانی کی اگلی سطروں، جملوں، کرداروں سے جڑنا چاہتا ہے اور وہ کلائمکس جاننے کے لیے مضطرب ہواٹھتا ہے۔ یہی اضطرابی کیفیت کہانی کو آخر تک پڑھنے پر مجبور کردیتی ہے۔ قاری یہ سوچنے لگتا ہے کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے اور جب تک وہ اس کیفیت کے سحر میں رہتا ہے تب تک افسانہ کئی موڑ سے گزر جاتا ہے۔

پرویز شہریار کا یہ افسانہ ایسا ہے جس کی زبان موضوع سے بھی ہم آہنگ ہے۔ اس لیے موضوع اور زبان دونوں ہی قاری کو اپنی طرف کھینچتے ہیں اور موضوع اور زبان کی خوبصورت کیمسٹری یا انٹی میسی سے افسانہ بہت پراثر بن جاتا ہے۔ افسانہ کے درج ذیل اقتباسات سے اس کا اندازہ باآسانی لگایا جاسکتا ہے اور کرداروں کی ذہنی کیفیات، جذبات، احساسات سے بھی آشنائی کی ایک صورت نکل آتی ہے۔

(الف) شجرِ ممنوعہ کا سرسبز وشاداب نخلستان اور دور دور تک ریگستان کا لامتناہی گھپ اندھیرا۔ ہر درخت پر کوئی آدم زاد موجود تھا اور حوا کی بیٹیاں شجرِ ممنوعہ پر زبردستی چڑھائی جارہی تھیں۔

(ب) ہمیں غیر مرد کی آغوش میں خود سپردگی کے لیے خود ہمارے شوہر آمادہ کررہے تھے۔

(ج) ہمارے جنسی غدودوں میں اس قدر ہلچل مچی ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ پراکرتی اور پرش کے اس ملن نے فطرت کے کاموں میں دخل در معقولات کر کے جوالامکھی، طوفان اور سیلاب، تینوں کے گیٹ بہ یک وقت کھول دئے ہوں۔ ہم خش وخاشاک کی طرح جنسی ہیجان کے سیلِ رواں میں بہتے جارہے تھے۔

اس افسانہ کی راوی ایک خاتون ہے، پورا افسانہ ایک عورت کی زبانی ہے جو شجرِ ممنوعہ کے سارے زاویوں سے روشناس کراتی ہے اور اس کے محرک اور محرکات کو بھی بیان کرتی جاتی ہے کہ آخر شجرِ ممنوعہ کی چاہ نے کیسے جنم لیا اور اس عشرت گاہ میں داخل ہونے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ خاتون راوی یہ بتاتی ہے کہ اس کا شوہر شہوت پرست اور حسن کا پرستار تھا اور ازدواجی زندگی میں جب چنگاریاں سرد پڑنے لگیں تو اس نے ایک نئی پناہ گاہ تلاش کرلی اور اس کے لیے اس نے اپنے شریکِ سفر کو بھی تیار کرلیا۔ شوہر ذہنی طور پر اس شجرِ ممنوعہ کے لیے تیار ہونے کے لیے اپنی بیوی سے کہتا ہے:

''جانِ من میں ایک ایسی جگہ جانتا ہوں جہاں جانے سے ہماری ازدواجی زندگی کی خوشیاں پھر سے لوٹ آئیں گی۔''

اس جگہ پہنچنے کے بعد کیا ہوتا ہے وہ کافی تحیر خیز ہے اور یہیں سے دونوں کی زندگی ایک نئی شکل وصورت اختیار کرتی ہے۔ ایک کردار آباد ہوتا ہے تو دوسرا شریک کردار بربادی کے مرحلوں سے گزرتا ہے۔ ایک کردار کی زندگی جنت بن جاتی ہے تو دوسرے کردار کی زندگی جہنم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دراصل دو مربوط اور متواصل کرداروں کا افتراق اسی swapping سے شروع ہوتا ہے۔ دو کردار جو ایک دوسرے کی سانسوں میں شامل ہیں مگر لذت اور بوالہوسی کی خاطر یہ سانسیں اب دوسری، تیسری سانسوں کا سرگم بن جاتی ہیں اور پھر ان سانسوں کی تقلیب سے زندگی کا زاویہ بھی بدل جاتا ہے۔ گرم سانسوں سے جس خوب صورت زندگی کا آغاز ہوتا ہے وہ سرد آہوں میں بدل جاتی ہیں۔ ایک پراسرار جگہ زندگی کو پیچیدگیوں کے ایسے مرحلے تک پہنچادیتی ہے کہ جہاں افسوس اور آہ کے سوا کچھ بھی نہیں بچتا۔

پرویز شہریار کے اس افسانے کے دو کردار ہیں۔ ایک فاعل اور دوسرا مفعول، ایک متحرک اور دوسرا ساکت۔ اس میں فاعل کردار کی جو عکاسی کی گئی ہے وہ کردار عموماً ایسا ہی ہوتا ہے جو مردانہ اُپج اور جبلت سے میل کھاتا ہے یعنی ایک ایسا مردانہ کردار جو شہوانی خواہشات سے مغلوب ہے اور جو اپنے اندر کی گرمی دوسری عورتوں کے اندر جا کر ٹھنڈا کرنے کا عادی ہے اور جو الہڑ اور البیلی حسینہ کو اپنے پہلوؤں کو گرم کرنے کے لیے تلاش کرتا رہتا ہے۔ شہوت نے اس کی ذہنیت بھی بدل دی ہے، اس لیے اس کی زبان سے اس طرح کے جملے نکلتے ہیں۔

''آج جب میں چاہوں، حسین سے حسین دوشیزہ کو اپنے بستر کی زینت بنا سکتا ہوں۔ یہ سب میں نے اپنے عزیز ترین جذباتی رشتوں کو کھو کر حاصل کیا ہے۔ اس مشینی دور میں اپنے سچے اور معصوم جذبات کا اپنے ہاتھوں سے خون کیا ہے، یہ تم جانتی ہو، میں ایک مابعد جدید انسان ہوں۔ میں ان سب چیزوں سے کسی بھی قیمت پر تیاگ نہیں لے سکتا۔ میں سنیاسی بن کر جینا نہیں چاہتا۔ یہ زندگی صرف ایک بار ہی ملی ہے۔ لہٰذا میں اس سے لطف اٹھانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی جنسی زندگی کو تہہ دامن دبا کے مہاپرش اور مہاتما بننے کا آڈمبر نہیں رچ سکتا۔''

ان جملوں سے مرد کردار کی مکمل عکاسی ہو جاتی ہے اور اس کی ذہنیت کا بھی اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف ایک مفعول کردار ہے جو محبت، ممتا، ایثار اور اخلاص کا پیکر بن کر اپنی زندگی تباہ کرلیتی ہے کہ شاید یہی تباہی اس کی تقدیر میں ہے اور یہی اس کی جبلی تصویر بھی ہے۔ یہ مفعول کردار عورت کے سوا کون ہوسکتا ہے جو ہر زخم سہہ کر مسکراتا ہے اور دوسروں کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اپنی عزت وناموس کی بھی قربانی دے دیتا ہے۔ کہانی کے بین السطور میں اس کردار کا جو عکس سامنے آتا ہے اس کا عورت کی تقدیر اور تصویر سے بہت گہرا رشتہ ہے۔

(الف) میرے گورے گورے انگوں میں ایک قدرتی کساؤ برقرار تھا اور میرے جوبن کے ابھار بھی ماند نہیں پڑے تھے لیکن اندر سے میں خود کو کمزور محسوس کرنے لگی تھی، میں اپنے شوہر کی خوشی کے لیے سب کچھ کررہی تھی جس سے کہ وہ خوش رہے۔

(ب) وہ میرے سامنے اس کلیگ کی گوپیوں سے پینگیں بڑھاتا رہا اور میں گم صم بنی اپنی آنکھوں سے یہ سب تماشہ دیکھتی رہی۔ بھانت بھانت کے رنگ و روپ کے مرد وزن جب ایک دوسرے میں پیوست ہوتے تو آدم زادوں کا ایک ایسا ہیولہ تیار ہو جاتا تھا، جو اپنے آپ میں کسی شجرِ ممنوعہ سے کم نہ تھا۔ اس پر مستزاد، وہ لمبی سیاہ زلفوں والی ڈائن تھی جو مردوں کے ہاتھوں میں شراب سے لبریز کسی پیمانے کی طرح گردش کرتی رہتی۔ حتیٰ کہ اس کے گرد مردوں کی لائن لگ جاتی اور وہ سب اکٹھے اسے اپنے گرم گرم ہونٹوں سے چومتے تھے۔ ادھر میں اپنے ہاتھوں سے اپنے نصیبوں کو رو پیٹ کر بیٹھ چکی تھی۔ میری حیثیت اس چوسی ہوئی آم کی گٹھلی کی مانند ہو چکی تھی جو آدم زادوں کی ٹھوکروں کی زد پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر گر پڑتی ہے، جسے گدھے بھی سونگھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔''

پرویز شہریار نے ان دونوں کرداروں کی نفسیات، جذبات اور کیفیات کی خوب صورت عکاسی کی ہے اور یہ عکاسی دونوں کی جبلت سے ہم آہنگ بھی ہے کہ مرد ہمیشہ طربیہ کردار میں رہنا پسند کرتا ہے جب کہ عورت اکثر حالات میں المیہ کردار بن جاتی ہے۔ اس افسانے میں بھی طربیہ اور المیہ کی دونوں کیفیتیں موجود ہیں کہ مرد کردار جہاں اپنی لذت کی خاطر ہر مسکراتی ہوئی کلی اور ہر کھلتے ہوئے پھول کو اپنے پیروں تلے بے رحمی سے روندتا ہے وہیں عورت کردار کو ناگن کی طرح تنہائی ڈستی رہتی ہے اور اس کی ہڈیوں میں سرد لہری دوڑنے لگتی ہے۔ اس

کردار کی کیفیت کچھ یوں ہوجاتی ہے جس کو کہانی کار نے اس طرح بیان کیا ہے:

''آج، میں خود کو اکیلے پن کے ایسے اندھے کنویں میں گرتی ہوئی محسوس کررہی ہوں، جہاں سے میری آواز باہر کی دنیا تک پہنچ نہیں سکتی۔ میں اندر ہی اندر چیخ رہی ہوں لیکن میرے آس پاس مجھے کوئی سننے والا نہیں ہے۔''

پرویز شہریار کا یہ افسانہ جدید حسیت سے لبریز ہے مگر اس کا بین المتونی لمس بھی اس کہانی کے اندر موجود ہے گویا اس کا رشتہ ازل سے جوڑا گیا ہے اور ایک تلمیح کے ذریعہ آج کی اس بھیانک حقیقت کو عہد عتیق سے جوڑ کر ایک نئی معنویت پیدا کی گئی ہے۔

''میری دردبھری داستان سننے کے بعد اس نے مجھے توریت کا ایک واقعہ سنایا تھا۔ انھوں نے کہا۔ آدم جب جنت میں اپنے اکیلے پن سے گھبرانے لگے تو خدا نے ان کی دل جوئی کے لیے آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا۔ ایک ساتھی مل جانے کے بعد آدم اور حوا جنت میں خوب شاداں وفرحاں رہنے لگے۔ تبھی للت جس کی شکل عورت کی تھی مگر اس کا بدن سانپ کا تھا۔ اسے یہ سب دیکھ کر برداشت نہ ہوا۔ کیوں کہ وہ جنت میں اس وقت سے موجود تھی جب حوا کا وہاں وجود بھی نہ تھا۔ دراصل، حوا وہاں بعد میں آئی تھی اور للت وہاں پہلے سے رہ رہی تھی۔ ایک دوسری عورت کو دیکھ کر للت کے اندر جلاپا شروع ہوگیا۔ اس نے آدم اور حوا کے خلاف ایک سازش رچی اور باغ بہشت کے ایک خاص شجر ممنوعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے یہ کیا بات ہوئی کہ جنت کا جو سب سے بہترین پھل ہے، بھلا اسے ہی کھانے سے منع کردیا جائے۔'' اس نے بی بی حوا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو! تم یہ پھل ضرور کھانا۔ اس جیسا جنت میں کوئی دوسرا پھل نہیں۔

اتنا سننا تھا کہ حوا اپنی فطری معصومیت کی وجہ سے سازش کا شکار ہو گئیں۔ جنت کا پھل چکھتے ہی ان کی شرم گاہیں عیاں ہوگئیں اور پھل کھانے کی پاداش میں انھیں خلد سے نکال دیا گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن عورت ہی عورت کے اخلاقی زوال کا سبب بنی ہوئی ہے۔''

اس افسانے کا تلمیحی رشتہ تانیثیت کے اس تصور کی مکمل تنسیخ ہے جس میں جبر واستحصال کے لیے مردانہ معاشرے کو ہی موردِ الزام قرار دیا جاتا ہے اور عورت کی تمام ذلتوں کے لیے مردانہ ذہن ہی ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس افسانے کا ابتدائی حصہ پڑھتے ہوئے مرد کردار کی عیاشی، آوارگی، بدکرداری اور اس کی چالاکی ذہن پر نقش ہوجاتی ہے اور عورت ایک مظلوم، مقہور، مجبور کردار کی حیثیت سے نظر آتی ہے مگر اس تلمیح کے بعد ذہن کا زاویہ بدل بھی سکتا ہے اور یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ عورت کے استحصال اور استبداد کے پیچھے صرف مردانہ مکاری نہیں بلکہ عورت کی شاطرانہ ذہنیت بھی کام کرتی ہے اور مرد ہی نہیں بلکہ عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ اس تناظر میں نسائی کردار کا یہ جملہ بھی بہت معنی خیز ہے۔

''میرے شوہر اور وہ سیاہ فام چڑیل ایک دوسرے کو شاید بہت پہلے ہی سے جانتے تھے۔۔۔ میری نظروں کے سامنے وہ سیاہ سمندر کے نمکین پانی میں متواتر ابھرتا رہا اور حیرت ہے کہ اس کے قہقہوں کی آواز میرے کانوں میں نہیں پڑ رہی تھی۔''

اس افسانے میں نسائی کردار ایک ساکت، ساکن کردار اور مفعول کردار میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس نسائی کردار میں خودسپردگی ہے اس لیے وہ بغاوت اور مزاحمت نہیں کرپاتی اور جب آنکھیں کھلتی ہیں تو پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔

پرویز شہریار کا یہ افسانہ بھی تقدیر نسواں کی ایک تصویر ہے۔ اس کا تانیثی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو شاید اس میں مردانہ ذہن کی کارفرمائی نظر آئے گی کہ افسانہ نگار نے اس کا رشتہ عورت نما للت سے جوڑ دیا ہے جو حوا کی ذلت کی ذمہ دار ہے۔ اسی موضوع پر کوئی خاتون افسانہ لکھتی تو شاید اس کا زاویہ نظر الگ ہوتا اور وہ مرد اساس معاشرے کی ذہنیت پر کاری ضرب لگانے میں کامیاب ہوتی۔ یعنی اس افسانہ میں تانیثیت پسندوں کے لیے معاملہ بالکل الٹا ہوگیا کہ قصور ان کو دیتے تھے الزام اپنا نکل آیا۔ اس کہانی میں کشش اتصال اور کشش مقناطیسی کی کشمکش کا بہت خوب صورت بیانیہ ہے کشش اتصال یعنی شوہر اور بیوی جو ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں اور ایک جان دو قالب کہلاتے ہیں، اسے کشش مقناطیسی یعنی وہ سیاہ فام چڑیل جدا کردیتی ہے اور اپنی جنسی جاذبیت اور رعنائی کے ذریعے اس کے شوہر کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

'لیو اِن ریلیشن سے پرے' کا شمار بھی پرویز شہریار کے عمدہ افسانوں میں کیا جاسکتا ہے کہ یہ افسانہ بھی ایک الگ نوعیت کے مسئلے سے متعلق ہے۔ یہ ایک ایسا emerging issue ہے جس پر اردو میں کہانیاں کم لکھی گئی ہیں۔ یہ ایک نئے معاشرتی رویے کا بیانیہ ہے جو مغربی سماج کے لیے محظور نہ سہی مگر مشرق کے لیے ممنوع ہے اور آج کی جنریشن اسی ممنوعہ زون میں جذب ہونے کے لیے بے چین نظر آتی ہے۔

لیوان (Live-in) آج کے معاشرے کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے اور تبدیلی معاشرت کا ایک بہت بڑا اشاریہ بھی کہ آج ہر لحہ بدلتی اس دنیا میں متبادل کی تلاش کا عمل جاری ہے۔ صدیوں پرانے ازدواجی نظام کی شکست و ریخت سے اس رویے نے جنم لیا ہے اور شادی کے بغیر رفاقت کے اس تصور کی جڑیں مضبوط ہوتی جارہی ہیں کیوں کہ بغیر دباؤ کے آزادی کا احساس نئی جنریشن میں بڑھتا جارہا ہے اور ایک بڑا طبقہ شادی کو اپنے لیے زنجیر سمجھتا ہے اور ازدواجی زندگی کی تلخیوں اور اس سے پیدا شدہ تناؤ اور کشمکش نے بھی اس تصور کو عام کیا ہے۔ یورپی ممالک میں اب Co-habitation یا لیوان ریلیشن غیر قانونی نہیں ہے مگر ہندوستان جیسے مذہبی اقدار ورسومات کے ملک میں یہ غیر قانونی نہ سہی لیکن غیر اخلاقی ضرور سمجھا جاتا ہے۔ جدید جنسی اخلاقیات میں یہ کوئی معیوب عمل نہیں ہے مگر اس سے شادی جیسے مضبوط ادارے اور نظام کی ساخت مجروح ہو رہی ہے۔ یہ ایک طرح سے deinstitutionalisation of marriage کی ایک شکل ہے۔

پرویز شہریار کا یہ افسانہ اسی حساس موضوع سے متعلق ہے۔ انھوں نے اس افسانہ کے لیے صنف اور وصف کے اعتبار سے دو متضاد کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔ ایک نہایت ہی سیاہ فام شبھونا تھا اور دوسرا کردار نازک اندام پدمجا جوسیف

۔یہ دونوں مذہب، نسل، رنگ، قوم ہر اعتبار سے الگ ہیں اور دونوں میں تطابق کی کوئی فطری صورت بھی نظر نہیں آتی۔لیکن یہ دونوں الگ الگ پس منظر سے تعلق رکھنے والے کردار آخر میں ایک ہو جاتے ہیں۔اسے اس کہانی کا حسن بھی کہا جا سکتا ہے کہ دو متضاد لہریں ایک سمندر میں سما جاتی ہیں اور دونوں متضاد ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔دراصل ان دو قطبین کا اجتماع مجبوری حالات کا ثمرہ ہے۔افسانہ نگار نے دونوں کرداروں کی ذہنی کیفیت اور حالات کی بہت عمدہ عکاسی کی ہے۔یہ دونوں کردار ترک وطن کر کے معاش کے لیے ایک چھت کے نیچے اکٹھے ہوتے ہیں اور پھر دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آ جاتے ہیں کہ ایک ہی کمرے میں اور ایک ہی بستر پر سونا ان کی مجبوری بن جاتی ہے۔یہ دونوں کردار لیوان ریلیشن شپ میں بندھ جاتے ہیں۔مرد کردار کو اس میں کچھ قباحت نظر آتی ہے مگر عورت اس معاملے میں تھوڑی آزاد خیال ہے۔اس لیے وہ شمبھو کو سمجھاتی ہے:

''ہم اپنے عزیزوں کو اپنے گاؤں میں چھوڑ کے پیسے کمانے کی خاطر ہی اس شہر میں آئے ہیں۔پیسے گنوانے کے لیے نہیں۔؟ اس لیے کرائے پر پیسے پھینکنے کے بجائے ایک ہی کمرے میں گزارا کر سکتے ہیں۔''

دونوں کرداروں کا مکالمہ کافی دل چسپ ہے۔دونوں ہی لیوان ریلیشن شپ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔

''بے وقوف مت بنو۔انھیں کیسے پتہ چلے گا کہ ہم دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟''

میڈم! یہ امریکہ نہیں ہے۔۔۔''شمبھو نے جلدی سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

''ایسا صرف امریکہ میں ہوتا ہے کہ ایک ہی دفتر میں کام کرنے والے کولیگ اکثر فلیٹ بھی آپس میں شیئر کر لیتے ہیں۔''

''اکزیکٹلی!'' پدمجا نے اس کی بات کو سراہتے ہوئے شمبھو سے دریافت کیا۔

''تم نے لیوان ریلیشن تو سنا ہی ہوگا؟''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہم دونوں کافی میچیور ہیں۔ہم وہ سب کچھ کریں گے،۔۔۔سوائے بچہ پیدا کرنے کے،جس سے انھیں ہمارے بارے میں غیر شادی شدہ ہونے کا کوئی شک نہ ہو۔

''اگر کوئی پوچھے گا کہ آپ نے منگل سوتر نہیں پہن رکھا ہے۔آپ نے سیندور بھی نہیں لگا رکھا ہے،تو پھر۔۔۔؟''

''ان کو ہم کہہ دیں گے ۔ ہماری ابھی انگیج مینٹ ہوئی ہے۔'' اور''ویسے بھی کرسچن ان فالتو کی رسموں میں کبھی یقین نہیں کرتے ہیں۔''

افسانہ نگار نے دونوں کی ذہنی قربتوں کے ساتھ ساتھ جسمانی قربتوں کو بھی بیان کیا ہے کہ رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ جاتے ہیں کہ جسمانی رشتہ بھی قائم ہو جاتا ہے اور پدمجا جوسیف مانع حمل ادویات استعمال کرنے لگتی ہے۔اسی دوران پدمجا جوسیف کا نیویارک کا ویزا آ جاتا ہے جس کی وجہ سے شمبھو ایک اندرونی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔پدمجا کی فلائٹ کے صرف تین دن باقی رہتے ہیں کہ دونوں کی جذباتی کیفیت عجیب سی ہونے لگتی ہے، پدمجا بھی اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے اور شمبھو کو دلاسہ دیتی ہے اور پھر ایک رات ایسا ہوتا ہے جس کو افسانہ نگار نے بڑے خوبصورت پیرائے میں یوں بیان کیا ہے۔

''اس رات پدمجا شمبھو کی انگلی تھام کے اسے ایک ایسے حسین اور جواں اقلیم کی سیر پر لے گئی جہاں سچی محبت کرنے والے مرد اور عورت کے جوڑے ہی جا سکتے ہیں اور وہاں جانے کے بعد پھر زندگی اور موت کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔

صبح ہوئی۔

شمبھو کے دل کا تمام غبار نکل چکا تھا۔

آج، نہ جانے کیوں صبح خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

شمبھو نے حسبِ دستور بیڈ ٹی لے جا کر تپائی پر رکھی اور پدمجا کے ماتھے کو یکا یک جذبات سے مغلوب ہو کر آہستہ سے چوم لیا۔سوئی ہوئی حالت میں آج وہ شمبھو کو بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔ایک انگڑائی کے ساتھ وہ اٹھ بیٹھی۔شمبھو نے ایک گلاس پانی کے ساتھ پری وینٹو پلس رکھ کر پدمجا کی طرف بڑھا دی۔

تبھی پدمجا نے فرط جذبات میں آ کر شمبھو کو اپنے گلے سے لگا لیا اور پوری قطعیت کے ساتھ یہ اعلان کیا۔۔

اب مجھے پری وینٹو پلس کی ضرورت نہیں ہے۔

اتنا کہتے ہی اس نے اپنے سرہانے سے نیو یارک کا ویزا نکالا اور اسے فوراً ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور اپنے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''اب میں نیویارک نہیں جاؤں گی''

اس افسانے میں عورت عطوفت، ایثار، ممتا اور محبت کے پیکر میں نظر آتی ہے کہ اسے پیسہ نہیں پیار چاہیے اور وہ اپنی محبت کے لیے اپنی تمام خواہش اور خواب کو قربان کر دیتی ہے۔اس میں عورت کا جو کردار ہے، وہ اس کے پیشے سے بھی ہم آہنگ ہے کہ نرس ہونے کی وجہ وہ دوسروں کے دکھ کو اپنے دکھ پر ترجیح دیتی ہے اور دوسروں کی خوشی کے لیے اپنی جان نثار کر دیتی ہے۔

پرویز شہریار نے افسانہ کی مناسبت سے بہت ہی عمدہ کردار کا انتخاب کیا ہے۔اگر نرس کی جگہ کوئی اور نسائی کردار ہوتا تو شاید اس کا عمل اور ردِ عمل اس سے قطعی مختلف ہوتا اور وہ شاید پیار پر پیسے کو ترجیح دیتی اور اپنے خواب کی تکمیل کے لیے مرد کے جذبات کو مجروح کرنے سے بھی باز نہیں آتی مگر یہاں معاملہ بہت مختلف ہے کہ تمام مثبت اقدامات ایک نسائی کردار کے ذریعے کیے جا رہے ہیں کہ محبت اور مدھر ملن میں پیش قدمی عورت کی طرف سے ہو رہی ہے۔یہ ایک طرح سے اسٹیریو ٹائپ نسائی کردار سے انحراف بھی ہے۔پرویز شہریار نے عورت کو ایک فاعلی اور متحرک کردار کے طور پر پیش کیا ہے جب کہ عام طور پر نسائی کردار کو بہ انداز دگر پیش کیا جاتا ہے۔

پرویز شہریار نے بڑی خوبصورتی سے یہ افسانہ تخلیق کیا ہے۔لیکن اگر اس کے ابتدائی تمہیدی حصے کو حذف کر دیا جاتا تو شاید کہانی زیادہ پرقوت اور پرتاثیر بن جاتی۔ابتدا میں اطناب نے کہانی کو تھوڑا مجروح کیا ہے۔افسانہ اگر یہاں سے شروع ہوتا تو شاید حساس قاری کو شکایت نہ ہوتی۔

''پدمجا کو دنیا بھر کے مردوں کی اوچھی نظروں سے بچنے کے لیے فوری طور پر ایک بوائے فرینڈ کی ضرورت تھی۔''

موضوعی اعتبار سے پرویز شہریار کا یہ بہت اچھا افسانہ ہے گو کہ اس موضوع پر بہت سی فلمیں بھی بن چکی ہیں جس میں لیو اِن کے ڈائلما کو پیش کیا گیا ہے۔کٹی پٹی، ارتھ، سلام نمستے، فیشن، پیار کا پنچ نامہ، کاک ٹیل، شدھ دیسی رومانس جیسی فلمیں اسی موضوع کو مس کرتی ہیں مگر اردو میں اس بولڈ موضوع پر بہت کم کہانیاں لکھی گئی ہیں۔پریم چند کی کہانی گئودان میں اس کی طرف ہلکا سا اشارہ ضرور ملتا ہے۔

پرویز نے ایک نئے موضوعی منطقے کا انتخاب کیا ہے اور اتفاق یہ ہے کہ دونوں ہی افسانے ماورائے ازدواج رفاقتوں سے متعلق ہیں، دونوں ہی افسانوں میں ایک دیہی ملک کی شہری دنیا کی دریافت ہے جہاں پرانی قدریں دم توڑ رہی ہیں اور نئی قدریں وجود میں آرہی ہیں اور ان نئی قدروں کے پیچھے نو دولتیہ طبقے کا ہاتھ ہے جو اپنی جڑوں سے منحرف ہو کر پرواز کے نئے آسمان تلاش کر رہا ہے۔

پرویز شہریار نے ان دونوں افسانوں کے ذریعے جہاں جنسی اباحیت کے باب میں مشرق و مغرب کی تفریق کو ختم کیا ہے وہیں نئے ثقافتی ادغام کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ جنس کے باب میں مشرق و مغرب کی قربتیں بڑھ گئی ہیں اور دونوں کے جنسی رویے میں بڑی حد تک یکسانیت اور مماثلت ہے۔گلوبلائزیشن کی وجہ سے ثقافتی سانگی اور کلچرل شعور تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔جہاں مشرقیت اور مغربیت کی سرحدیں ختم ہو رہی ہیں اور ثقافتی ادغام کی شکل میں ثقافتی انہدام کا ایک سلسلہ سا چل پڑا۔یہ دونوں افسانے گو کہ ازدواجی نظام کے انہدام سے عبارت ہیں مگر دونوں افسانوں کا ردِعمل مختلف ہے۔ایک ہی جیسے عمل سے ایک کہانی میں زندگی برباد ہوتی ہے تو دوسری کہانی میں زندگی آباد ہو جاتی ہے۔ایک افسانے میں مادیت پر محبت کی فتح ہے تو دوسرے میں محبت پر مادیت کا غلبہ ہے۔پرویز شہریار کے ان دونوں کہانیوں کا تانیثی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو عورتوں کی مکمل آزادی اور خود مختاری کے باوجود PostPhallocentricWorld کا تصور محض ایک خواب نظر آتا ہے اور عورت آج بھی ایک اضافی شے ہی نظر آتی ہے۔

ان دونوں افسانوں کا بیانیاتی تجزیہ کیا جائے تو دونوں افسانے پیش کش، واقعاتی نظام اور دیگر فنی لوازمات کے اعتبار سے بہتر نظر آئیں گے۔آج کی کہانیوں میں جو drastic shift آرہی ہے، پرویز شہریار کے افسانے اس کی بہتر نمائندگی کرتے ہیں۔ان افسانوں کے علاوہ پرویز شہریار نے ان موضوعات کو بھی مس کیا ہے جو آج کے معاشرے سے متعلق ہیں۔وہ عمومی موضوعات جن میں فسادات، فرقہ واریت، دہشت گردی وغیرہ وغیر شامل ہیں، جن پر اکثر فن کار کہانیاں لکھتے رہے ہیں۔پرویز شہریار کی ایسی کہانیوں میں ہم وحشی ہیں، چونا شاہ کی ہرنیں اداس ہیں، سیلوا جڈوم کہاں جائیں وغیر کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ان میں پرویز شہریار کا انداز قدرے الگ ضرور ہے۔مگر موضوعاتی مماثلت کی وجہ سے بہت سی کہانیاں بھیڑ میں گم ہو جاتی ہیں اور اکثر اس طرح کی کہانیوں کا حشر وہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے ذہن سے یہ کہانیاں بہت جلد محو ہو جاتی ہیں اور ان کہانیوں کی مدتِ حیات بھی بڑی مختصر ہوتی ہے۔

پرویز شہریار نے راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کا مرکوز مطالعہ کیا ہے اس لیے ان کے افسانوں میں وہ رنگ بھی آجاتے ہیں جو بیدی اور عصمت سے مخصوص ہیں مگر پرویز شہریار نے ان سے تحریک اور ترغیب حاصل کر کے اپنی کہانیوں کو جداگانہ رنگ عطا کیا ہے اور شاید یہ رنگ دگر انھیں تخلیقی دنیا میں زندہ و تابندہ رکھے گا۔(تھکی ہوئی ساعتوں میں لکھا گیا مضمون)

معبود سے کلام

پرویز شہریار کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔وہ دنیا میں اور انسانی زندگی میں امن اور توازن کے خواہاں نظر آتے ہیں۔یہ کیسی مسموم ہوا چلی، کھاڑی پدھ کی باتیں، جمشید پور کے دو فسادات، ہم امن چاہتے ہیں، قتل صدام حسین، شیطان بزرگ کو خدا ماننے والو، جیسی نظمیں پڑھتے ہوئے یہی احساس ہوتا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے عشق حقیقی اور خدا اور بندے کے رشتوں کو بھی موضوع بنایا ہے۔اس پُرفتن دور میں یہ نظمیں دینی جمالیات کا پرتو لیے ہوئے روح کے زخموں پر پھائے کا کام کرتی ہیں۔ایک نظم ہے 'ارتعاش کی آواز' اس کے باطن سے پھوٹنے والی کرنوں کو آپ بھی اپنے اندر اتار سکتے ہیں، جہاں تاریکی ہوگی تو کچھ دیر کے لیے سہی، وہاں جگنو کی سی چمک پیدا ضرور ہو جائے گی۔کچھ حصے دیکھیے:

عشق ہے،/ دو وجود کے یکجا ہونے کی/ خواہش کا نام/ دو وجود روحانی/ یا پھر/ دو وجود جسمانی/ دوسرے کو خود میں سمانے کا نام/ ذرے کا بے پناہ وسعت میں/ کھو جانے کا نام/ عشق ہے/ عشق ہے بندے کا معبود سے کلام/ معبود نے ہی عبد میں یہ جذبہ/ ودیعت کی ہے/ عشق ہی سے دنیا تابندہ ہے/ عشق ہی سے ہر خواب درخشندہ ہے/ عشق دو وجودوں کو ملاتا ہے/ عشق جسے ہو جائے/ وہی خدا کو پاتا ہے/ عشق بھی/ عاشق بھی/ معشوق بھی/ خدا ہے/ ذرہ ذرہ ہے اسی سے وابستہ/ ہر ذرّے میں ہے وہی پیوستہ/ ہمہ اوست

کوثر مظہری

پرویز شہریار کے افسانے

شموئل احمد
(پٹنہ)

اسّی کی دہائی میں جو تخلیق کار ابھر کر سامنے آئے ان میں پرویز شہر یار کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ وہ دور تھا جب نئی نسل جدیدیت کے چونچلے سے آزاد ہونے لگی تھی۔ اس نسل نے جو لہجہ اختیار کیا وہ جدیدیت کی کوکھ سے نکلا ہے۔ پرویز شہر یار کچھ ایسے ہی بیانیہ کے ساتھ ادب کے افق پر نمودار ہوئے۔ وہ قاری پر اپنی گرفت بنانے ہیں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانے فن کی بنیادی قدروں سے آشنا ہیں۔ وہ عصری مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ داخلیت اور خارجیت کی آویزش سے ان کے افسانے ایک نئے جہانِ معنی کی تشکیل میں بہت حد تک کامیاب ہیں۔

پرویز کے یہاں موضوع کا تنوع ہے۔ کہانی ''لوان ریلیشن سے پرے'' ریلیشن شپ کے گرد گھومتی ہے۔ اس کہانی کے شمبھو اور پدمجا ایک ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن کہانی کا موضوع ریلیشن شپ نہیں ہے۔ موضوع ہے محبت جو عورت محبوب پر ہی نچھاور کر سکتی ہے۔ ازدواج سے بندھی عورت یا ریلیشن شپ میں جیتی ہوئی عورت محبت کے کھیل کھیلتی ہے، جسم کے فرائض نبھاتی ہے لیکن خزانے نہیں لٹاتی ہے۔ لیکن جب اس کے دل میں محبت کا سوتا پھوٹتا ہے اور مرد اس کا محبوب بن جاتا ہے تو اس پر اپنا سراپا نچھاور کرتی ہے جسم و جاں کے خزانے لٹاتی ہے۔ اس کہانی پر بیدی کی کہانی ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کا گہرا اثر ہے۔ لو ان ریلیشن کی پدمجا 'اپنے دکھ مجھے دے دو' کی اندو ہے۔ اس کہانی کا مدن شادی کے پندرہ سال بعد اپنی ازدواجی زندگی میں تشنگی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اندو ایک خدمت گذار بیوی ہے جو ایثار و محبت کی مجسّمہ ہے۔ وہ مدن کی اس کیفیت کو بھانپ لیتی ہے اور ایک رات بن سنور کر مدن کے پاس آتی ہے اور محبت میں پہل کرتی ہے اور کہتی ہے آج کی رات میری ہے۔ راجندر سنگھ بیدی لکھتے ہیں:

''اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اُسے ایسی دُنیاؤں میں لے گئی جہاں کوئی مر کر ہی پہنچ سکتا ہے۔''

'لوان ریلیشن سے پرے' کی پدمجا شمبھو کے ساتھ رہتی ہے۔ شمبھو پدمجا کے عشق میں گرفتار ہے، لیکن پدمجا اس حد تک محبت نہیں کرتی لیکن ساتھ رہنے کے تقاضے پورا کرتی ہے۔ پدمجا امریکہ کا ویزا حاصل کرتی ہے۔ وہ شمبھو کو چھوڑ کر پیسے کمانے امریکہ جانا چاہتی ہے لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے کہ شمبھو بیمار پڑ جاتا ہے۔ پدمجا اس کی جی جان سے خدمت کرتی ہے۔ پرویز شہر یار لکھتے ہیں:

''پدمجا نے اس کے جسم کو ممتا سے لبریز ہو کر کچھ اس طرح سے اپنی آغوش میں بھر لیا جیسے کوئی ماں اپنے شیر خوار بچّے کو بھر لیتی ہے۔ اس دم وفور جذبات سے وہ اس قدر بھر گئی کہ اس کے اندر حرارت پیدہ کرنے کے لیے اس نے اپنے گرم گرم بوسوں اور آنسوؤں سے اُسے تر کر دیا تھا۔''

(شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں، ص-24)

شمبھو پدمجا میں مریم کا عکس دیکھتا ہے۔ یہ سیکس کا روحانی پہلو ہے۔ رجنیش کہتے ہیں کہ عورت بہت پیار میں آتی ہے تو اس کا ہاتھ مرد کے سر پر چلا جاتا ہے۔ عورت کی چھاتیوں کی طرف مرد کے بڑھتے ہوئے ہاتھ دراصل بچّے کے ہاتھ ہیں جو ماں کی ممتا سے اپنے لیے حرارت کسب کرنا چاہتا ہے۔

یہی وہ لمحہ ہے جب پدمجا کے دل میں محبت کا سوتا پھوٹتا ہے۔ شمبھو کا دل محبت کے الوہی جذبے سے سرشار ہے۔ پدمجا اس کے لیے اب مریم روپ ہے۔ پدمجا کی چھاتیاں اب شہوت سے بھری نظر نہیں آتیں۔ افسانہ نگار کے لفظوں میں'' بچھڑنے کے کرب کے احساس سے بوجھل فضا میں بھی وہ بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کے نور سے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے سینے میں کسی اینجل کا دل دھڑک رہا ہو۔ معصومیت، حلمیت، شفقت اور بچّے کو اپنی شیریں لوریوں سے سلا دینے والی ممتا کے جذبوں سے اس کا سینہ بھرا بھرا سا لگ رہا تھا۔''

اور پدمجا بھی شمبھو کی جانب سمندر سے گہری محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہے اور کھڑی ہو کر یسوع مسیح کی طرح اپنی دونوں بانہیں پھیلاتی ہے۔ اپنی آنکھوں کے اشارے سے اسے قریب بلاتی ہے اور اس کے اُترے ہوئے چہرے کو اپنے سینے سے لگا لیتی ہے۔ پرویز شہر یار آگے لکھتے ہیں:

''اس رات پدمجا شمبھو کی انگلی تھام کے اسے ایک ایسے حسین اور جواں اقلیم کی سیر پر لے گئی جہاں سچّی محبت کرنے والے مرد اور عورت کے جوڑے ہی جا سکتے ہیں اور وہاں جانے کے بعد پھر زندگی اور موت کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا ہے۔''

(شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں، ص-27)

بیدی کے اس جملے پر غور کیجئے:

''اندو نے مدن کا ہاتھ پکڑا اور اُسے ایسی دُنیاؤں میں لے گئی جہاں کوئی مر کر ہی پہنچ سکتا ہے۔''

پرویز شہر یار بیدی کے اثر سے بچ نہیں سکے ہیں۔ اندو مدن کا ہاتھ پکڑ کر دوسری دنیا میں لے جاتی ہے اور پدمجا شمبھو کی انگلی پکڑ کر دوسری دنیا میں لے جاتی۔ بیدی لکھتے ہیں یہ ایسی دنیا ہے جہاں آدمی مر کر ہی پہنچ سکتا ہے۔ پرویز لکھتے ہیں یہ ایسی دنیا ہے جہاں موت اور زندگی کا فرق معنی نہیں رکھتا۔ بیدی کی اندو پرویز کی پدمجا ہے۔

محبت کے آگے ہر چیز ہیچ ہے۔ پدمجا کے لیے اب بڑی سے بڑی چیز بھی معنی نہیں رکھتی۔ محبت اس کے دل میں گھر کر چکی ہے۔ اس کی دُنیا اب شمبھو ہے۔ وہ امریکہ جانے کا ارادہ ترک کر دیتی ہے۔ ویزا چاک کر دیتی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شمبھو کی ہو جاتی ہے۔

افسانہ 'شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں' کے موضوع پر بہت نہیں لکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ ازدواج کی ادلی بدلی کا افسانہ ہے۔

کہانی ازدواجی زندگی کے بے کیف رشتے سے شروع ہوتی ہے اور شجرِ ممنوعہ کے پھل چکھتے چکھتے تنہائی کے اندھے غار میں ختم ہوتی ہے۔ یہ ایروز (Eros) کے اس نگارخانے کی کہانی ہے، جس میں داخل ہونے کے راستے کھلے ہیں۔ لیکن باہر نکلنے کا ہر راستہ بند ہے۔ مرد جنس کے کاسنی سمندر میں غوطے لگاتا ہے اور عورت کی روح میں زخم لگتے رہتے ہیں۔

مرد کا خیال ہے کہ ''ازدواج کی عارضی ادلی بدلی سے فرسودہ رشتے میں نئی بہار آجاتی ہے جس سے رشتے کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور محبت کے بوسیدہ شجر پر نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔''

لیکن عورت اس خیال سے کراہیت محسوس کرتی ہے۔ وہ راضی نہیں ہوتی ہے تو شوہر احساسِ محرومی میں مبتلا ہو کر شراب نوشی شروع کر دیتا ہے۔ گھر دیر سے لوٹتا ہے۔ اس کا موڈ اُکھڑا اُکھڑا سا رہنے لگتا ہے۔ بیوی کیا کرے، اُسے اپنے شوہر سے محبت ہے۔ اس کی خاطر وہ حامی بھر لیتی ہے۔ شوہر اسے ایک خفیہ کلب میں لے جاتا ہے جو کثیر جنسی سرگرمیوں کی آماجگاہ ہے۔ یہاں زوج کی ادلا بدلی ہوتی ہے۔ شجرِ ممنوعہ کی مِتھ کو پرویز شہریار نے تخلیقی سطح پر برتنے کی کوشش کی ہے۔ شروع کی عبارت میں پرویز لکھتے ہیں:

''مجھے نیچے سے دھکّا دے کر جب وہ شجرِ ممنوعہ پر چڑھانے لگا تب میرا ماتھا ایک دم سے ٹھنکا تھا۔

میں نے نیچے گہرا کنواں دیکھ لیا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضا جواب دینے لگے تھے۔ میں درخت سے نیچے گرنے ہی والی تھی کہ تبھی کسی نے اوپر درخت سے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ میں نے دیکھا کوئی شخص پہلے ہی سے وہاں مجھے سہارا دے کر اُوپر اٹھانے کے لیے موجود تھا۔

ایک پل کے لیے مجھے لگا میرے تن پر ایک کپڑا نہیں ہے۔ دنیا مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی ہے۔ لیکن جب حواس ٹھکانے لگے اور غور سے دیکھا تو وہاں ہر طرف ہمارے ہی جیسے لوگ موجود تھے۔

شجرِ ممنوعہ کا سرسبز شاداب نخلستان اور دور دور تک ریگستان کا لامتناہی گھپ اندھیرا۔ ہر درخت پر کوئی آدم زاد موجود تھا اور حوّا کی بیٹیاں شجرِ ممنوعہ پر زبردستی چڑھائی جا رہی تھیں۔ درخت کے پھل کھاتے ہی احساس زیاں جاتا رہا اور گہرے کویں کا خوف بھی کافور ہو گیا۔ ہر طرف اٹھکھیلیاں چل رہی تھیں اور خشک ریگستان کے ٹھیک بیچوں بیچ قہقہوں کے قل قل کرتے چشمے پھوٹ رہے تھے۔''

(شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں، ص-2)

عورت چھیالیس سال کی ہوتی ہے تو شجرِ ممنوعہ سے ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔ لیکن شوہر کی بھوک بڑھتی رہتی ہے۔ عورت ڈھلتے جسم کے ساتھ شوہر کا ساتھ دیتی رہتی ہے۔ پرویز ازدواج کی ادلا بدلی کی نفسیات کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''جب اپنے شوہر کے سامنے دوسرا مرد آپ کے وجود کو جھنجھوڑتا ہے تو یقیناً آپ کے اپنے مرد کے اندر رقابت اور حسد کا ایک شعلہ سا لپک اُٹھتا ہے اور وہ اس کی تپش میں جھلس کر اپنے اندر کی گرمی دوسری عورتوں کے اندر جا کر ٹھنڈا کرتا ہے۔ یہ شعلوں سے کھیلنے کا ایک غیر فطری عمل ہے۔ لیکن یہی کام میرے شوہر کے اندر ہر بار جینے کی ایک نئی امنگ پیدہ کر دیتا تھا۔ کئی ماہ تک آنکھ مچولی کا یہ سفلی کھیل چلتا رہا۔ اس کے اندر تیزی سے تبدیلی آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ ہماری ازدواجی زندگی میں ایک ایسا بھی موڑ آیا جب مجھے اس کی خوشی سے نفرت اور چڑ سی ہونے لگی۔''

(شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں، ص- 5)

پرویز شہریار اس شخص کو ایک مابعد جدید انسان بتاتے ہیں۔ وہ سنیاسی بن کر جینا نہیں چاہتا ہے۔ وہ اپنی جنسی تشنگی کو تہہ دامن دبا کے مہاپرش اور مہاتما بننے کا آڈمبر نہیں رچا سکتا۔ اس کے پاس ایک لذّت پرست بیمار ذہن ہے۔ اس کی بوالہوسی کسی برگد کی جڑوں کی طرح اپنے شاخسانے چاروں طرف پھیلاتی رہتی ہے۔ شجرِ ممنوعہ کا پھل شروع شروع میں عورت کو بھی مدہوش کرتا ہے۔ سب کے سب محبت کے رس میں بھیگے رہتے ہیں اور جنسی ہیجان کے سیل رواں میں بہتے رہتے ہیں۔ لیکن جب ہوش آتا ہے تو عورت خود کو اندھے کنویں میں گری ہوئی محسوس کرتی ہے لیکن تب اس کی چیخوں کو سننے والا بھی کوئی نہیں ہوتا ہے۔

افسانہ ''سہاگ کا خون'' بھی ازدواج کی ادلا بدلی کا افسانہ ہے۔ شجرِ ممنوعہ کی عورت ''سہاگ کا خون'' میں دیویانی بن کر لوٹتی ہے۔ شجرِ ممنوعہ میں وہ شوہر کے ہاتھوں بے بس تھی اور جنس کے سیلاب میں بہہ گئی تھی، لیکن دیویانی میں وہ درگا کا روپ دھارن کرتی ہے۔ افسانہ 'شجرِ ممنوعہ کی چاہ' میں پرویز شہریار نے اسلامی مِتھ کا سہارا لیا تھا۔ لیکن اِس افسانے میں ہندو مِتھ سے کام لیتے ہیں۔

دیویانی کا باپ ایک جیوتشی ہے۔ دیویانی کے ذہن میں یہ بات بچپن سے ہی بٹھا دی گئی ہے کہ وہ کبھی سہاگ کا سکھ نہیں بھوگ پائے گی۔ شادی کے بعد بھی یہ بات اس کے دل و دماغ میں کچوکے لگاتی رہتی ہے۔ دیویانی کا شوہر دولت پرست ہے۔ وہ ایک نامکمل مرد ہے۔ جب کہ دیویانی مکمل عورت ہونا چاہتی ہے۔ شوہر پیسے کمانے میں لگا رہتا ہے اور دیویانی سونی سیج پر تنہا تڑپتی رہتی ہے۔ پرویز لکھتے ہیں:

''دن مہینے سال گذرتے گئے اور اس طرح ایک بچّے کی کلکاریاں سننے کے انتظار میں اس کے کان تھکتے چلے گئے۔ حتّیٰ کہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والے انتظار میں اس نے چھ سات سال کا طویل ریگستانی عرصہ بھی پار کر لیا۔ لیکن اسے امید کی کوئی کلی کھلتی نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے صحرا سے اُچاٹ دل کے آنگن کی ویرانی بڑھتی ہی چلی گئی۔''

(شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں، ص-31)

ایک دن اس کا شوہر اس کو ایک تانترک بابا کے پاس یہ کہہ کر لے جاتا ہے کہ اس کی دعاؤں سے گود ہری ہوگی۔

لیکن حقیقت یہ تھی کہ شوہر نے اس کے ساتھ چھل کیا تھا۔ایک بزنس کے سلسلے میں اس نے انٹرنیٹ پر ایک شخص سے معاہدہ کیا تھا جس کے تحت اسے گڑ گاؤں میں اس کے گھر ایک شب کے لیے تبادلۂ ازدواج کرنا تھا۔اس شخص نے ڈھونگی تانترک کا روپ دھارا پھر دیویانی کے ہاتھ پاؤں بیڈ سے باندھ دیئے اور اس کے ساتھ بدفعلیاں کرتا رہا۔دیویانی جب تک حقیقت سمجھ پاتی دیر ہو چکی تھی۔ تانترک کی گرفت سے آزاد ہوئی تو سیدھا ڈرائینگ روم میں گئی، جہاں اُس کا شوہر تانترک کی کھوسٹ بیوی سے ہم بستر تھا۔دیویانی نے خنجر اُٹھایا اور اس کے ننگے جسم میں پے در پے اُتار دیا۔

کہانی ’’ہم وحشی ہیں‘‘ میں پرویز منوسمرتی کے بنیادی نظریے کے خلاف پروٹیسٹ کرتے نظر آتے ہیں۔کہانی مکالمے سے شروع ہوتی ہے جس میں سِکھ دنگے کا ذکر آتا ہے اور پھر فرقہ وارانہ فساد، جبر اور قتل و غارت گری کا احاطہ کرتے ہوئے انکشاف کرتی ہے کہ غیض و غضب انسان کی سرشت میں ہے۔وہ کبھی آسودہ خاطر ہو ہی نہیں سکتا۔وہ اپنی بربادی کا سامان خود ہی ایجاد کر لیتا ہے۔

مجموعے کی دوسری کہانیاں بھی عصری حقائق سے بھرپور ہیں اور پرویز شہریار کی تخلیقی اور فنّی بوقلمونی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

۔ حسین امتزاج ۔

پرویز شہریار کے افسانوں میں جو بات متاثر کرتی ہے، وہ ان کے خیال و احساس کی لطافت ہے۔اس لطافت کے بڑے وسیع معنی ہیں، وہ سادہ سی کہانی میں بھی خیال کی گہرائی اور گیرائی کا شعور رکھتے ہیں۔قتل و غارت، خون خرابا، بم دھماکے، انسانی اعضا کے ٹکڑے کرتی بیرونی خارجی دنیا اپنے تناظر میں موجود ہے لیکن وہ اسی لوکیل، اسی خارجی دنیا سے ایسا مواد نہیں منتخب کرتے جو بیانیہ میں گھمبیرتا پیدا کرے۔

ان کے وہ تمام افسانے جو نظر سے گزرے ان میں نہ تو وہ بہت گنجلک اسلوبیاتی تجربات نظر آئے جن میں عام فہم غوطہ زن ہو بھی جائے تو اکثر بے ثمر ٹھہرے اور نہ ہی ان کے افسانوں میں بے جا لذت کے صنم تراشے گئے ہیں۔ ہر افسانہ کسی مسئلے سے جڑا ملا۔جس میں نہ تو عشق و محبت کی لایعنی ہیجانیت اور نہ ایذا پرستی نظر آتی ہے۔حقیقت کی ایک ممکنہ تصویر کشی ہی ان کا تصورِ افسانہ محسوس ہوتا ہے۔

اگر ہم ان کے افسانے ’’دس سروں والا بجوکا‘‘ ہی پر بات کریں تو ادب اور زندگی کا ایک خوبصورت امتزاج لگتا ہے۔ پریم چند کے افسانے ’’ہوری‘‘ سے فکری جڑت رکھتا یہ افسانہ بین المتونیت/انٹرٹیکسچوئیلیٹی کی روایت سے بھی ربط رکھتا ہے۔افسانہ نگار معاشرے کا نباض نہ ہو تو حقیقت نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا اور پرویز شہریار نے انسانی خوابوں اور تمناؤں میں ڈس الوژنمنٹ کی واردات کو بڑی خوبی سے بیان کیا۔اس افسانوی دنیا میں ایک ہی انسان بیک وقت کئی محاذوں پر لڑتا دکھائی دیا۔گھر سے باہر اور گھر کے اندر تمام افراد کئی مشکلات سے گھرے ہوئے ہیں۔اس افسانے کا مرکزی کردار اگر ایک طرف بیٹے کی ہجرت سے لڑتا ہے تو دوسری طرف اپنی ہی محنت کے خلاف چلنے والی ہواؤں سے برسرِ پیکار ہے۔اس کی زندگی میں موجود آئرنی کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی ایک نعمت ہے لیکن کیسی، کون سی اور کس سے آزادی؟ یہ وہ پوسٹ کلونیل سوال ہے جو آزادی اور تقسیم کے بعد ہر موڑ پر کھڑا نظر آتا ہے۔انگریز کے جانے سے غریب کسان کو آزادی کہاں ملی؟ وہ وڈیروں کے چکر میں پھنسا رہے گا۔طاقت اور استحصال تو صدیوں کا تسلسل ہے۔کمزور کسان اس استحصال کے شکنجوں سے کیسے نجات پا سکتے ہیں۔جہاں انسانوں کے ہاتھوں خدا کی خدائی اُتھل پتھل ہوتی ہے، وہاں غریب کمزور کسان اپنی قسمت سمجھ کر خاموش ہو جاتے ہیں اور بجو کے فصلوں کو بچانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔یوں تو بجو کا تحفظ کی علامت ہے۔لیکن افسوس یہ فصلوں کو پرندوں سے تو بچا سکتا ہے، مگر خود انسانوں سے بچانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔اس لیے کہ انسان سب سے خطرناک جانور ہے۔یہ کسی بھی رنگ کا ہو یا کسی بھی نسل کا، کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو، اس کی فطرت اس کے ماحول سے متشکل ہوتی ہے۔انسانیت کو سب سے بڑا خطرہ انسان ہی سے ہے۔

انگریز قوم جو روشن خیالی کی دعوے دار سمجھی جاتی تھی وہ بھی تقسیم سے پہلے کسانوں کی فصلوں سے اپنا حصہ وصول کرتی تھی اور اسی لیے واپس جاتے ہوئے پیچھے اپنے طرف داروں کو چھوڑ گئی۔ان طرف داروں نے طاقت کے بل بوتے پہ کمزوروں کو دونوں ہاتھوں سے خوب لوٹا اور دنیا کے کئی خطوں میں یہ عمل اب بھی جاری ہے۔ایسی صورت حال میں بے زبان، بے جان بجو کے محض علامت ہی بن کر رہ جاتے ہیں اور کبھی حقیقت کا روپ نہیں دھار سکتے۔

ایک سنجیدہ افسانہ نگار اپنے موضوعات کے تنوع سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ پرویز شہریار کے افسانوں کے تمام کردار حقیقی ہیں اور وہ خود کرداروں کی نفسیاتی گرہیں کھولتے نظر آتے ہیں۔یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ ان کے کرداروں کا تعلق ہر طبقۂ فکر سے ہے۔ان کی لوکیل، ان کے سماج میں موجود ثقافتی رویے اور ان کرداروں میں موجود بے اطمینانی اور ناآسودگی ہی ان کے افسانوں کا فوکس محسوس ہوتی ہے۔یہ افسانے ہمیشہ کسی خاص تناظر سے جڑے ہوتے ہیں۔

۔ نورالعین ساحرہ

پرویز شہریار کی کہانیاں

مشرف عالم ذوقی

''ہوتا ہے شب و روز تماشہ میرے آگے۔''

اس تماشائے تغیر میں روز ازل سے زندگی نئے نئے انقلابات سے گزرتی رہی ہے۔ اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اکیسویں صدی میں ہم اس مقام پر ہیں جہاں جدید سائنس و ٹکنالوجی نے ہمیں ایک ایسی عظیم کائنات کا سفیر بنا دیا ہے، جہاں ایک طرف حقیقت، معجزات اور فنتاسی کا فرق مٹ چکا ہے اور دوسری جانب یہ انسان لایعنیت اور طرح طرح کے بحران کا شکار ہے۔ یہ سوال لازمی ہے کہ ایک طرف یہ مہذب دنیا جدید سائنسی تقاضوں کے تحت مریخ میں بستیاں بسانے کے لیے فکرمند نظر آرہی ہے اور دوسری طرف ادب اور فکشن کے کاروبار میں اگر اس نئی تبدیل ہوتی دنیا کی آہٹ سنائی نہیں دے رہی تو یہ قصور کس کا ہے۔ اردو کا زیادہ تر فکشن اگر ابھی بھی مسلمانوں کے مسائل، پردہ، عورتوں کے مسائل اور موضوعات کی تاریک سرنگ سے باہر آکر نئی روشنی، عالمکاری اور ذرائع ابلاغ کی اس وسیع تر ہوتی دنیا سے روبرو، وابستہ ہونے یا سوالات قائم کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے تو یہ کس کی غلطی ہے؟ مشکل یہ کہ اردو تنقید کا نظام زیادہ تر ایسے انتہا پسند ناقدوں کے ہاتھ میں رہا جنہوں نے اپنی محدود روشنی سے شعر و فکشن کی دنیا کو نئے انقلابات سے دوچار ہونے کا موقع نہیں دیا۔ جبکہ آپ ان کے علمی و ادبی مقالات کا مطالعہ کریں تو دنیا کی تمام بڑی ادبی تحریکیں اور مغربی دانشوران کے اقوال زریں ان کے مقالے کا حصہ ہوتے ہیں۔ لیکن المیہ یہ کہ شعر و شاعری پر گفتگو ہوئی تو غالب و میر سے آگے نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ فکشن پر گفتگو ہو تو بات منٹو، بیدی، کرشن اور عصمت کے 'چار مینار' سے آگے نہیں بڑھتی ہے۔ شاعری ہو تو غالب و میر کی مثال کافی جبکہ فیض، میراجی، مخدوم، مجاز، اختر شیرانی، جگر، فانی سب نے اپنی اپنی روایتیں قائم کیں اور اس کے بعد بھی عرفان صدیقی، زیب غوری سے لے کر نعمان شوق، فرحت احساس اور عالم خورشید تک اپنی اپنی مثالیں قائم کر رہے ہیں لیکن ان پر گفتگو ہو تو غالب و اقبال کا ذکر کرنا ہمارے نقادوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی طرح فکشن پر گفتگو ہو تو ہمارا نقاد منٹو سے آگے بڑھنے کو تیار نہیں۔ جبکہ بلراج مینرا، قمر احسن، اکرام باگ، سریندر پرکاش، غیاث احمد گدی، اقبال مجید اور پاکستان کے بیشمار ناموں تک کئی کئی کہانیاں ایسی ہیں جہاں زوال پذیر معاشرہ سے لے کر نئے سماجی و تہذیبی ڈسکورس اور عوامل تک انسانی معاشرہ وار تقاء کی جو آہٹیں سنائی دیتی ہیں ان میں کسی اور کا حصہ نہیں لیکن المیہ یہ کہ ابھی بھی ان افسانوں کے ذکر کے ساتھ منٹو اور بیدی کو یاد کرتے ہوئے ان کی اہمیت مسخ کر دی جاتی ہے کہ شاید انہیں ابھی اور نروان یا روشنی کی ضرورت ہو۔ اس مقالے کا مقصد فکشن کی تنقید یا فکشن کی تعریف کے مقررہ ضابطوں سے انحراف نہیں، صرف یہ بتانا ہے کہ اگر مجھے پرویز شہریار کی کہانیوں پر گفتگو کرنی ہے تو یہاں منٹو، بیدی اور کرشن چندر کے ذکر سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ ایک 'بت' کا قصیدہ پڑھتے ہوئے جائزہ لیتے ہیں تو اکثر دوسرے کی خوبیاں ایک بڑے برگد کے سایہ میں گم ہو جاتی ہیں۔ ہم میں سے ایسے فنکار جن میں اپنے عہد سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت ہے، جو حالات حاضرہ سے باخبر ہیں اور عالمی پس منظر کے ساتھ ہی ترقی کے ہمہ جہتی سلسلوں پر بھی نظر ہے، اپنی وسعت فکر اور مطلوبہ نتائج سے اظہار و بیان میں سلیقہ اور مابعد جدید خیالات کو کہانی بنانے میں فوقیت حاصل ہے، پرویز شہریار کا نام آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ 'شجر ممنوعہ کی چاہ میں' پرویز شہریار کی کہانیوں کا تازہ مجموعہ ہے۔ یہاں ایک زوال پذیر معاشرہ سے الگ ان وجوہات پر غور و فکر کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے جہاں حیران کرنے والی نئی دنیا کے تصور کے ساتھ جنسی آزادی، نکسلائٹ موومنٹ، دہشت گردی، لیوان ریلیشن اور کنڈوم تہذیب کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ یہاں سیاسی دہشت پسندی کے غبار آلود مناظر بھی ہیں، اندیشہ اور وسوسوں کی خوفناک حد تک پھیلی ہوئی دھند بھی۔۔۔ یہاں عالمی تاریخ کی لامتناہی لہروں میں گھرا ہوا وہ معاشرہ بھی ہے، جو ترقی کے نعروں کے درمیان مشرق سے مغرب تک اجتماعی بے حسی کا شکار ہو چکا ہے۔ ایٹم بم، میزائلوں، نیوکلیائی ہتھیاروں کی ریس میں جہاں کوئی محفوظ نہیں مگر اس کے باوجود ایک نظام کی تبدیلی کے لیے کوئی موثر تدبیر نہیں۔ ایک قید خانہ جہاں طاقتور ممالک کے اپنے کھیل ہیں اور ایک ہم ہیں کہ اپنی آزاد اور بے حس دنیا میں چند خوشیوں کے عوض خود احتسابی سے بھی خوف کھاتے ہیں۔ شعور و فہم کو جھنجھوڑنے والے ہزاروں سوالوں کے درمیان ہمارا افسانہ نگار حیرت و خوف کا شکار کہ سائنس و ٹکنالوجی کے حیرت انگیز کارناموں، موت پر فاتح ہونے کی دلیلوں کے باوجود ہمارا سماجی معاشرہ جس تاریک کنویں کے تہہ خانے میں قید ہے، اس سے باہر نکلنے والے راستوں پر غور کیوں نہیں کیا جا رہا ہے۔؟ یہ خوفناک اشارے، یہ الجھے الجھے سوالات پرویز کی کہانیوں کا حاصل ہیں اور کم و بیش ان کی ہر کہانی ایسی ہی جنون خیز لہروں اور مبہم اندیشوں اور الجھے الجھے سوالات سے روبرو ہوتی نظر آتی ہے۔

'لیوان ریلیشن سے پرے' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''بھوک کی جبلت نے ان دونوں کو ایک کروڑ بیس لاکھ کی گنجان آبادی والے بڑے شہر میں ایک چھت کے نیچے ایک ہی کمرے کے اندر بلکہ ایک ہی بستر پر سونے کے لیے مجبور کر دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ بھوک چاہے ناف کے اوپر کی ہو یا ناف کے نیچے کی..... بھوک تو بھوک ہوتی ہے، جب لگتی ہے تو آدمی باغی ہو جاتا ہے۔ تہذیب و ثقافت کا سوال تو بہت بعد میں آتا ہے۔ آگ چاہے پیٹ کی ہو یا جسم کی سب سے پہلے اسے بجھانا ضروری ہو جاتا ہے۔''

یہاں دلی کا ذکر ہے جس کی آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔ کہانی کے آغاز میں ہی دلی کی بڑھتی آبادی کے ساتھ بھوک کا ذکر اس لیے بھی ضروری تھا کہ اس بھوک نے دلی کی تیزی سے بدلتی ہوئی تہذیب میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مصنف ان تبدیلیوں کو قریب سے دیکھ رہا ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں ہر روز یہاں آنے والوں کا قافلہ ہوتا ہے اور وہ بھی آتے ہیں جو چھوٹے شہروں کی زندگی کا

بوجھ اٹھاتے ہوئے یہاں آتو جاتے ہیں مگر یہاں آنے کے بعد نئی پرانی تہذیب کی کشمکش میں الجھ جاتے ہیں۔لیکن زندگی، روزگار اور کیریئر، آزادی کے بند دروازے کھول دیتا ہے۔یہی سیاہ فام شمبھوناتھ کے ساتھ ہوا۔اور نازک اندام پدمجا کے ساتھ بھی جو کیرل کے کیتھولک کرسچن فیملی سے تعلق رکھتی تھی۔آج کی دلی، جہاں عصمت دری کے تیزی سے بڑھتے واقعات روز کا حصہ ہیں، یہ خوف پدمجا کو بھی ہے اور اس کے لیے اسے ایک مرد کی ضرورت ہے۔ایک ایسا مرد جو اسے تحفظ دے سکے۔سوال یہ نہیں کہ سیاہ فام شمبھو اسے تحفظ دیتا ہے یا نہیں۔سوال یہ بھی نہیں کہ کہاں کیرل سے آئی ہوئی نازک اندام حسینہ اور بہار جیسے کسی علاقہ سے آیا ہوا شمبھو۔۔۔لیکن بڑے شہروں کی اپنی زندگی اور اپنی تہذیب ہوتی ہے۔یہاں تہذیبوں کے تصادم میں جس شئے کی حفاظت کرنی ہے، وہ ہے زندگی۔۔۔وہ زندگی جو خوابوں کے خاردار راستوں سے گزر کر ان دونوں کو دارالسلطنت میں لے آئی ہے۔اور یہاں لکشمی نگر سے ساؤتھ ایکس تک مختلف زندگیوں کے راستے اور کاروبار ہیں۔نوجوانوں کے لیے گھٹن اور قید سے الگ ایک آزاد معاشرہ ہے۔۔۔ویلنٹائن ڈے ہے اور محبتوں کے نئے رین بسیرے ہیں۔لیکن یہاں وہ خوفناک دنیا بھی ہے جسے نہ محبت راس آتی ہے اور نہ ویلنٹائن ڈے کا دن۔شمبھو اور پدمجا کی مجبوری تھی کہ وہ اکیلے فلیٹ کا کرایہ دینے سے مجبور تھے اور دراصل یہ مجبوریاں بھی لیوان ریلیشن یا بغیر شادی کے ایک ساتھ رہنے والے فلسفوں کو جنم دیتی ہیں۔اور اس تنہا دنیا میں اگر ویلنٹائن ڈے اور محبتوں کا بسیرا نہ ہو تو پھر زندگی ٹھہری ہوئی ندی کی طرح ہو جاتی ہے۔تین برس بعد جب ایک ساتھ رہتے ہوئے، پدمجا اچانک باہر جانے کا فیصلہ کرتی ہے تو شمبھو لرز جاتا ہے۔لیکن ایک قیامت خاموشی سے، پدمجا کے وجود سے بھی گزر جاتی ہے کہ شمبھو کے بغیر کی زندگی.....؟ اور وہ فیصلہ کرتی ہے کہ وہ نیویارک نہیں جائے گی۔وہ اسی اسٹوپڈ شمبھو کے ساتھ رہے گی۔

فکشن کی دنیا ہماری عام دنیاؤں سے ان معاملوں میں مختلف ہے کہ واقعات کو ہم تنگ نظری یا مذہب کی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔نئی ثقافت اور تہذیب کے بطن سے پیدا ہوئی سچائیوں کو محض پرانی قدروں، روایات کی بنا پر خارج نہیں کیا جا سکتا۔سماج و معاشرہ کی تشکیل نو میں اب اخلاقی پستی اور تہذیبوں کے زوال پر گفتگو محدود کر دینے سے اپنا ہی نقصان ہے۔انٹرنیٹ، فیس بک، گوگل سے برامدہ نئی دنیا خلا سے سیاروں تک اور نئی آبادیوں کی کھوج تک مسلسل نئی نئی دریافتوں اور نئے نئے کلچر سے گزر رہی ہے۔عام زندگی سے فلموں اور ڈراموں تک ہمارا واسطہ نئے نئے سوالوں سے ہے۔مذہب اور معاشرہ کے تحفظ کے طور پر بھی، اب ان سوالوں سے دور نہیں جایا جا سکتا۔اور اسی لیے پرویز شہریار شجر ممنوعہ کی چاہ، لیوان ریلیشن سے پرے، سہاگ کا خون جیسی کہانیوں میں آزاد ہوتی نسل پر غور کرتے ہوئے ضروری سوالیہ نشان چھوڑ جاتے ہیں۔مثال کے لیے، شجر ممنوعہ کی چاہ، میں وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا ازدواج کی عارضی ادلا بدلی سے فرسودہ رشتوں میں نئی بہار آجاتی ہے—؟ کیا اس سے پرانے رشتوں کی جڑیں مضبوط ہونے میں مدد ملتی ہے؟ کیا اس سے محبت کے بوسیدہ شجر پر نئی کونپلیں آجاتی ہیں؟ سوال ہے کہ وہ حادثے جو ہماری نئی دنیا یا تہذیب کا حصہ بنتے جا رہے ہیں، کیا اس سے فرار ممکن ہے—؟ بڑے شہروں میں کثیر جنسی سرگرمیوں کی آماجگاہ ایسے کئی کلب ہیں جہاں ازدواج کی ادلا بدلی کا کھیل چلتا رہتا ہے۔سوال یہ نہیں کہ محبت کے بوسیدہ شجر میں نئی کونپلیں پھوٹیں گی یا نہیں، سوال یہ ہے کہ نئی تہذیب، بہت سی مجبوریاں اور گلوبلائزیشن نے یہ تحفے ہمیں دیے ہیں۔کیا محض انکاری سے یہ کلب بند ہو جائیں گے؟ میں ان آزادیوں کی یا جنسی بے راہ روی کی وکالت نہیں کر رہا، لیکن موجودہ سماج و معاشرہ (مکمل نہ سہی) اگر اس نئی تہذیب کا حصہ بن رہا ہے تو ہمیں ان سوالوں سے گزرنے اور ایک دنیا کے تجربوں کو دیکھنے اور پرکھنے کا حق بھی حاصل ہونا چاہئے۔شجر ممنوعہ کی چاہ میں ایک بڑے مسئلہ کو اٹھاتے ہوئے پرویز کے قلم کا جھکاؤ مذہب کی طرف ہو گیا۔یہاں وہ پندرہ بیس برسوں میں تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا، نو آبادیاتی نظام، ملٹی نیشنل کمپنیز اور گلوبلائزیشن کے پھیلتے بڑھتے دائرے کو لے کر بھی نئے سوال قائم کر سکتے تھے۔سہاگ کا خون، میں یہی کہانی دیویانی کے ساتھ دہرائی گئی۔اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

''اچانک، اس کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر اسے امید کی ایک کرن سی نظر آئی جب اس کے شوہر نے ضلع گڑگاؤں میں ایک تانترک بابا کے پاس جا رہے تھے۔''تانترک بابا بہت پہنچے ہوئے منی تھے۔'' ایسا لوگ کہتے ہیں۔یہ بات دیویانی کے شوہر نے اسے بتائی تھی۔تانترک بابا اپنی تپسیہ اور سادھنیہ سے رات کی رات عورت کی گود ہری کر دیتے تھے۔یہ سب سن کر دیویانی بہت مسرور ہوا تھی۔''

''قصہ دراصل یہ تھا کہ دیویانی کے شوہر پردیپ پراشر نے انٹرنیٹ پر ایک سوپنگ کا معاہدہ کیا تھا۔اس معاہدہ کے تحت اسے گڑگاؤں کے اس شخص کے گھر ایک شب کے لیے تبادلہ ازدواج کرنا تھا۔ہوتے ہوتے انتظار کے لمحات آخر ختم ہوئے۔''

ایک اور اقتباس دیکھئے۔

''جب ایک قیامت سے وہ گزر چکی تو تانترک بابا نے ایک لخت اس کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے۔تبھی دیویانی نے گھنٹوں جمع ہونے والا بلغم نکال کے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا.....اس کے بعد بجلی کی سی سرعت سے وہ اٹھ کر اپنے شوہر کے پاس گئی تھی جو ڈرائنگ روم میں تانترک کی کھوسٹ بیوی کے ساتھ گھوڑے بیچ کر اطمینان سے سو رہا تھا۔تبھی دیویانی نے خنجر اٹھایا اور اس کے ننگے بدن کو آنِ واحد میں گود کے رکھ دیا تھا۔''

دیویانی کو خنجر اٹھانے کی ضرورت کیوں پڑی۔؟ خنجر سے کون ہلاک ہوا؟ ایک تانترک، اسکا شوہر یا وہ رویہ؟ جو ایک محدود طبقہ کی فکر بنتی جا رہی ہے۔کیا محض دیویانی کے خنجر اٹھانے سے مسئلہ ختم ہو جائے گا؟ پرویز شہریار کی خوبی ہے کہ وہ ان مسائل کو اپنی کہانیوں کا حصہ بناتے ہیں جو سرعت سے ہمارے معاشرے یا ہماری تہذیب میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔مگر سوالوں کی جگہ ان دو کہانیوں میں یا تو وہ مذہب کا سہارا لیتے ہیں یا پھر اس لعنت کو جڑ سے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔(دیویانی نے خنجر اٹھایا)—ابھی ان دردناک حقیقتوں سے گزرنے کے لیے، ٹھہر کر ادراک و شعور کی روشنی میں اس نظام کے جبر کو سمجھنے کی

ضرورت تھی۔ جن کی وجہ سے ایسے افکار وخیالات ونظریات ہماری نئی نسل کے لیے فکر کا باعث ہورہے ہیں۔ زندگی کے مختلف النوع تجربات کو سامنے لانے سے زیادہ ضروری ہے، بڑے سوال کا حصہ بننا اور اس کے لیے جذباتیت اور فوری نتائج سے گریز ضروری ہے۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ ان دو کہانیوں میں بھی وہ ان مسائل سے گزرے، جن پر دروازے ہمارے دوسرے ادیب دوستوں نے بند کر رکھے ہیں— 'لیوان ریلیشن شپ سے پرے' میں بغیر فرسودہ بحث کے وہ جس خوبصورتی کے ساتھ گزر گئے، یہ سلوک ان دو کہانیوں کے ساتھ قائم نہیں رہ سکا۔ پرویز کو کہانی کے انجام کی پرواہ نہیں کرنی ہے کیوں کہ وقار عظیم کے وقت سے چلتی ہوئی کہانی کی تعریفیں بھی وقت کے ساتھ بدل چکی ہیں۔ ایک سفاک دنیا، ایک بے رحم نظام ہمارے سامنے ہے اور فکشن کے لیے کسی چونکانے والے انجام یا آغاز کی اب کوئی ضرورت نہیں۔

ان کہانیوں کے علاوہ جرأت اور حوصلے کے ساتھ پرویز نے نکسل مومنٹ، سیلوا جڈوم اور دہشت گردانہ واقعات کو اپنی کہانیوں کا حصہ بنایا ہے۔ میں خصوصی طور پر ان کی کہانی سیلوا جڈوم کا ذکر کرنا چاہوں گا— ہم میں سے بیشتر شاید سیلوا جڈوم کے نام سے ہی واقف نہ ہوں۔ پرویز حالات حاضرہ پر گہری نظر اور گرفت رکھتے ہیں اور اسی لیے انہوں نے آدی واسیوں میں بڑھتی ہوئی غربت اور ناانصافیوں کو لے کر ہونے والی بغاوت اور سیلوا جڈوم سے وابستہ کرداروں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سیلوا جڈوم کے بارے میں عام رائے ہے کہ آدی واسیوں کے درمیان حکومت نے بھاڑے کے لوگوں کو ہتھیار تھما دیئے۔ مقصد یہ ہے کہ آپس میں ہی لڑ کر کٹ مر جاؤ۔ یہاں یہ سوال بھی ضروری ہے کہ نکسلیوں کی پیداوار، کس سسٹم نے کی—؟ بہت پہلے اس موضوع پر خواجہ احمد عباس نے ایک فلم بنائی تھی۔ نکسلائٹ۔ اور اس فلم کا خاتمہ اس بات پر ہوا تھا کہ موجودہ سسٹم کی خرابیوں سے یہ نکسلائٹ بار بار اس زمین پر پیدا ہوتے رہیں گے۔ اگر ہمارے ملک کے یہ شہری اپنی زمین، اپنا جنگل، اپنا علاقہ، اپنا حق چاہتے ہیں تو آخر کیا مجبوری ہے کہ انہیں ہاتھوں میں ہتھیار اٹھانا پڑتا ہے—؟ چھتیس گڑھ کے بستر جیسے علاقوں میں اگر باغیوں کی تعداد بڑھی ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اس لڑائی کا خوفناک پہلو یہ ہے کہ دارالسلطنت میں بیٹھ کر اس لڑائی پر سیاست کی جاتی ہے۔ بستر میں مہندر ورما کے قتل کے بعد سیلوا جڈوم کو لے کر سیاست میں اور تیزی آگئی تھی۔ مہندر ورما یہ تسلیم کرتے تھے کہ نکسلیوں کی طاقت ان کی بندوق میں نہیں، نیٹ ورکنگ میں ہے۔ سیلوا جڈوم نکسلیوں کی اس نیٹ ورکنگ کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دراصل اسی نیٹ ورکنگ نے تاریخ کو شمال، آسام، چھتیس گڑھ اور دہشت گردی کو نئے ہتھیار دیے۔ حکومت کی ناکامیاں دراصل ایسے سسٹم کی وجہ بنتی ہیں۔ پرویز نے کہانی کے آغاز میں اس سسٹم کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

''حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کو پھیلانے والے مشن کو سیلوا جڈوم کا نام دیا گیا تھا جس کے معنی وہاں کی مقامی گونڈی بولی میں امن مشن کے ہوتے ہیں۔ جب ملک کے چند بہت ہی اہم غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) نے مل کر اس کے خلاف ایک زبردست تحریک چلائی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سپریم کورٹ نے آخر کار ریاستی حکومتوں کے اس بے تکے معاملے میں مداخلت کرتے ہوئے اسے فی الفور ختم کرنے کا حکم دے دیا تھا۔''

اور اسی لیے مہندر ورما کے قتل پر یہ بھی کہا گیا کہ دلی کی سیاست جیت گئی اور سیلوا جڈوم (امن مشن) کی ہتیا ہوگئی۔ نکسلائٹ موومنٹ اور اس سے وابستہ لوگوں کو محض مجرم گرداننا صحیح نہیں ہوگا۔ ابھی دو تین برس قبل مشہور صحافی اور ناول نگار ارون دھتی رائے نے ایسے لوگوں سے ملاقات کی تھی جو جنگل کی ویرانیوں میں حکومت اور پولس کی دہشت کے درمیان زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان میں کافی پڑھے لکھے لوگ بھی ہیں۔ کم عمر کی لڑکیاں بھی ہیں۔ ان کی پوری زندگی جنگل میں ہی آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے گزر جاتی ہے۔ حکومت اور پولیس انکا محاصرہ کرنے میں اکثر ناکام رہتی ہے۔ اور خوف ودہشت کے سائے میں اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے لیے اکثر فوجی اور حکمرانوں کی گاڑیوں پر حملہ بول دیتے ہیں۔ یہ مسئلہ نازک بھی ہے اور سنگین بھی اور دور دور تک اس مسئلہ کا حل نکالنے کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔ مجھے خوشی ہے کہ پرویز شہریار نے اس موومنٹ اور موومنٹ سے وابستہ افراد اور ان کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ بیہڑ اور جنگلوں میں رہنے والوں کو مافیاؤں سے خطرہ ہے جو ان کا جنگل چھین رہے ہیں۔ جنگل ایک علامت ہے جس نے صدیوں سے ان آدی واسیوں کو پناہ دے رکھی ہے۔ پرویز شہریار نے ایک ماہر کیمرہ مین کی طرح ان آدی واسیوں کی زندگی میں جھانکنے اور اترنے کی کوشش کی ہے۔ اب کہانی کی یہ شروعات ملاحظہ ہو۔

''سپریم کورٹ کا ایک فرمان جاری ہوا تھا، جس کے مطابق چھتیس گڑھ کی ریاستی حکومت ماؤنوازوں سے نمٹنے کے لیے اسپیشل پولیس آفیسر کے نام پر ان پڑھ اور معصوم آدی واسیوں کے ہاتھوں میں ہتھیار دے کر انہیں ماؤنوازوں کے خلاف جنگ میں جھونک رہی تھی جو قانون کی نظر میں جرم تھا اور اس سے حقوق انسانی کی سخت خلاف ورزی ہو رہی تھی۔''

ماؤنوازوں کے خلاف حکومت کی مہم میں نہتے آدی واسی نوجوان بڑی تعداد میں مارے جارہے تھے۔ یہ کہانی 'میں' سے شروع ہوتی ہے۔ یہ میں دراصل افسانہ نگار ہی ہے جو پہاڑ، جنگل اور آدی واسیوں سے واقف ہے۔ افسانہ نگار ایک بار پھر ان علاقوں کی ڈسکوری کے لیے نکلتا ہے۔ یہاں پرویز نے کمال کی عکاسی کی ہے۔

''آنکھ جب کھلی تو ڈھک ڈھک..... ڈھک ڈھک..... کی مسلسل آواز آرہی تھی۔ شہر کے لوگ سورج چڑھنے کے بعد آرام سے بستر استراحت سے اٹھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ بالکل اس کے برعکس تھا۔ ڈھک ڈھک، ڈھک ڈھک کی ایک اکتا دینے والی آواز سے آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ الٰہی یہ کیا ماجرہ ہے؟ پھر صبح ہوئی تو تجسس اس قدر بڑھ گیا کہ متصل مکان کے آنگن میں آنکھیں ملتا ہوا جا کر اکڑوں بیٹھ گیا، جہاں سے متواتر ایسی غیر

مانوس سی آواز آرہی تھی۔معلوم ہوا کہ منہ اندھیرے اٹھ کر ڈھیکی میں دھان کوٹا جارہا ہے۔اس کٹے ہوئے چاول کو بانس کے سوپ میں چن پھٹک کر اندھیرے میں ہی پکانے کے لیے مٹی کی ہانڈی میں لکڑی کے چولہے پر چڑھا دیا جاتا ہے۔مزدور کسان آگ میں بھنی ہوئی سوکھی مرچ اور نمک کے ساتھ اس لال چاول کے بھات کو پیٹ بھر کے کھانے کے بعد اپنے اپنے کام پر نکل جاتے ہیں۔مرد مزدوری کرنے نکل جاتے ہیں۔لڑکے اسکول چلے جاتے ہیں۔جنہیں کرسچن مشنری کے اسکولوں میں نہیں جانا ہوتا ہے وہ مویشیوں کو چرانے کی غرض سے گھر سے نکل جاتے ہیں اور عورتیں لکڑیاں کاٹ کر لانے کے لیے پہاڑوں کی طرف رخ کرتی ہیں۔ان کے ہاتھوں میں لوہے کا چاپڑ، مونج کی رسی اور کپڑے کا بیڑا ہوتا ہے۔صبح گھر سے ایک قطار میں یہ عورتیں نکل جاتی ہیں راستے بھر کوئی حوصلہ افزا اور محنت کی تائید میں کوئی لوک گیت گاتی ہوئی پہاڑیوں پر چڑھ جاتی ہیں۔اور دن ڈھلنے سے پہلے پہلے واپس اپنے گھروں کو لوٹ آتی ہیں جب یہ واپس آتی ہیں تو دو ڈھائی من لکڑی کا گٹھرا ان کے سروں پر ہوتا ہے، جنہوں سوکھنے کے بعد ان کے مرد بیل گاڑیوں پر لاد کے شہر لے جاتے ہیں اور انہیں بیچ کر واپسی میں گھر کے لیے روزمرہ کے سودا سلف خرید کر لیتے آتے ہیں۔شام تک چرواہا اسکولوں سے بچے اور چراگاہوں سے مویشی بھی گھاس چر کے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آتے ہیں۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے آدی واسیوں کی جدوجہد سے پر زندگی کو سمجھا جاسکتا ہے۔کہانی میں ایسی بہت سی جزئیات شامل ہیں جن سے آدی واسی کلچر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔مصنف کو اس سفر میں 'میں' اونگا کی یاد آتی ہے۔اونگا جس کے پاس غیر معمولی جادوئی طاقت تھی۔اونگا میں انسانی ہمدری کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔اونگا سے پہلی ملاقات ہوئی تو اس کے پاس فزکس کی ایک کتاب تھی۔وہ نوکری کرنا چاہتا تھا مگر اس سچ سے واقف تھا کہ اسے نوکری نہیں ملے گی۔ اونگا کو نوکری نہیں ملی اور وہ سیلوا جڈوم کا ایک حصہ بن گیا۔جنگل میں مافیاؤں کا قبضہ تھا۔آدی واسی اور مافیاؤں کے درمیان اکثر گولیوں اور تیروں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔اور اسی لیے امن مشن کے نام پر پولیس میں پر مائینٹ بھرتی کا جھانسہ دے کر معصوم آدی واسیوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا اور انہیں ماؤنوازوں کے خلاف جنگ میں جھونک دیا گیا۔لیکن اونگا اس بات سے واقف تھا کہ۔

''کھدان مافیا ہمیں جینے نہیں دیں گے۔'' کچھ توقف کے بعد اس نے کہا۔''پولیس ہمیں مرنے نہیں دے گی۔''''ہم نے ان سے بھی دشمنی مول لی ہے۔'' ماؤوادی بھی ہم سے دشمنی نکالیں گے۔کیونکہ ہم میں سے زیادہ تر ایسے نوجوان ہیں جو ماؤوادی سنگھٹن چھوڑ کے سیلوا جڈوم بنے ہیں۔انہیں ہم سے خطرہ ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اشارے پر ہی ان کے خفیہ ٹھکانوں پر چھاپے مارے گئے تھے اور ہزاروں ماؤوادیوں کی اب تک جانیں جاچکی ہیں۔پولیس ہم سے ماؤ وادیوں کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں پوچھے گی اور ماؤوادی سمجھیں گے کہ ہم پولیس کے مخبر ہیں۔''

آپ غور کریں تو یہ مکمل منظرنامہ غربت وافلاس کی مار سہتی ہوئی اس نسل کا ہے، جو جنگلوں کی ویرانیوں میں قید ہیں۔ایک وہ بھی ہیں جو ہتھیار اٹھا کر اس سسٹم کے خلاف تو لڑ رہے ہیں مگر آہستہ آہستہ یہ دہشت گردی ان کے ماضی وحال ومستقبل کا حصہ بن جاتی ہے۔آزادی کے بعد بھی جھارکھنڈ سے چھتیس گڑھ تک نکسلیوں کے مسائل پر حکومت نے کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ہاں حکومتیں ان کی بغاوت کو دبانے کے لیے، ان کے اپنے گھر سے ہی باغیوں کی جماعت پیدا کرنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔اور یہی اونگا کے ساتھ ہوا۔اونگا کے پاس جنگل بھی تھا اور سائنس کی کتاب بھی— لیکن نہ جنگل اس کا ہوا اور نہ سائنس کی کتاب کام آئی۔ بندوق سے نکلی ہوئی ایک گولی نے ایک آدی واسی نوجوان کو ڈھیر کردیا— سوال یہ نہیں کہ اونگا کیوں مارا گیا؟ سوال یہ ہے کہ کیا ناپاک سیاست کے جلوے مستقبل میں ایسے 'اونگاؤں' کو پیدا نہیں کریں گے؟ فکشن نگار بہتر طور پر مسائل کی مختلف صورتوں سے گزرتا ہے اور سوال قائم کرتا ہے۔پرویز شہریار نے آدی واسی زندگی کی خوبصورت عکاسی کے ساتھ آدی واسیوں کے مسائل کو سمجھنے کی بھی کامیاب کوشش کی ہے۔

کہانی کے آخر میں ڈھابہ میں کھانا کھاتے ہوئے میں کی ملاقات ایک پراسرار شخص سے ہوتی ہے جو خود کو پروفیسر بتاتا ہے اور اس کے سگریٹ پر چائنیز میں کچھ لکھا ہوا ہوتا ہے۔ضلع بستر کے دور دراز علاقے میں واقع ایک چھوٹے سے گاؤں میں چین کا سگریٹ کہاں سے آگیا؟ یہ گتھی اس وقت بھی نہیں سلجھی جب اونگا کے مارے جانے کی خبر آتی ہے۔افسانہ نگار جہاں نکسلائٹ موومینٹ، حکومت کے طور طریقوں اور سیلوا جڈوم میں شامل ہوئے معصوم آدی واسیوں کا ذکر کرتا ہے، وہیں میڈان چائنا سگریٹ کا ذکر اس بحران کی طرف اشارہ کردیتا ہے کہ بہت کچھ باہر سے اسپونسر ہورہا ہے۔اور ایسا نہیں ہے کہ حکومتیں ان حقیقتوں سے واقف نہیں۔لیکن سیاسی جماعتوں اور سیاست کے ٹکراؤ میں کسی کی جان جارہی ہے تو وہ اونگا جیسے معصوم ہیں اور ان معصوموں کی خبر لینے والا کوئی نہیں۔

انسانی زندگی کے مصائب اور محرومیوں کی کہانیاں خلق کرنے والے پرویز شہریار نے کم ہی لکھا ہے لیکن اس کے باوجود ان کی کہانیوں میں حالات حاضرہ کے تعاقب کے ساتھ نئی دنیا اور نئے مسائل کو سمجھنے اور پرکھنے کی آزادی نظر آتی ہے۔کسی بھی فنکار کے پاس زندہ رہنے کے لیے کئی شاہکار نہیں ہوتے۔کہانی کار عموماً اپنی دو ایک تخلیق سے ہی جانا جاتا ہے۔پرویز شہریار نے سیلوا جڈوم اور لیو ان ریلیشن سے پرے، لکھ کر اپنا نام مضبوطی سے ہندوستان کے موجودہ اہم فکشن نگاروں میں درج کرالیا ہے۔جب بھی موجود ہندوستانی اردو فکشن کا ذکر آئے گا، ان دو کہانیوں کا ذکر بھی آئے گا۔پرویز شہریار ایسے فنکار ہیں جن کی سوچ کا دائرہ وسیع ہے۔مجھے یقین ہے، اکیسویں صدی کے تماشائے تغیر اور نئے انقلاب کے بطن سے، مستقبل میں ان کے قلم سے اور بھی بڑی کہانیاں سامنے آئیں گی۔ابھی انہیں اپنے ہی دائروں کو توڑنا ہے۔نئی دنیا کے تصور اور نئے فلسفوں کو رقم کرتے ہوئے بغیر کسی بندش اور دباؤ کے، اپنی ذاتی آزادی کا اعلان بھی کرنا ہے۔کیونکہ ادیب مبلغ نہیں ہوتا اور مذہبی راہنما بھی نہیں۔

پرویز سے شہریار تک

پروفیسر ابن کنول
(دہلی)

انسانی عمر میں سولہ سال کی عمر کو انتہائی خطرناک موڑ کہا گیا ہے۔ داستانوں میں چودہ سولہ سال کی عمر ہی میں تمام حادثات پیش آتے تھے یعنی عمر کے یہ دو تین سال آدمی کی زندگی کو بگاڑنے یا سنوارنے کے ہوتے ہیں۔ مستقبل کا انحصار عمر کے اسی حصے پر ہے۔ پوت کے پاؤں پالنے سے باہر نکلیں گے یا پالنے میں رہیں گے اس کا فیصلہ اسی مدت میں ہوتا ہے۔ محرران جادو تحریر نے لکھا ہے کہ پورب کے شہر جمشید پور میں بیسویں صدی کی ساتویں دہائی کے چوتھے برس کی ابتدا میں ایک حسین وجمیل بچے کی ولادت ہوئی۔ مولوی، نجومی، پنڈت حاضر ہوئے۔ بعد غور وخوض کے عرض کیا: صاحبزادے کا چندر ماں بلی ہے۔ جاہ وحشم ومرتبہ اعلیٰ رہے گا، سولہویں برس میں مستقبل کا فیصلہ ہووے گا۔ شہریا کہلاوے گا، چاروں دھام دھوم مچے گی۔ یہ سن کر قاضی پور کے شہاب الدین پریشان ہوئے کہ سولہویں برس میں اس بچے کے ساتھ کہ جس کا نام بڑے پیار سے پرویز احمد رکھا ہے گیا۔ ہوا یوں کہ سولہویں برس لگتے ہی پرویز احمد نے قلم ہاتھ میں لے کر چمبل کی دسویں رانی کو قلمبند کرلیا۔

چمبل کی دسویں رانی کو قلمبند کرتے ہی الف لیلیٰ کا شہریار ہوگیا، قصہ گوئی کی طرف رغبت ہوئی، شہریار بننے کے بعد ''بڑے شہر کے خواب'' دیکھنے لگا۔ اور ''نیا سورج اور نیا سویرا'' تلاش کرنے لگا۔ سولہ سال کی عمر میں نقاب پوش پرویز احمد بے نقاب ہوکر ''شجرہ ممنوعہ'' کی چاہ میں سفر پر نکل پڑا۔ نجومیوں کی بات سچ ہوئی چاروں دھام دھوم ہوئی۔ ملک اور بیرونِ ملک سے شہریار کی قصہ گوئی کے قصے بیان ہونے لگی۔ پھر اس قصہ گو نے وطن عزیز سے ہجرت کی اور ہند کے دارالخلافہ میں قیام کیا۔ ''بڑے شہر کا خواب'' پورا ہوا۔

پھر ایک دن ایک محفل روپ میں جب اس خوبرو قصہ گو سے میں روبرو ہوا تو میں نے استفسار کیا۔

''اے نوجوان تم کون ہو؟''

سروقد نوجوان نے انتہائی رعب واحترام سے کسی حافظ کی طرح بیان کیا:

''میرا نام سید پرویز احمد ولد شہاب قاضی پوری، قلمی نام پرویز شہریار تاریخ پیدائش 10 جنوری 1964 جائے پیدائش جمشید پور، وطن قاضی پور (شاہ آباد اور موجودہ سکونت نئی دہلی ہے۔ میں نے آر۔ ڈی۔ ٹاٹا ہائی اسکول سے میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ جمشید پور کوآپریٹیو کالج سے آئی ایس سی۔ ریاضی سے کی اور بی اے (انگریزی آنرز) کی ڈگری فرسٹ ڈویژن سے حاصل کی۔ ایم۔ اے اور ایم۔ فل جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے اردو میں کیا۔ اور پی ایچ ڈی کی ڈگری دہلی یونیورسٹی سے حاصل کی''۔

مجھے داستان 'شیریں فرہاد' کے خسرو پرویز اور الف لیلیٰ کے شہریار کی یاد آئی۔ وجاہت اور نفاست کے اختلاط نے پرویز احمد کو پرویز شہریار بنا دیا تھا۔ شاہانہ تمکنت خسرو پرویز کی تھی اور قصہ گوئی سے دلچسپ شہریار سے لی تھی۔ پرویز شہریار کو دیکھ کر اور گفتگو کرنے کے بعد داستانوں کے شاہزادے یاد آتے ہیں اس لیے میں نے بھی تمہید میں یہ انداز اختیار کیا۔

اردو میں بہت سے ادیب اور اساتذہ ایسے ہیں جن کے والدین نے بچوں کو کچھ اور بنانا چاہا تھا لیکن بن کچھ اور گئے۔ پرویز شہریار کی کہانی بھی کچھ مختلف نہیں۔ بی اے انگریزی میں کیا اور ایم اے اردو میں۔ یعنی چلے تھے مغرب کی طرف پہنچے مشرق میں۔ یہ دراصل صوبہ بہار کی اردو دوستی کے سبب ہے۔ بہار کے خمیر میں اردو ہے۔ پرویز شہریار کا تعلق جھارکھنڈ سے نہیں بہار سے ہے، وہ بہار میں پیدا ہوئے۔ اپنے وطن کو جھارکھنڈ جیسے غیر شاعرانہ نام کے صوبے میں جانے سے قبل وطن کو چھوڑ دیا۔ وطن چھوڑ دیا لیکن خدا جانے کیوں وہ اپنے استاد کی گیارہویں نمبر کی بیٹی کو نہیں بھولے۔ میں اس کی بھی وضاحت کرنے سے معذور ہوں کہ وہ استاد کو چائے اور تنوری روٹی کہانی سننے کے لالچ میں کھلاتے تھے یا کچھ اور سبب تھا۔ بہرحال یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ یہ تو ان کی صاف گوئی ہے کہ انھوں نے سب کچھ سچ سچ بیان کردیا ہے۔ لوگ اپنی کتابوں میں ہر بار نیا پیش لفظ لکھ کر اپنی بڑائی کرتے ہیں، وہ بار بار نئے نئے الفاظ تراش کر اپنی قصہ خوانی نہیں کرتے بلکہ ایک ہی ''گفتنی'' کو ہر بار لفظ بہ لفظ ہر کتاب میں شامل کردیتے ہیں۔ بلکہ گفتنی کی بھی اصل زینت شہریار کی تحریر ہے۔ تحقیق کے ایک طالب علم نے کہا:

''جناب آپ پرویز شہریار کو جانتے ہیں؟''

میں نے طالب علم کو دیکھا اور کہا:

''جی! جس نے 'بڑے شہر کا خواب' دیکھا، 'بھوک کی حمایت' کرتے ہوئے 'شجرِ ممنوعہ کی چاہ میں' گھر بار چھوڑا اور جس نے منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور تلاش کیا، بیدی کی ایک میلی سی چادر کو سنبھال کر رکھا''۔

طالب علم میرے لہجہ کو دیکھ کر کچھ گھبرایا اور انتہائی سہمے ہوئے لہجہ میں کہنے لگا

''جی! جی! سر یہ تو میں سب جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ این سی ای آر ٹی میں ایڈیٹر جنرل ہیں اور کچھ عرصہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان میں پبلی کیشنز آفیسر بھی رہے ہیں''۔

''جب تم جانتے ہو تو پھر مجھ سے کیا معلوم کرنا چاہتے ہو۔ بھئی وہ شاعر بھی ہیں افسانہ نگار بھی اور ناقد بھی۔ افسانوں کی، شاعری کی اور تنقید کی کئی کتابیں شائع ہوگئی ہیں۔ جوانی میں شب خون کے لیے تجریدی اور علامتی افسانے بھی لکھے۔ جوانی میں لوگ غلط راہ اختیار کر ہی لیتے ہیں لیکن اگر صبح کا بھولا شام کو

گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ پرویز شہریار جلد ہی راہ راست پر آگئے۔ تب ہی تو چاروں دھام دھوم اُن کی مچی۔ برصغیر کے موقر رسائل اور جرائد میں نظر آتے ہیں۔ ادبی محفلوں کی رونق بنتے ہیں۔ کچھ اور جاننا چاہتے ہو''۔

میں نے اس کی سوالیہ آنکھوں کو محسوس کرتے ہوئے۔

''جی! سر ایک بات معلوم کرنی تھی'' طالب علم خدا جانے کیا پوچھنا چاہتا تھا۔ ''ارے بھئی! پرویز شہریار کے بارے میں معلوم کرنا ہے تو ان کی کوئی بھی کتاب اٹھالو اور گفتنی پڑھ لو''۔

''سر یہی معلوم کرنا ہے۔ سرقہ کسے کہتے ہیں؟''

''کیا مطلب؟ پرویز شہریار سے سرقے پر آگئے'' مجھے اس سوال پر حیرانی ہوئی۔

''سر میں نے پرویز شہریار کی سب کتابیں دیکھی ہیں۔ بڑے شہر کا خواب میں کسی زینت شہریار نے ان کا تعارف کرایا ہے''۔

''ہاں کرایا ہے۔ تو آپ کو کیا پریشانی ہے؟''

''سر ان کی دوسری کتابوں میں جو گفتنی کے نام سے پرویز صاحب کا لکھا پیش لفظ ہے وہ زینت شہریار کی تحریر کا چربہ ہے۔ یہ تو سرقہ ہوا''۔

طالب علم کی اس بات پر میں مسکرایا اور کہا'

''دیکھو زینت شہریار ان کی شریک حیات ہیں اور میاں بیوی کے درمیان یہ سرقیت ہوتی رہتی ہے۔ بیوی میاں کی جیب سے پیسے نکالتی ہے تو کیا وہ سرقہ کہلائے گا''۔

طالب علم سر کھجاتے اور شرماتے ہوئے کہنے لگا:

''سر مجھے اس کا تجربہ نہیں''۔

''اب تم جاؤ اور پرویز شہریار کی کتابیں پڑھو''

طالب علم چلا گیا۔ میں سوچنے لگا کہ لوگ کتنی گہرائی سے سوچتے ہیں اور باریکی سے دیکھتے ہیں۔ اس بات کا انحصار ادیب یا شاعر کی شخصیت پر بھی ہے۔ بعض اچھے ادیبوں اور شاعروں کو دیکھ کر ملنے کو جی نہیں چاہتا اور بعض خوش لباس اور خوش گفتار ادیبوں سے بار بار ملنے کی خواہش ہوتی ہے۔ پرویز شہریار کی شخصیت بھی ایسی ہی ہے۔ ایک بار ملنے کے بعد بار بار ملنے کو دل چاہتا ہے۔ اس لیے کہ وہ خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش لباس بھی ہیں اور خوش گفتار بھی۔ ادب کی باتیں کرتے ہیں فضول باتوں سے گریز کرتے ہیں۔ میرا تو یہی تجربہ ہے اور پرویز شہریار کے بارے میں یہی رائے ہے۔ آپ کی رائے کیا ہے یہ آپ جانیں۔

۔ فرضِ اولیں ۔

جہاں تک پرویز شہریار کی افسانہ نگاری کا تعلق ہے تو میں نے اُن کے افسانے پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وہ سعادت حسن منٹو کی افسانہ نگاری سے کافی متاثر ہیں اور متاثر بھی کیوں نہ ہوتے جبکہ انھوں نے منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور کے موضوع پر ایم۔فل کا مقالہ لکھا ہے۔ عورت، مرد، جنس، سماجی اقدار، انسانیت، بھائی چارہ اور سائنسی و تکنیکی ترقی میں آج کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اُن تمام اقدار و روایات کا جنازہ نکال رہے ہیں جن کے پاس و لحاظ سے معاشرے میں امن و سلامتی، شرم و حیا، احترام آدمیت اور ایک طرح کا خوشگوار ماحول قائم رہا کرتا تھا۔ پرویز شہریار نے ان موضوعات پہ اپنا تخلیقی بیانیہ اُستوار کیا ہے۔ مجھے یہ جان کر انتہائی مسرت ہورہی ہے کہ پرویز شہریار کے تازہ افسانوں کے مجموعہ ''شجر ممنوعہ کی چاہ میں'' کے بارے میں نہ صرف ملکی سطح کے مقتدر تخلیق کاروں نے تحریری طور پر اظہار خیال کیا ہے بلکہ سین علی (جدہ سعودی عربیہ) سلمٰی جیلانی (نیوزی لینڈ) ناصر صدیقی (کراچی پاکستان) جاوید مرزا (کینیڈا) اور وحید قمر (برطانیہ) جیسے بیرونی ممالک میں رہائش پذیر اہل نقد و نظر نے بھی اپنے اپنے تاثرات سے مذکورہ مجموعہ کی زینت بڑھائی ہے۔ ''شجر ممنوعہ کی چاہ میں'' شامل افسانے ایک دو افسانوں کو چھوڑ کر بقیہ تمام افسانے کافی طویل ہیں۔ میرے نزدیک طویل یا مختصر افسانہ لکھنا یا پڑھنا کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ میں تو دوران قرأت اس چاہ میں رہتا ہوں کہ کوئی کہانی (طویل یا مختصر) مجھے کس حد تک متاثر کرتی ہے، اُس میں فنی لوازمات کے التزام کے ساتھ کتنی صداقت و آفاقیت موجود ہے۔ مانا کہ عصری سماج و معاشرت میں طویل کہانیاں لکھنے اور پڑھنے کا رواج بہت حد تک ختم ہو چکا ہے۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ دراصل کہانی طویل یا مختصر اپنے موضوع کی بنیاد پہ ہوتی ہے۔ موضوع جتنا اہم اور بڑا ہوگا کہانی اُسی کی بنیاد پر طویل ہوگی۔ یہی بات ناول نگاری پر بھی صادق آتی ہے۔ میں وثوق سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ پرویز شہریار اپنی طویل کہانیوں میں جھول پیدا نہیں ہونے دیتے۔ کہانی میں واقعاتی ربط و تسلسل برقرار رکھنا، کرداروں کی نقل و حرکت اور مکالماتی لمحوں میں مختاطی برتنا آغاز و انجام میں تحیر و تجسس یہ تمام عناصر و عوامل جب فنی ترتیب کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچتے ہیں تو یقیناً جاندار کہانی وجود میں آتی ہے جو قاری کے ذہن و دل کو جھنجھوڑتی ہے اور اُسے متاثر کرتی ہے۔ پرویز شہریار کے افسانوں کا ایک اختصاصی پہلو جس نے مجھ جیسے کم علم اور ادبی زبان کے رسیا کو بہت زیادہ متاثر کیا وہ اُن کے افسانوں کی لفظیات ہے۔ زبان و بیان کے معاملے میں اُنھوں نے نہایت سنجیدگی سے کام لیا ہے۔ ایک تخلیق کار کو زبان و بیان کے برتاؤ کے معاملے میں نہایت چوکنا رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کس لفظ کے قاری کیا معانی نکالے گا اور اُس کی سائیکی پر کیا اثر پڑے گا۔ دوران تحریر اس بات کا خاص دھیان رکھنا ایک سنجیدہ کہانی کار کا فرضِ اولیں ہے۔

۔ ڈاکٹر مشتاق وانی

- افسانہ -

دس سروں والا بجوکا

پرویز شہریار

یہ اُس وقت کی بات ہے کہ جب پریم چند کی کہانی کا 'ہوری' پچہتر سال کا ہو چکا تھا۔ سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ چونکہ وہ ایک کسان کا بیٹا تھا، اس لیے ہاتھ پاؤں کے پٹھے اور عضلات اب بھی صحیح سلامت تھے۔ البتہ اب وہ اونچا سننے لگا تھا۔ افرادِ خانہ کا خیال تھا کہ باپو اپنے مطلب کی بات بہت جلدی سن لیتے ہیں لیکن جس میں ان کا کوئی فائدہ نہ ہو وہ بات انھیں سنائی نہیں پڑتی، چاہے ان کے آگے ہم اپنا کتنا بھی گلا کیوں نہ پھاڑ لیں۔

دریں اثنا، ہوری کا بیٹا گوبردھن پڑھ لکھ کر دہلی آئی آئی ٹی میں پروفیسر ہو گیا تھا۔ سونا اور روپا بھی اپنی اپنی سسرال سدھار چکی تھیں۔ اس کے بیٹے نے ہوری کو بہت سمجھایا تھا کہ زمانہ بدل چکا ہے اب کھیتی باڑی چھوڑ کے وہ بھی شہر میں آ کر آرام سے رہے اور زندگی کے بقیہ دنوں کا لطف اُٹھائے۔ گوبردھن ہوری کو اپنے ساتھ رکھنے کو تیار تھا، لیکن ہوری نے اس کی ایک نہ سُنی۔

''ماٹی ہمارا جیون ہے۔'' ہوری نے کہا تھا۔ ''اس سے جنموں کا ناطہ ہے۔ اسے ایک دم سے ہم کیسے چھوڑ دیں۔''

بچے بے بس تھے۔ انھوں نے ہوری اور دھنیا کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ وہ اپنے اپنے بچوں کے کریئر کو لے کر فکر مند تھے۔ ان کے اپنے مسائل تھے۔ انھیں اپنے بچوں کی خوشیاں بھی عزیز تھیں۔

دراصل، گاؤں اور شہر کے معیارِ زندگی میں بڑا فرق آ چکا تھا۔ نشست و برخاست کے آداب میں بڑا بدلاؤ آ گیا تھا۔ شہر میں گوبر کا اپنا ایک رُتبہ تھا، ایک حیثیت تھی۔ اُس کے احباب کا ایک اچھا خاصا حلقہ تھا۔

کہتے ہیں کہ بیٹا اگر اپنے دوستوں سے اپنے باپ کا تعارف کراتے ہوئے شرمائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ خاندان ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ہوری اور دھنیا جب کبھی اپنے بیٹے کے یہاں جاتے تو ان کے دوستوں کی آمد پر انھیں گھر کے اندرونی کمروں میں منتقل کر دیا جاتا تھا، مبادا مہمان ان دیہاتوں کو دیکھ کر ان کا تمسخر نہ اُڑائیں۔

یہ بات ہوری کو اندر سے کھائے جاتی تھی اور اسے ایک ہتک سی محسوس ہوتی تھی۔ اس بار ہوری اور دھنیا شہر گئے تو جلدی ہی گاؤں واپس لوٹ آئے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ فصل کی کٹائی کا وقت نزدیک آ گیا تھا۔ گاؤں آتے ہی انھیں بڑی راحت محسوس ہوئی تھی۔ گاؤں میں انھیں ہر طرف شناسا چہرے نظر آتے۔ لوگ باگ آ کر ہوری کاکا سے ان کا حال چال پوچھتے۔ یہ سب ہوری کو اچھا لگتا تھا۔ ''یہاں کتنی اپنائیت ہے، لوگوں میں۔ گاؤں کی مٹی تک سے پاؤں مانوس ہیں۔'' ہوری نے سوچا۔ ''اجنبی دھرتی پر قدم لڑکھڑانے سے لگتے تھے۔''

گاؤں میں رہ کر وہ خود کو بہت سکھی محسوس کرتے تھے۔

وہ دونوں بیٹا کے پاس ہوتے تو انھیں گاؤں کی یاد ستاتی اور جب گاؤں واپس جاتے تو انھیں اپنے پوتے، پوتیوں کی یادیں فکر میں مبتلا کر دیتی تھیں۔ دھنیا اکثر بیمار رہنے لگی تھی۔ اسے زیادہ سوچ فکر کرنے کی وجہ سے ہائی بلڈ پریشر کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے اسے زیادہ چنتا نہ کرنے کی صلاح دی ہوئی تھی۔ دھنیا کا بس ایک ہی ارمان رہ گیا تھا۔ وہ اپنی پوتی کی گود ہری دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ اپنے تین تین بچوں کی شادیوں میں ہاتھ تنگ ہونے کی وجہ سے کچھ بھی نہ کر پائے تھے۔ لیکن اب وہ کافی فارغ البال ہو چکے تھے۔ اب ان کی خواہش تھی کہ بڑی پوتی نین تارا کی شادی وہ بہت دھوم دھام سے کریں گے۔ بڑھاپے میں دونوں ایک دوسرے کی سوچ سے اس قدر مانوس ہو چکے تھے کہ ایک کے ذہن میں کیا چل رہا ہے دوسرے کو خود بخود پتا چل جاتا تھا۔ دونوں میں، اب بھی وہی پرانی ہم آہنگی برقرار تھی بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مزید پختگی آ گئی تھی۔

جب دھنیا نین تارا کی دھوم دھام سے شادی کرنے کی بات سوچ رہی تھی، تبھی ہوری بول اٹھا۔ ''گیہوں ں کی پکی ہوئی بالیاں کٹائی کے لیے تیار کھڑی ہیں۔'' گیہوں کی لہلہاتی ہوئی سنہری بالیوں کی طرف ہاتھ سے دکھاتے ہوئے ہوری نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''لکشمی دیوی کی کرپا سے اب کی فصل اچھی آئی ہے۔ سوچتا ہوں۔ نین تارا کا منگیتر آئی اے ایس آفیسر ہے۔ اس کی شادی بھی اسی شان سے ہونی چاہیے۔ امسال مزدوروں کی پائی پائی مزدوری چکادی ہے۔ اس لیے بنس چنت ہوں کہ پورے کا پورا گیہوں سیدھے سرکاری گودام میں پہنچا کر اچھی رقم کھڑی کر لوں گا۔

دھنیا چین کی لمبی سانس لی۔ ''شکر ہے تمہیں میری ترکیب سمجھ میں آ گئی، ورنہ ہر سال کی طرح اس سال بھی وہی رونا روتے کہ ادھیہ بٹائی کے دینے پڑیں گے۔

.....ابھی دھنیا نے اپنا آخری جملہ زبان سے ادا کیا ہی تھا کہ وہ کھیت کے آخری سرے پر جہاں زمین اور آسمان مل رہے تھے، کچھ دیکھ کر ٹھٹک سے گئے ہتھیاروں سے لیس نکسلیوں کا پورا قافلہ نہر کے کنارے سے گزر رہا تھا۔ دور سے دیکھنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا گویا چیونٹیوں کی لمبی سی لکیر اپنے صراط مستقیم پر رینگ رہی ہے۔ لیکن اصل میں، اس لرزہ بر اندام کر دینے والے منظر نے کچھ دیر کے لیے ان کے اوسان خطا کر دیے تھے۔ آئے دن نکسلیوں کے ہلا بول سے زمینداروں کی نیندیں حرام ہو رہی تھیں۔

اس نے سوچا۔ ''یہ معمولی سی چیونٹیاں بھی اگر اکھٹی ہو جائیں تو کتنی

شکتی شالی ہوجاتی ہیں۔'' اچانک اسے محسوس ہوا جیسے بے شمار چیونٹیاں اس کے اعصاب پر، اس کے دل و دماغ پر رینگتی چلی آرہی ہیں۔ اس خیال سے لمحہ بھر اس کا سارا بدن سہر اٹھا اور اس کی زبان گنگ ہوگئی۔

لیکن مستقبل کا خواب اتنا زبردست تھا کہ اس کے میٹھے میٹھے رس سے وہ دونوں ایک بار پھر مسرور ہوا ٹھے۔ پکی ہوئی فصل دو تین روز میں کٹنے والی تھی۔ کھیت کے بیچوں بیچ بجوکا کھڑا آج کچھ عجیب انداز سے مسکرا رہا تھا۔ ہوری نے محسوس کیا، اس کی معنی خیز مسکراہٹ کے پیچھے کوئی راز چھپا ہوا ہے، جس سے وہ محظوظ ہو رہا ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے ایسے لایعنی خیال کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ بجوکا بھی بھلا مسکرا سکتا ہے؟ اس نے اسے گھر کے پھٹے پرانے کپڑوں سے بنا کر خود اپنے ہاتھوں سے اس کھیت میں کھڑا کیا ہے۔ اس میں اتنا شعور کہاں کہ وہ مسکرا بھی سکے۔ ضرور یہ اس کا وہم ہوگا۔ معاً اس کے دماغ میں بیتے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔

دورِ غلامی میں جب انگریزوں کا راج پاٹ تھا۔ لال پگڑی اور خاکی وردی والا ایک سپاہی بھی گاؤں سے گزر جاتا تو اسے دیکھ کر لوگ باگ خوف سے کانپ اٹھتے تھے۔ اس قدر رعب تھا کبھی ان کا ہم ہندوستانیوں پر۔

لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ ہماری اپنی حکومت ہے۔ پر شاسن بھی اپنا ہے۔ اپنی عدالت ہے اور پولیس بھی ہماری اپنی ہے۔ نہ مہاجن گلا دباتا ہے نہ لگان کی وصولی کا خوف ہے اور نہ ہی زبردستی۔ کیسے اچھے دن آگئے ہیں۔ جیسے جی چاہے جیو۔ جیسے جی چاہے کھاؤ، جیسے جی چاہے پیئو!

''سنا ہے نکسلیوں نے بڑے ٹھاکر کے بیٹے کو اگوا (اغوا) کرلیا ہے؟''

دھنیا نے جب اپنی مری سی آواز میں ہوری سے دریافت کیا تو اس کے چہرے سے گہری تشویش ظاہر ہو رہی تھی۔

''ہاں! پر اس سے ہمارے باپ کا کیا جاتا ہے۔'' ہوری نے قدرے لاپروائی سے جواب دیا۔ ''پھروتی کی رقم نہ ملنے پر انھوں نے اسے جان سے مار دینے کی دھمکی بھی دی ہوئی ہے۔'' ہوری نے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی گویا دھنیا کو فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

لیکن .... دھنیا اس جواب سے بالکل بھی مطمئن نہ تھی۔ اس کے باوجود ہوری سے مزید سوال پوچھ کر اسے پریشان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ چپ چاپ ہوری کے پیچھے پیچھے پگڈنڈی پر قدم جما کر برابر چلتی رہی۔ شہر سے آکر سب سے پہلے وہ اپنے کھیت پر گئے تھے۔ وہاں سے جب سب کچھ ٹھیک ٹھیک پایا تو گھر آکر دونوں نے اطمینان کی سانس لی تھی۔

ہوری لمبی مسافت سے تھک چکا تھا۔ اپنے ہاتھ منھ پونچھنے کے بعد انگوچھا کندھے پر پھینکتے ہوئے اس نے کہا۔

''میں ثابت کردوں گا کہ گوبردھن کا خیال غلط ہے۔ میرا بڑے شہر کو ہجرت نہ کرکے گاؤں میں رہنے اور اپنے پرکھوں کی زمین پر کاشت کرنے کا فیصلہ کتنا صحیح ہے۔''

دھنیا گڑ کی کچھ بھیلیاں اور ایک لوٹا کنویں کا تازہ کھینچا ہوا ٹھنڈا پانی رکھ کر ایک طرف بیٹھ گئی اور حقہ کے لیے چلم تیار کرنے لگی۔

''ایشور کی دیا سے آج ہم کسی کے محتاج نہیں ہیں۔'' دھنیا نے کہا۔ ''ہم پوتی کی شادی میں دل کھول کر خرچ کرنے کی چھمتا رکھتے ہیں۔''

دھنیا! تم بس دیکھتی جانا، ہم اپنی پوتی کا بیاہ کس دھوم سے دھام سے کریں گے۔''

ہوری نے یہ بات چیلم کا کش لگاتے ہوئے کہی۔ ''دنیا، سماج سب عش عش کرتے رہ جائیں گے۔''

ان کے یہ جذبے اور یہ سوچ ہوری اور دھنیا کو ایسے بڑھاپے میں بھی اندر سے توانائی اور سرخوشی بخش رہے تھے۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دھنیا نے جاکے باہر کا دروازہ کھولا ڈاکیہ کھڑا تھا۔ اس نے دھنیا کے ہاتھوں میں ایک خط تھما دیا۔ وہ دونوں خط پاکر اچانک حیران رہ گئے۔

دھنیا نے ہوری کے ہاتھ میں خط دیتے ہوئے پوچھا۔ ''سب ٹھیک ہے نا؟ خط میں بھیجنے والے کا نام پتا ندارد تھا۔

ہاتھ میں خط لیے وہ دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ تھوڑے پس وپیش کے بعد لفافہ چاک کیا تو خط کے مضمون نے انھیں ایک دم ہلا کر رکھ دیا۔

ہوری کاکا لال سلام!

ہماری عدالت نے فیصلہ کیا ہے کہ گیہوں کی فصل میں سے ایک چوتھائی کے حصے دار تم بھی ہو۔ ہم تمہاری پوری فصل نہیں اٹھائیں گے۔ پورنیماشی کی رات تمہارے گیہوں کی کٹائی ہوجائے گی۔ تم اپنے حصے کا گیہوں دالان میں رکھواؤ گے یا منڈی بھجواؤ گے، اس کا تمہیں پورا پورا ادھیکار ہے۔

جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اسی رات بتا دینا کہ کیا کرنا ہے؟

اور ہاں! خبردار جو کسی بھی طرح کی ہوشیاری دکھائی یا پولیس میں خبر کی، تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔

پرندوں سے حفاظت کرنے والا

تمہارا اپنا بجوکا

ہوری نے خط کا آخری فقرہ پڑھا تو بجوکا کا زہر خند مسکراہٹ میں لپٹا ہوا چہرہ ایک دم سے اس کے تصور میں گھوم گیا۔ بجوکا کے راون کی طرح دس سر نکل آئے تھے اور وہ اس کی بے بسی پر زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

ہوری نے انگوچھے سے اپنے ماتھے کے پسینے پونچھے اور زیر لب بڑبڑایا۔

''اب پتا چلا۔ کولین اس وقت کھیت میں کھڑا کیوں مسکرا رہا تھا۔''

دھنیا کچھ نہ سمجھ سکی اور وہ خالی خالی سی ہوری کا منہ تکتی رہ گئی۔

۔افسانچہ۔

خاموش

پرویز شہریار

ہندوستان کے ایک دھارمک شہر کونارک میں واقع سوریہ مندر جہاں ہر سال بھگوان جگن ناتھ کی بڑی دھوم دھام سے رتھ یاترا نکالی جاتی ہے اور اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس یاترا میں استعمال ہونے والے رتھوں کی سجاوٹ میں مقامی مسلمانوں کا ایک ایسا خاندان ہے جو زمانہ قدیم سے ہی بہت بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا آیا ہے۔اس مندر کے مہا مہنت نے جب آج صبح اپنے اُپدیش میں خلافِ معمول مسلمانوں کی تعریف کی تو اسے سن کے سارے پجاری بھونچکا رہ گئے۔۔۔ان کا یہ اُپدیش خلافِ معمول تو تھا ہی خلافِ توقع بھی تھا۔کیونکہ انھوں نے اپنی چالیس برس کی مہنت والی زندگی میں ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف بولا تھا اوران سے نفرت کرتے تھے۔

اگرچہ کئی چھوٹے بڑے مہنت جو اس کے ماتحت تھے اور پوجا پاٹ میں ہاتھ بٹایا کرتے تھے،ان سبھوں نے اس کی مخالفت بھی کی تھی۔وہ جانتے تھے کہ سارے مسلمان ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔

لیکن۔۔۔مہا مہنت کے دل میں نا جانے کہاں سے یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ۔۔۔مسلمان تعلیم کے دشمن ہوتے ہیں۔وہ کئی کئی شادیاں کرتے ہیں۔ان کے بہت سارے بچے ہوتے ہیں۔وہ گندے رہتے ہیں اور گھر کے اندر بھانت بھانت کے چرندے اور پرندے پالتے ہیں بکری،بلّی،طوطا،مینا،مرغی،بطخ، کبوتر وغیرہ اور ضرورت پڑنے پر انھیں ذبح کر کے کھا بھی جاتے ہیں،رام رام!

ارچنا نے جب اپنے انکل کے بارے میں یہ سب باتیں ویڈیو کال کے دوران قدرے جذباتی ہو کر بتائی تو میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔میں اس کی باتیں غور سے سننے لگا۔ارچنا میری فیس بک فرینڈ تھی۔جے این یو میں جب ہم پڑھتے تھے،تب صرف ایک دوسرے کو جانتے تھے۔کبھی ہماری اتنی بات نہیں ہوتی تھی۔اب وہ جرمنی میں مقیم تھی اور جم ٹرینر تھی۔۔۔اُس نے کہا،شہریار! جانتے ہو۔ان کے اندر یہ drastic change کیسے آیا۔۔۔؟

میں سراپا بگوش بنا،ہنکاری بھر کر اسے سننے لگا تو اس نے بتایا۔گذشتہ حالیہ دنوں میں ایک چمتکار ہو گیا۔میرے انکل کا اکلوتا بیٹا وِجنان سینا پتی نیویارک میں چارٹرڈ اکاؤنٹ ٹینٹ ہے۔وہ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف کروڑوں کی زمین جائیداد چھوڑ کر کے پچھلے دس سال سے امریکہ میں رہ رہا ہے۔

وِجنان، پتہ نہیں کیسے،کورونا وائرس کی چپیٹ میں آ گیا۔۔۔یہ واقعہ بیس یا بائیس اپریل کا ہے،مجھے ٹھیک سے تاریخ یاد نہیں۔

یہ خبر سنتے ہی مہنت جی کے گھر میں کہرام مچ گیا۔میری آنٹی کو مہنت جی بُرا بھلا کہنے لگے۔کیونکہ ان کے منع کرنے کے باوجود آنٹی نے ہی بیٹے کو لاڈ میں آ کر امریکہ جانے کی اجازت دلا دی تھی۔اب وہ دن رات بیٹے کے غم میں نڈھال ہو رہے تھے۔انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا اکلوتا بیٹا وِجنان جس مرض میں مبتلا ہے،اس میں شاذ و نادر ہی کوئی بچ سکتا ہے۔

میں نے ارچنا سے کہا۔''یہ ایک موذی اور مہلک بیماری ہے۔اس عالمی وبائی بیماری نے دُنیا کے بیشتر ترقّی یافتہ ممالک کے ڈاکٹروں کو بے دست و پا کر دیا ہے۔''

ارچنا نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔''وجنان کے زندہ بچنے کی امید بالکل ہی معدوم ہو چلی تھی کیونکہ اس کا مرض خطرناک حد تک بڑھ چکا تھا۔''

میرے دریافت کرنے پر ارچنا نے اپنی بات مزید آگے بڑھاتے ہوئے،بتایا کہ۔۔۔کیسے ایک دم سے کایا پلٹ ہو گیا،جب سبھی ڈاکٹروں وِجنان کے کیس کو ہاتھ میں لینے سے انکار کر دیا تو ایک مسلم ڈاکٹر اویس نے اس کیس کو بہت پھرتی سے سنبھالا۔اس نے تو اپنی جان کی بازی لگا کر وجنان کا علاج شروع کر دیا۔اُس ڈاکٹر نے اسے چوبیسوں گھنٹے اپنی ذاتی نگرانی میں رکھ کر اسے اسپیشل وینٹی لیشن میں رکھ کر علاج و معالجہ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔وہ بھی اس حالت میں جب کہ خود امریکی مریضوں کو اس طرح کا وی آئی پی علاج میسّر نہیں تھا۔

''اُس کے پیچھے جانتے ہو کیا راز تھا؟''۔۔۔ارچنا نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔۔۔میرے انکل جو کہ کٹّر ہندو، وہ بھی سوریہ مندر کے پروہت ہیں،انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر اویسی کا کہنا تھا کہ میں نے اسے بچانے کے لیے اپنی جان کی بازی صرف یہ سوچ کے لگا دی کہ میری طرح یہ بھی ایک ہندوستانی ہے۔

بس اس دن سے وہ مسلمانوں کے پکّے مرید ہو گئے ہیں اور مجال نہیں ہے کہ کوئی بھی ان کی موجودگی میں مسلمانوں کی برائی کر لے۔وہ فوراً بول اُٹھتے ہیں،خاموش! آگے ایک شبد بھی مت بولنا۔میں جانتا ہوں کہ مسلمان کیسے اچھے ہوتے ہیں ٹ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔اس لیے مجھ سے بہتر اس بارے میں کوئی نہیں جانتا۔چُپ ہو جاؤ سب،خاموش!

سماجی اقدار کی سچی تصویر

پرویز شہریار کی اس کہانی میں جنسی لذت کا احساس ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن کی پاکیزگی اور سماجی اقدار کی سچی تصاویر نظر آتی ہیں۔افسانہ نگار کے بیانیہ کی سب سے اہم سطح یہ ہے کہ انھوں نے ہواؤں میں تیر نہیں چلائے بلکہ اپنے قرب و جوار کی جیتی جاگتی انسانی زندگی کی سچی تصاویر اور تلخ آمیز خارجی حقائق کو فنی بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے۔پرویز شہریار کی کہانی میں سماجی ظلم و ستم کے خلاف اعتراضات کی لہریں دوڑتی نظر آتی ہیں۔مجموعی اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا افسانہ کہانی پن سے پوری طرح لبریز ہے۔

۔ ڈاکٹر ارشاد سیانوی

- ادبِ اطفال -

بہادری کا انعام

پرویز شہریار

اعیان کو صدر جمہوریہ ہند کا بچوں کا انعام ملا تھا۔

اعیان کو صدر جمہوریہ نے جب بہادری کا انعام دیا تو اُس کی آنکھیں مارے خوشی کے نم ہوگئیں۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یوم جمہوریہ کی عظیم الشان تقریب میں اُسے بھی انعام مل سکتا ہے۔

اعیان کے والدین نے جب اعیان کو انعام لیتے ہوئے دیکھا تو انھیں محسوس ہوا جیسے اعیان کی آنکھیں ہجوم میں اُن ہی کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ وہ اپنی اپنی سیٹ سے اُٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے اپنے لاڈلے بیٹے کے اس کارنامے سے اُن کا سر فخر سے اونچا ہوگیا تھا۔

26 جنوری کی تقریب کے بعد اعیان کے ساتھ کے سبھی بچے صدر جمہوریہ کے یہاں رات کے کھانے پر مدعو تھے۔ کھانے کے بعد صدر جمہوریہ نے بچوں کو بڑی بہادری سے انسانیت کی حفاظت کرنے کے کارنامے انجام دینے پر بہت شاباشیاں دی تھیں۔

اُس کے بعد اعیان جب اسکول آیا تو اسکول میگزین کے چند ساتھیوں نے اس کا پُرجوش استقبال کیا اور اپنے اپنے قلم کاغذ سنبھال کر اُس سے مختلف سوالات پوچھنے لگے۔ اُس وقت عمران کو لگا کہ اب وہ پہلے جیسا معمولی لڑکا نہیں ہے بلکہ اب تو وہ سلیبریٹی بن چکا ہے۔ اسکول میگزین میں اس کی اسٹوری چھپنے والی تھی۔

اسکول میگزین کے ایڈیٹر کے اصرار پر اُس نے بتانا شروع کیا:

وہ ایک شام اپنے دوستوں رفیق اور عمران کے ساتھ سیر کرنے نکلا تھا۔ جب وہ تینوں ایک چھوٹے سے پُل کے اوپر سے گذر رہے تھے تو اُنھیں نیچے جھانک کر بارانی نالے میں پتھر پھینکنے میں بڑا مزہ آرہا تھا۔ پتھر اور کنکریاں پھینکتے پھینکتے اچانک عمران نے دیکھا کہ دو آدمی چرمی بیگ سے کچھ سفید سفوف کے پیکٹ کو سونگھ کر کچھ جانچ پڑتال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی رفیق وہاں سے ڈر کے مارے رفو چکر ہوگیا۔ اسے لگا کہ وہ لوگ کوئی چور ڈاکو ہیں جو اس پر بھی حملہ کردیں گے۔

لیکن اعیان وہ اور اس کا دوست عمران اُس منظر کو دیکھ کر دونوں ششدر رہ گئے۔ عمران بڑا ہوشیار تھا لیکن دل کا وہ بھی کمزور تھا۔ جیسے ہی اُسے اندازہ ہوا کہ وہ ڈرگ پیڈلر ہیں وہ بھی وہاں سے نو دو گیارہ ہوگیا۔

میں نے دل میں سوچا۔ یہ تو خیر ڈرگ پیڈلر معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ بچے تو پولیس دیکھ کے بھی بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن میں بزدل نہیں ہوں۔ میرے ایک دوست انشا کے والد بھی پولیس انسپکٹر ہیں۔ میں ان کے یہاں اکثر آیا جایا کرتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ سبھی پولیس والے ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں۔ انشا کے والد بھی بڑے بہادر اور ایماندار پولیس انسپکٹر تھے۔

اچانک، مجھے یاد آیا کہ کیوں نہ ہم اُنھیں اسی جگہ پر بُلا لیتے ہیں؟

میں نے جب اپنے دوست کے والد انسپکٹر اعظم خان کو فون کیا۔ تو انھوں نے کہا۔

''دیکھو! سنبھل کر رہنا ایسا نہ ہو کے وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا دیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ میری فکر نہ کریں۔ بس فوراً آجائیں۔''

میں نے اُنھیں فون پر پتہ بتا دیا تھا۔ اس دوران میں نے اپنے موبائل فون پر چھپ چھپ کر اُن کی کئی تصویریں کھینچ لی تھیں۔ آخری بار تصویر لے رہا تھا کہ اچانک اُن کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اس بار انھیں شک ہوگیا کہ میں ان کی جاسوسی کر رہا ہوں۔ جیسے ہی یہ خیال اُن کے ذہن میں آیا۔ ان میں سے ایک نے بڑے تحکمانہ انداز سے مجھے رُکنے کے لیے کہا اور وہ پل کے نیچے کی پتھریلی اور اوبڑ کھابڑ چڑھائی پر چڑھتا ہوا میری جانب تیزی سے دوڑا۔

میں اس کے ارادے بھانپ چکا تھا۔ وہ مجھ سے میرا موبائل فون چھیننا چاہتا تھا۔ میں اُسے چکما دے کر پل کی دوسری جانب ریلنگ پھلانگتا ہوا گیا اور وہاں چھوٹی بڑی سبز جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ تقریباً پندرہ بیس منٹ تک مجھے ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے مجھے خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ بھی کی اور جان سے مارنے کی دھمکیاں بھی دیں۔

لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!

وہ میرا بال بھی بیکا نہ کر پائے اور دیکھتے ہی دیکھتے پولیس وین کے سائرن کی آواز نے اُن دونوں کے ہوش اڑا دیئے۔ اس سے پہلے کہ وہ دائیں بائیں بھاگتے پولیس کے سپاہیوں نے اُنھیں دھر دبوچا تھا۔

مجھے اُس وقت خدا یاد آگیا تھا۔

''کتنا مہربان ہے وہ رب الکریم!'' میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکریہ ادا کیا تھا۔ اُس شام میرے دوست کے والد انسپکٹر انور خان نے ہمارے گھر پر آکر بتایا کہ اُن نائجیریائی مجرموں کے پاس سے دو کروڑ روپے کا ہیروئن ضبط کیا گیا ہے۔ وہ یہ ڈرگ نیپال کے راستے سے ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں سپلائی کرنے کی غرض سے لائے تھے۔ مجھے یہ سن کر اپنے اس کارنامے پر یقین ہی نہیں آیا۔

انور خان نے مجھے بتایا اس سے ہمارے دشمن ممالک کی سازش کا پردہ فاش ہوگیا ہے۔ وہ ہمارے ملک کے ہونہار نوجوانوں کو غلط کاموں میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن انسپکٹر انور خان نے جب سرکاری فوٹو گرافر سے میری تصویر کھنچوائی اور یہ مژدہ سنایا کہ میرا نام راشٹرپتی بہادری انعام کی سفارش کیا جائے گا تو میں خوشی سے جھوم اٹھا۔

دوستو! اعیان نے اپنے اسکول میگزین کے ایڈیٹر اور نامہ نگاروں کو متوجہ کرتے ہوئے اپنا آخری جملہ ادا کیا۔

وہ دن ہے اور آج کا دن — میں اپنے اندر نمایاں تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ انسان چاہے تو کیا ہو نہیں سکتا ہے۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ہمت اور بہادری سے کام لیں یاد رکھیے:

ہمیشہ حوصلے کی جیت ہوتی ہے۔!

"عظمت کا بیاں"

حمدِ باری تعالیٰ

بس مِرا دستِ دُعا ہے، جو ہے
پھر تو سب اُس کی عطا ہے، جو ہے

یہ جو سب کچھ ہے، نہیں ہے کچھ بھی
مالکِ ارض و سما ہے، جو ہے

ناخدا کون ہے، کیا فکر مُجھے؟
میری نظروں میں خُدا ہے، جو ہے

آسمانوں میں زمینوں میں ہے جو
اُس کی اک 'کُن' سے بنا ہے، جو ہے

اِک فقط اُس کو بقا ہے، اور بس!
ورنہ پابندِ فنا ہے جو ہے

اَور کوئی نہیں دینے والا
تیرے در سے ہی ملا ہے، جو ہے

تیری عظمت کا بیاں ہے اس میں
اَن کہا ہے کہ کہا ہے، جو ہے

کس کی جاگیر ہیں سب ارض و سما
نام جس کے ہے، ترا ہے جو ہے

جو نہیں، اس کا کوئی ذکر نہیں
بس مجھے اُس کا پتا ہے، جو ہے

رحم کر مالکا، انصاف نہیں
فردِ عصیاں میں لکھا ہے، جو ہے!

اپنے انداز میں ہر وقت نسیمؔ
ہر کوئی حمد سَرا ہے جو ہے

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

نعت رسولِ مقبول ﷺ

نظر سے دل سے بھلا دور ہی کہاں ہیں حضور
درود پڑھ کے تو دیکھو قریبِ جاں ہیں حضور

سبھی پکاریں گے روزِ جزا کہاں ہیں حضور
پیمبروں کے لیے بھی درِ اماں ہیں حضور

عیاں ہے اہلِ نظر پر کہاں کہاں ہیں حضور
جہاں جہاں ہے خدائی وہاں وہاں ہیں حضور

جو ناخدا ہیں، خدا کو بھلائے بیٹھے ہیں
سہارا دیجیے، تلاطم میں کشتیاں ہیں حضور

جہاں میں آپکے آتے ہی نور پھیلا ہے
جہاں خدا کا مگر رونقِ جہاں ہیں حضور

بروزِ حشر وگرنہ ہمارا کیا ہوتا
خدا کا شکر کہ ہم سب کے پاسباں ہیں حضور

بس اک نگاہِ کرم ہو تو پار بیڑا ہے
ہوائیں تیز ہیں کمزور بادباں ہیں حضور

یہی ہے غم کہ مدینے سے کیوں پلٹ آیا
اسی ملال سے آنسو میرے رواں ہیں حضور

سراپا آپ کا لفظوں میں کیا سمائے گا
کہ لفظ بوند ہیں اور بحرِ بیکراں ہیں حضور

حضور پاک کے صدقے میں جی رہا اصغر
میری حیات کا محور ہیں میری جاں ہیں حضور

محبوب خان اصغر (بہاولنگر)

گلہائے عقیدت

سرورِ انبیاء — شاہِ کون و مکاں
آپ رحمت لقب راحتِ انس و جاں

میرے دُکھ درد کا — آپ ہی آسرا
آپ سا کون ہے میرا ہمدرد! یاں

اے حلیم الطبع صاحبِ خوش بیاں
آپ ہیں! آپ ہیں! سرورِ دو جہاں

چہرہ والشّمس ہے، زُلفیں واللیل ہیں
صدقے ہوں آپ پر میرے دل اور جاں

کرتی ہے آرزو یہ نزہتِ غمزدہ
در پہ آ کے کروں درد و غم سب بیاں

○

رمضان کا مہینہ

ہو مومنوں مبارک رمضان کا مہینہ
انعام کا مہینہ ایمان کا مہینہ

در سے تمہارے کوئی جائے نہ ہاتھ خالی
تحقیر سے نہ دیکھو آ جائے گر سوالی
اکرام ساتھ لایا احسان کا مہینہ

بدلہ بھی نیکیوں کا ستّر گُنا ملے گا
پروردگار دل کی ہر اک دعا سُنے گا
ماہِ صیام ہے یہ رحمٰن کا مہینہ

ہر اک گھڑی تلاوت لب پہ سجی ہوئی ہے
ہر سُو صدائے قرآت کانوں میں گونجتی ہے
پڑھتے رہو کہ آیا قرآن کا مہینہ

ڈاکٹر نزہت شاہ (نیویارک)

منقبت

رحمتوں کا مہینہ یہ رمضان ہے
سب سے اعلیٰ مہینہ یہ رمضان ہے

درگزر سب گنہ کر دیئے جاتے ہیں
بخششوں کا مہینہ یہ رمضان ہے

روزے رکھتے ہیں اس میں مسلمان سب
رب کا پیارا مہینہ یہ رمضان ہے

نور ہی نور ہوتا ہے ہر سو یہاں
حق کا چشمہ مہینہ یہ رمضان ہے

بانٹ لو نعمتیں رب کی اس ماہ میں
اک خزینہ مہینہ یہ رمضان ہے

کوئی بھوکا کبھی اس میں سوتا نہیں
کیا نرالا مہینہ یہ رمضان ہے

سب مہینوں کا سردار اشؔہر ہے یہ
رب کا تحفہ مہینہ یہ رمضان ہے

اشؔہر اشرف
(جموں کشمیر)

''نوحہ''

اصغر ندیم سید
(لاہور)

میں ایک یونیورسٹی پروفیسر ہوں۔اپنی مدت ملازمت پوری ہونے پر ریٹائر کر دیا گیا ہوں۔

مجھے بخوشی فارغ کر دیا گیا کیونکہ جو میں پڑھانا چاہتا تھا، مجھے نہیں پڑھانے دیا گیا۔اوسط درجے کے معمولی چاپلوس پروفیسر مجھے شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔حاسد اور حسرتوں کے مارے پروفیسر میرے خلاف نالائق طالب علموں کو استعمال کر کے سازشیں کرتے تھے۔ میں خاموشی سے سب دیکھتا رہا۔باہر کی یونیورسٹیوں اور ملکوں سے کانفرنس میں شرکت کے دعوت نامے غائب کرتے رہے۔ مارشل لاء حکومتوں میں میرے جیسے اساتذہ کے خلاف پمفلٹ نکالتے رہے۔خوشامد کے زور پر ہر طرح کی ترقیاں لینے والے Best Teacher ایوارڈ لیتے رہے۔ پڑھانے کی بجائے وائس چانسلروں کے ذاتی کام کرتے رہے۔ترقیوں کے لئے ریسرچ کے نام پر بھوسہ بھرے پیپرز چھپواتے رہے۔ بڑی کامیابی سے غیر جمہوری حکومتوں کو اخلاقی جواز فراہم کرتے رہے۔ جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کا نعرہ لگانے والے جابر سلطانوں کے جوتے چاٹتے رہے۔میں یہ سب دیکھتا رہا۔اور میں اُن کی بنائی ہوئی ترتیب شدہ کتابیں پڑھانے پر مجبور ہوتا رہا۔یونیورسٹیوں کے کلچر میں علم اور شفافیت کی جگہ تعصب، تنگ نظری اور سازشوں کو پلتے دیکھتا رہا۔ہم اندھوں میں کانے راجے پیدا کرنے کو اپنی کامیابی سمجھتے رہے۔

میں جو پڑھانا چاہتا تھا، نہ پڑھا سکا اور جو نہیں پڑھانا چاہتا تھا وہ پڑھانے پر مجبور ہوا۔

آج اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے جو شاگرد پیدا کیے وہ ڈاکٹر، انجینئر، بینکر اور اُستاد بنے۔مگر اُن میں ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔اس کا اندازہ مجھے وقتاً فوقتاً ہوتا رہتا ہے۔ جب میں اپنے زخموں کے علاج کے لئے چھ دن ہسپتال میں رہا تو چھ لاکھ کا بل دیکھ کر بلبلا اُٹھا۔میرے کسی شاگرد نے کان میں کہا، ''سر یہ تو آپ کو دینا پڑے گا کہ آپ نے ہمیں جو پڑھایا اُس میں تو یہی کچھ ممکن ہے۔''

پھر جب میں انجیوگرافی کے لئے داخل ہوا تو میرے شاگرد ڈاکٹر نے میرے کان میں کہا، ''سر اگر سرکاری علاج کرانا ہے تو دو سال بعد باری آئے گی اور اگر جیب سے علاج کرائیں گے تو دس منٹ میں باری آجائے گی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا اس نے کہا ''جو آپ نے پڑھایا اُس میں بس یہی ہو سکتا ہے۔''

ایک دن کسی کام سے سیکریٹریٹ گیا۔سیکریٹری کو نام کی چٹ بھیجی، اُس نے نہیں بلایا۔ میں ڈھیٹ بن کے بیٹھا رہا۔جب کسی میٹنگ میں جانے کے لئے نکلا تو میں سامنے آ گیا۔ میں نے کام بتایا۔اس نے کہا ''سر یہ کام ممکن نہیں ہے۔آپ نے ہمیں جو پڑھایا تھا اُسے بھلانے میں بہت وقت لگا ہے۔ بڑی مشکل سے وہ سب بھلا کر اس جگہ پہنچا ہوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔''

ایک دن میرے گھر کی بجلی کئی گھنٹے تک نہ آئی تو میں ایس ڈی او کے پاس گیا اور اُس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''سر جو کچھ آپ نے ہمیں پڑھایا تھا۔اُس میں تو یہ جو بجلی آپ کو مل رہی ہے۔ یہ بھی نہیں ملنی چاہیے۔''

آج مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے لولی لنگڑی اور اداس نسلیں پیدا کرنے میں حصہ لیا ہے۔

تنگ نظری اور تعصب نے پڑھے لکھوں میں کیسے راستہ بنایا۔پھر کس طرح انتہا پسندی ہمارے معاشرے میں اعتبار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ کس طرح بڑے بڑے کالم نگاروں، سیاسی رہنماؤں، دانشوروں اور بیوروکریٹس نے انتہا پسندوں اور دہشت گردوں کو جواز فراہم کیے۔ جب ایک خودکش حملہ آور اپنے دل، دماغ اور آنکھ پر پٹی باندھتا ہے تو اس کا ذمہ دار میں اپنے آپ کو سمجھتا ہوں۔ یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر معصوم اقلیتوں اور مسلمانوں کو جب عبادت گاہوں میں بارود سے اڑاتے ہیں تو اس میں کچھ حصہ میرا بھی ہے۔

آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے کیا پڑھانا چاہیے تھا۔میری بڑی خواہش تھی میں یہ پڑھاؤں کہ اللہ کو خوبصورتی پسند ہے۔ جمالیات کیا ہوتی ہے۔ اس کا فلسفہ کیا ہے۔ جمالیات کے فلسفے پر کئی کتابیں موجود تھیں۔ہم نے اُن کی طرف رجوع نہ کیا۔ جمالیات کو سمجھے بغیر ہم سبحان اللہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں آ سکتے۔ مجھے کسی نے یہ پڑھانے نہیں دیا کہ خوبصورتی کی تحسین کیسے کرنا ہے۔اس میں تمام فنون لطیفہ کی بحثیں آجاتی ہیں۔ میں جغرافیہ لازمی کرنا چاہتا تھا کہ اللہ کو سمجھنے کی سیڑھی جغرافیہ ہے۔اُس کی زمینیں، اُس کے موسم، اُس کے جنگل، اُس کے دریا، اُس کے سمندر اور پھر سمندروں میں حیات، جنگلوں میں حیات۔ پرند چرند۔اُن کی نسلیں۔ان کی عادات کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ جانوروں سے وابستہ منفی تصورات کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ یہ کام ہم نے نہ کیا، غیروں نے کیا۔نیشنل جیو گرافک چینل سے بہتر یونیورسٹی نہیں ہے۔

میں پڑھانا چاہتا تھا کہ ہماری تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے۔میں انسانی تاریخ پڑھانا چاہتا تھا۔ مجھے اغواء شدہ پاکستانی تاریخ پڑھانے پر لگا دیا گیا۔ ظالم بادشاہوں کے قصیدے پڑھنے والے مورخوں نے وہ ٹیڑھی اینٹ رکھ دی جس پر جو عمارت بھی تعمیر ہوئی اُس کی غلام گردشوں میں ضیا الحقوں نے ٹک ٹکیاں لگا دیں۔ پپو کے قاتلوں کی پھانسی کے میلے میں پٹھورے اور گول گپے بیچنے والوں نے چاندی کمائی اور انسانوں کو بے حس کرنے کا عمل شروع ہو گیا۔ میں تاریخ مسخ کرنے والوں کی نشاندہی کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ایسا کرنے سے روک دیا گیا۔کن

لوگوں نے نظریہ پاکستان کو پوری قوم سے ٹھگ لیا۔ اور پھر اُس پر لمبی چوڑی مارکیٹنگ کی۔ جواب تک جاری ہے۔ میں طلبا کو بتانا چاہتا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں، کن کونے کھدروں سے کیڑے مکوڑوں کی طرح نکلے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر قائداعظم کو ٹھگنے والے بونوں اور ٹھگنے قد کے لوگوں کو طلباء سے متعارف کرانا چاہتا تھا۔ مجھے روک دیا گیا۔ میں طلباء کو پڑھانا چاہتا تھا کہ ایوب خان کس طرح فیلڈ مارشل بنا اور اُس کے مشیروں نے ادب اور ادیبوں کو خریدنے کے لئے کس طرح کے گماشتے مقرر کیے۔ اُس نے شاہی قلعے میں حسن ناصر کو کیسے شہید کیا۔ کس طرح دانشوروں، سیاست دانوں اور باضمیر لوگوں کو ساری رات جگانے کے لئے حربے استعمال کیے۔ ان کے ناخن کس طرح پلاس سے اکھاڑے گئے۔ کس طرح ان کی چیخوں کو دبانے کے لئے اقدامات کیے گئے۔ ضیا الحق نے کس طرح ادیبوں، شاعروں، وکیلوں (اُس وقت کے وکیلوں) کسانوں اور صحافیوں کے ننگے جسموں پر کوڑوں کے ساتھ گرم پانی کی بوچھاڑ کروائی۔ کس طرح یہ لوگ پاگل ہوئے اور اُن کے گھر والوں نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اداکارہ شبنم کیس میں راتوں رات ضیاء الحق نے پھانسی کے مجرموں کو کس طرح معافی دلوائی۔ کون شبنم کے گھر گیا اور اُس سے معافی نامہ لے کر آیا۔ میں یہ طلباء کو بتانا چاہتا تھا۔

میں طلباء کو پڑھانا چاہتا تھا کہ سعادت حسن منٹو جب پاکستان آئے ہم نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ چھوٹی عدالتوں میں کس طرح ذلیل کیا۔ روزگار کے سارے دروازے بند کر دیے۔ دس روپے میں تخلیقی مشقت پر افسانہ لکھوایا۔ قسطوں میں نہیں، یک مُشت مرنے پر مجبور کر دیا۔ پاک ٹی ہاؤس میں اُسے دیکھ کر قیوم نظر اور شہرت بخاری ٹائلٹ میں ڈر کے کیوں گھسے تھے۔ بقول منٹو اُس نے تو کبھی بھی اُن سے اُدھار نہیں لیا تھا۔ میں منٹو کے افسانے ''کھول دو''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''موذیل''، ''بابو گوپی ناتھ''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''شہید ساز'' اور ''ننگی آوازیں'' پڑھانا چاہتا تھا۔ کورس مرتب کرنے والوں نے مجھے روک دیا اور جن اصحاب علم وادب نے یہ راستہ روکا وہ اس وقت بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پروفیسر ایمریطس ہیں۔

میں فیض کی نظم ''ڈھاکہ سے واپسی پر'' پڑھانا چاہتا تھا اور طلباء کو اس مصرعے کا مطلب سمجھانا چاہتا تھا۔ ''خون کے دھبے دُھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد''۔ میں ناصر کاظمی کی غزل طلباء کو پڑھانا چاہتا تھا۔ جو سنہ 1971ء کے بعد لکھی گئی۔ ''وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے'' مجھے بس یہ بتانا تھا کہ وہ بھٹیالی گانے والے ہمارے طرزِ احساس سے کیسے نکل گئے اور مشرقی پاکستان کی ستاون فلمیں جو یہاں ریلیز ہوئیں وہ ہماری فلم انڈسٹری کو یکسر تبدیل کرنے ہی والی تھیں کہ سفر رُک گیا۔ میں بتانا چاہتا تھا کہ قرۃ العین حیدر، بڑے غلام علی خان اور ساحر لدھیانوی پاکستان چھوڑ کر کیوں چلے گئے اور سجاد ظہیر کو محبس جیل میں کیوں بند کیا گیا۔ میں بہت کچھ پڑھانا چاہتا تھا۔ انتظار حسین کا ''شہر افسوس''، ''بستی'' اور ''ہندوستان سے آیا ہوا خط'' مجھے نہیں پڑھانے دیا گیا۔ میں امر جلیل کی کہانیاں اور شیخ ایاز کی نظمیں پڑھانا چاہتا تھا۔ اور وہ سارا عالمی لٹریچر اور اپنی زبانوں کا لٹریچر جسے ہم نے اپنے طلباء سے چھپالیا، وہ سب پڑھانا چاہتا تھا۔ اس طرح میں بھی کوتاہ قدر رہ گیا اور میرے طلباء بھی۔

آئینیسکو نے ایک ڈرامہ لکھا تھا، ''کرسیاں (The Chairs)'' اس میں ایک ریٹائرڈ افسر رات کے کھانے پر شہر کے تمام بڑے عہدے والے افسروں کو دعوت پر بلاتا ہے۔ جب وہ ایک ایک کر کے آتے ہیں تو سٹیج پر اُن کے وجود کے بجائے اُن کی صرف کرسیاں رکھی جاتی ہیں۔ ان کرسیوں سے میزبان گفتگو کر کے بتاتا ہے کہ صاحبو درحقیقت تو تم صرف کرسیاں ہو۔ تم اس سسٹم میں اپنی شناخت گم کر بیٹھے ہو۔ میں بھی ایک ڈنر پر سب بڑے لوگوں کو بلا کر یہ اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں جو پڑھانا چاہتا تھا کیوں نہیں پڑھا سکا۔ مگر میرا یہ اعتراف صرف خالی کرسیوں سے ہوگا کہ وہ سب افسر اپنا وجود نہیں رکھتے۔

''نیوتا''

"سروع اللہ کے نام سے ، جس نے یہ دن دکھلایا، ہمارے پیارے بھائی نسیر عرف پیٹ جلے اور سرسوں بھابھی کے بڑے لمڈے بسارت نسیر عرف بچھو میاں کا بیاہ، بھائی متین میاں عرف جلے کٹے اور انگارن بھابھی کی لمڈیا نگینہ بی عرف منی ناگن سے تے پایا ہے۔

برات جمعرات کی سباہ فجر کی نماج کے باد بھائی پیٹ جلے کے گھر سے نکلے گی اور حجرت سیخ ہرے بھرے ساہب کی درگاہ سے سلام کر کے دوپہر سے پے لے بھائی جلے کٹے کی ڈیوڑھی چڑے گی۔

ساری برادری کو تار روٹی کی داوت ہے۔ بھائی جلے کٹے لمڈیا کی سادی کی خوسی میں اپنا بیل کاٹ کر کھلا ریا ہے۔ مریجوں اور بڈھوں کے لیے بکری کا گوس بھی ہے۔ دولے کی سلامی سوا روپے رکھی ہے۔ برادری والے بھی سلامی لاویں جو ایک آنے سے کم نہ ہو۔ اپنی عجت کی بات ہے۔ جو برادری والے نا آویں اور اینٹھ جاویں وے دو روٹی جیادہ کھاویں اپنے گھر میں۔ ہم بھی نا جاویں گے ان کے بیاہ میت میں۔۔۔۔ بھول نہ جانا تار روٹی کھانے آنا۔"

دھاگا گلی، نیا محلہ، رام پور۔

(ماخوذ) اش باڑے ماں آپ کا کیا کھیل ہیگا۔۔۔ ۱۹۵۱ء

''تلاش ابھی ناتمام ہے''

طاہرہ اقبال
(فیصل آباد)

اس عشق کی نوعیت فرق تھی۔ یہ عشق دو مخالف جنس کے حسن و محبت کا بے اختیار اظہار نہ تھا' بلکہ دو اہلیتوں اور ذہانتوں کے ٹکراؤ کا فطری ردِّعمل تھا۔ ایسا ٹکراؤ جو دشمن بنا دیتا ہے یا پھر دوست۔ جوں جوں یونیورسٹی میں اِس عشق کے چرچے پھیل رہے تھے' اس کی توجیہات بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ انگلش ڈیپارٹمنٹ میں دونوں کی یکساں ذہانت' ڈرامہ سوسائٹی میں دونوں کی مساوی افتادِطبع' ہر عمل' ہر ہنر مندی' ہر مباحثہ میں دونوں حریف' کشش ثقل سا کھنچاؤ' ذہانت کا ذہانت سے' ہنر کا ہنر سے' صلاحیت کا صلاحیت سے اور شخصیت کا شخصیت سے' جیسے جدتِ طبع رکھنے والوں نے فطری عشق کا نام دیا تو کسی نے نظریاتی عشق کہا۔ کچھ نے فلسفیانہ عشق بتایا۔ تو کسی نے تجرباتی عشق' گویا یہ عشق بھی ایک تحقیق طلب متن ہو گیا' جس پر محققانہ بحثیں چھڑ گئیں۔ نظریۂ عشق کی ایک نئی کیمسٹری مرتب پائی' جس کے عناصرِ ترکیبی ناز و ادا تعریف و ستائش' حسد و رشک' ہجر و وصال' جنون و بے قراری سے تبدیل ہو کر میلانِ طبع' ذہنی ہم آہنگی' مساوی لیاقت' اعتماد اور یقین بن گئے کہ عقیدۂ عشق ایسا فطری اور ناگزیر ہو گیا کہ میرؔ ہوتے تو اپنے نظریۂ عشق میں تھوڑی ترمیم کر لیتے۔

سخت دانا تھا جس نے پہلے میرؔ
مذہبِ عشق اختیار کیا

ماہم رنگ اُڑی جین پر لمبا بے ڈھنگا کرتا پہنے لائبریری' ڈرامیٹک سوسائٹی' میوزک گروپ میں اپنی ذات' صورت' احتیاجات سب گم کر دیتی اور معاذ اپنے پیانو کے تاروں میں کوئی اَن سُنی' اَن چھوئی دُھن میں خود کو سمو دیتا جس کے آہنگ کی سرشاری میں ماہم اپنی مہارتوں کو پختہ کرتی تھی۔ کچھ کر دکھانے کی مطلوبہ توانائی وہ ایک دوسرے کے والہانہ جذبوں کی حدت سے کشید کرتے تھے کہ اگر کبھی معاذ گھر چلا جاتا تو ماہم کی تمام تر توانائیاں کسی سرد خانے میں فریز ہو جاتیں اور وہ دھوپ نکلنے کے انتظار میں بادلوں میں چھپے سورج کو کھوجتی رہتی اور اگر کبھی ماہم چھٹی گزارنے کہیں چلی جاتی تو پیانوں کے تاروں میں اُلجھے سُر گُنجھل ہو جاتے۔

جس روز ماہم ٹی' وی پروڈیوسر کی گاڑی میں بیٹھ کر ریکارڈنگ کے لیے گئی۔ ساری یونیورسٹی دم سادھے منتظر تھی کہ آج اس غیر روائتی عشق کو کوئی روائتی سا دھچکا لگے گا اور جب پروڈیوسر کی گاڑی ماہم کو واپس چھوڑ کر گئی۔ تو سب سے پہلے معاذ نے ہی اُس کا گھراؤ کیا۔

لائنیں تو نہیں بھول گئی تھی۔ پرفارمنس تو ٹھیک رہی نا۔

سارے منتظر دماغ مطلوبہ منظر نہ دیکھ سکنے پر اس عشق کی نیچر کو پھر سے ڈسکس کرنے لگے۔

جس روز معاذ کے گروپ میں یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت لڑکی مونا شامل ہوئی' تو پھر روائتی عشق کی کوئی چنگاری دیکھنے کو سبھی منتظر تھے' لیکن جب ماہم نے سُر کی اس سنگت کی جی کھول کر تعریف کی تو مونا کھلنے کی بجائے مُرجھاتی چلی گئی۔ ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا معاذ جب پیانو کے سُر چھیڑتا تو مختلف ڈیپارٹمنٹ کی لڑکیاں برکھا بہار کی گھٹا بن اُمڈتی چلی آتیں' لیکن جونہی ماہم کا جھونکا قریب سے گُزر جاتا تو سب یوں چھٹ جاتیں' جیسے پانی گھرے بادلوں کو ہَوا کا تیز جھولا کرچی کرچی کر ڈالے اور برسے بنا ہی مطلع صاف ہو جائے۔

جس روز ماہم کا پہلا ڈرامہ ٹیلی کاسٹ ہوا' ہوسٹل کے سبھی لڑکے لڑکیاں ٹی۔ وی روم میں موجود تھے اور رومانوی جذباتی سین پر معاذ کے چہرے پر کچھ ٹٹولتے تھے' پر اُس کے چہرے پر تو کسی نقاد جیسی سنجیدگی اور غیر جانبداری مسلط تھی۔ وہ تو ماہم کی اداکاری کے معیار کو آنک رہا تھا اور اس نے کہا تھا۔

''ایک سا کام ایک سی بات سبھی کرتے ہیں لیکن کبھی وہی کام' ویسی ہی بات دوسروں سے اس قدر مختلف اور نمایاں کوئی کیونکر کر جاتا ہے۔ یہی فن کا معجزہ ہے اور یہی معجزاتی تاثیر' معمولات کو غیر مرئی عمل سے گزار کر لافانی بنا دیتی ہے۔'' شاید اسی معجزہ' کشش کو عشق کا نام دیا گیا ہے۔ اسی معجزے کی تاثیر تھی کہ تمام لڑکے لڑکیوں نے دونوں کا ایک دوسرے پر حق ایسے ہی تسلیم کر لیا تھا جیسے کسی مفتوح جرنیل نے اپنا نشانِ امتیاز اپنے ہم منصب کو پیش کرتے ہوئے کھلے عام پسپائی کا اعلان کیا تھا' فتح کے اس پھریرے کو لہراتے ہوئے سبھی دیکھتے اور دست برداری کی اس دستاویز پر دو چار آہیں بھر دستخط کرتے اور اس غیر روائتی عشق کی کیمسٹری پھر سے ڈسکس کرنے لگتے۔

اُس وقت اس غیر روائتی عشق نے بڑا روائتی موڑ لیا' جب دونوں نے اپنے اپنے خاندان کی مخالفت کو دیکھتے ہوئے کورٹ میرج کر لی۔ تب اس عشق کی روائت گھروں' محلوں' اخباروں اور مسجدوں سے جُڑنے لگی۔

ایک فرقے کی لڑکی کا کسی دوسرے فرقے کے لڑکا سے نکاح' کس نے جائز قرار دیا۔ مذہب نے' علماء نے' معاشرے نے' خاندان نے' کسی نے بھی تو نہیں۔ اس نکاح کا ٹوٹنا مذہب کی سلامتی سے مشروط تھا۔ سنگ ساری کا فتویٰ جاری ہو گیا' وہ لڑنے لگے۔ خاندان سے' معاشرے سے' علماء سے' اُنہوں نے ہر ایک کو بتایا۔ اُن کی شادی کسی مذہب' کسی عقیدے کے تحفظ کے لیے نہ تھی۔ کسی خاص مسلک کی حامل نسل پروان چڑھانے کے لیے بھی نہ تھی۔ کسی روائتی عشق کی پیداوار بھی نہ تھی۔ یہ تو دو ذہانتوں کے ٹکراؤ کا منطقی نتیجہ تھی' جس کی فطری کشش کی کُنڈی میں کوئی مذہب' عقیدہ' رسم روائت کچھ بھی نہ اٹکتا تھا۔ یہ ماوراء زمین حادثہ انسانی مجبوریوں اور کمزوریوں سے اتنا لاتعلق کیوں ہوا کرتا ہے۔ اُنہوں نے منت کی

اُنہیں اکٹھا رہنے دیا جائے۔ ایک دوسرے کے لیے نہیں۔ ایک دوسرے کی صلاحیتوں کی تکمیل کے لیے کہ ادھوری قابلیتیں' نامکمل ہنرمندیاں' ذہن اور جسم کا دیمک ہوجایا کرتی ہیں۔ اُنہیں ضائع ہونے سے بچالیا جانا چاہیے لیکن معجزۂ فن کی نمود کے لیے باہمی لیاقتوں سے کشید کی جانے والی توانائی اس بے کار لڑائی میں ضائع ہونے لگی۔ ان ذہانتوں اور اہلیتوں کو بچانے کے لیے' خود کو محفوظ کر لینا ضروری تھا۔ دونوں نے بڑے ہی غیر روائتی انداز میں الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا' معاذ اپنی کزن کے دولہے کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنے عقیدے کا محافظ بن گیا' اور ماہم نے اسی پروڈیوسر (جس کے ڈرامے کی وہ ہیروئن تھی) کے بچے کی ماں بن کر مسلمان نسل کو تحفظ دے دیا۔ یہ محبت کی کہانی بڑی سہولت کے ساتھ اپنے روائتی انجام کو پہنچ گئی تھی۔ اب اسے فائل کور لگا کر ریکارڈ روم میں ڈال کر بھول جانا چاہیے تھا۔ ایسے ہی جیسے تاریخ بہت سے خونی اوراق کو کتابوں کی موٹی جلدوں میں گھونٹ دیا کرتی ہے۔ انسانوں کا مزاج بھی عجب ہے' بھولنے پر آئیں تو ہلاکت خیز زلزلے یادداشتوں میں دراڑ تک نہ چھوڑیں' محفوظ کرنے پر آئیں تو دراڑ کے بال کو بھی سنبھال رکھیں۔ معاذ کی بیوی ربیعہ کی یادداشتوں کو ماہم کی ضربوں نے چکنا چور کر دیا تھا۔ وہ قربت کے انتہائی لمحوں میں بھی تڑپ کر الگ ہوجاتی۔

''میں نے خود سُنا' خود تمہارے تالو کی لرزش میں ماہم ماہم کی پکار تھی۔ اسی طرح جیسے تمہارے پیانو کے تاروں میں سُر نہیں ماہم ماہم کا ردِھم ہوتا ہے۔''

اُس نے پیانو بجانا چھوڑ دیا۔ تو مہوش کو یہ آواز اُس کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی میں سُنائی دینے لگی' تو کیا اب وہ دھڑکن بھی بند کر ڈالے۔ اُس کے وجود کی سنسناہٹوں میں' اُس کے لمس کی ٹھنڈک میں' دورانِ گفتگو اُس کی خاموشی میں اور خاموشی کی گفتگو میں' ماہم ماہم کا شور مچا رہتا۔ وہ کانوں میں اُنگلیاں دبا کر چیخ اُٹھتی۔

''معاذ تم ایک ساز کی مانند ہو' جس کے ہر ہر تار میں ایک ہی سُر بولتا ہے اور یہی سُر میری چڑ ہے۔ اس کی تکرار میرا بھیجا چیر گئی ہے' تم نے پیانو بجانا چھوڑ دیا کہ اس کے سُروں کے آہنگ چھپے راز اُگل دیتے تھے۔ یہ نت نئے قیمتی تحائف اور پالتو بلی ساتمہارا والہانہ انداز ہی تو گواہ ہے کہ ان پردوں کے پیچھے کچھ اور چھپا ہے۔ نہیں رہ سکتی' نہیں رہ سکتی میں ایک تقسیم شدہ انسان کے ساتھ۔''

وہ دھڑام سے دروازہ بند کر کے خود کو قید کر لیتی گھنٹوں۔۔۔ دنوں۔۔۔ وہ آفس سے لوٹتا تو وہ روٹھی ہوئی ملتی۔ وہ اُسے پیار کرتا تو وہ مزید روٹھ جاتی کہ وہ اُسے فریب دلانے کو یہ ڈرامہ رچا رہا ہے کہ وہ باہر کسی اور سے مل کر نہیں آیا۔ اگر وہ الگ ہو کر بیٹھ جاتا تو وہ سامنے پڑی ہر چیز اُلٹ دیتی کہ وہ باہر کسی اور سے مل کر آ رہا ہے۔ اسی لیے تو اُسے اُس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اُسے یقین دلاتے دلاتے تھک جاتا۔ پر وہ بے یقینی کے کرب میں کبھی نہ تھکتی۔ معاذ نے اُس کے لیے اِک گیت بنایا' جس کے ہر ہر حرف میں مہوش کو پرویا۔ پر وہ ناراض ہوگئی کہ جس آہنگ پر یہ گیت بج رہا ہے۔ اُس میں ماہم کا سُر پرویا ہے۔ وہی سُر جو اُس کی سماعتوں کا عذاب ہے۔

جس روز اُس نے اپنا کمرہ الگ کیا۔ اُس روز شوبز کی خبروں میں سرفہرست ماہم کی طلاق کی خبر تھی۔ فریقین نے ایک دوسرے پر بہت سے الزامات لگائے تھے لیکن ربیعہ کو اس کی ایک ہی وجہ معلوم ہوئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کا نام بار بار بھول جاتی ہوگی اور معاذ معاذ کا سُر اُس کے بدن کے ساز میں سے بکھرتا ہوگا' وہ معاذ معاذ کے ردِھم پر بجتی ہوگی۔ وہ جس کے ساتھ رہتی ہے۔ اُس میں سے کسی اور کو کھوجتی ہوگی۔ تبھی تو یہ معمول ہوگیا۔ شادی اور طلاق' پھر شادی اور پھر طلاق' کبھی کسی اداکار سے' کبھی ہدایت کار' کبھی کوئی سیاست دان' یہ سہ ماہی اور شش ماہی' شادیاں اپنے پیچھے کئی نفسیاتی توجیہات چھوڑ جاتیں۔ وہ مختلف مردوں میں معاذ کا لمس ڈھونڈتی ہے۔ وجود پہلے لمس کے ردِعمل کا عادی ہو جاتا ہے۔ پہلے لمس کی تلاش لمسیات کی فطری خواہش تک جاری رہتی ہے۔ لمسیات کی فطرت زیرِ بحث آتی۔ وجود کے عمل اور ردِعمل کا پورا نظام پہلے لمس کی برقیات کا اسیر ہو جاتا ہے' جیسے ماں کا لمس لمسیات کا تعارفیہ اور پھر عمر بھر اُسی ذائقہ کی بھوک بڑھتی ہی رہتی ہے جیسے پہلے محبوب کا پہلا لمس اور پھر روم روم اُسی پہلی دستک پر اولین ردِعمل کا عادی ہو جاتا ہے۔ بعد کے سب لمسیات تو پہلے لمس کی تلاش کی ناکام کڑیاں ہیں۔ ہر نا کامی نئی تلاش کا رائیگاں سفر ہے۔

وہ معاذ کے لمس کی تلاش میں ہے۔ پر معاذ نے تو ربیعہ میں سے ماہم کو ڈھونڈنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی۔ پر وہ ہمیشہ معاذ میں سے دستِ پناہ کے ساتھ ماہم کو چُن چُن کے باہر نکالتی رہی۔ وہ اُسے قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا کہ جو کچھ اُس نے باہر نکالا ہے۔ وہ محض اُس کے اپنے وجود کا حبس ہے۔ ماہم کی متعفن لاش نہیں ہے اور جب وہ یقین کرنے کے قریب ہوتی۔ تو ماہم ایک اور طلاق لے لیتی اور پھر معاذ کی بساندیں مارتی لاش ماہم کے کندھوں پر دھری نظر آتی' لوگ کہتے۔ وہ پہلے محبوب کی تلاش میں کھونٹ کھونٹ چھان رہی ہے۔ اُس کا عدم اطمینان اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ جس میں بستی ہے۔ اُس ساڈھونڈنے کے لیے ماری ماری پھرتی ہے اور جس سرائے میں ٹھہرتی ہے اُس میں پہلے پڑاؤ کے نشان ڈھونڈتی رہتی ہے۔ یہ تو خود ربیعہ بھی جانتی تھی کہ معاذ کی سانسوں میں کس کے پتھر وجود کا کافور جما ہے' جب وہ نیند میں بُڑبُڑاتا ہے۔ تو محض ایک ہی لفظ کی سمجھ آتی ہے۔ ماہم اُس کی کروٹ کروٹ میں کس کی یاد کی تھکن چور ہے۔ اُس کے خوابوں کے سلسلے میں کس کے آنچل کی لہلہاہٹ ہے۔ کس کے تصور میں وہ اکیلے میں مسکرا دیتا ہے اور محفل میں اُداس ہو جاتا ہے اور جب وہ اُس کے ساتھ ہوتا ہے تو دراصل اُس کے ساتھ نہیں ہوتا' اُس نے جو گیت بنایا ہے جس کے حرف حرف میں ربیعہ کو پرویا ہے۔ پر جس آہنگ پر یہ گیت بج رہا ہے۔ اُس میں ماہم کا سُر پرویا ہے۔ اُس نے معاذ کے ساتھ اُس نئے اسٹیشن پر جانے سے انکار کر دیا۔ جہاں اُس کی ٹرانسفر ہوئی تھی کہ سفر کے لیے سیٹ کا خالی ہونا ضروری ہے۔ بھرے ڈبے کے پائیدان پر سفر کرنا اُس کو گوارا نہ تھا۔

معاذ وجود کے ہر ہر خانے' شلف' سیف کھول کھول دکھاتا رہا۔ سب خالی ہے۔ تمہارے انتظار میں سب دریچے کھلے ہیں۔ پر وہ اِن منہ پھٹ طاقچوں کو اُس گھر کی مانند قرار دیتی جس کا سارا سامان لوٹا جا چکا ہو' اور وہاں اب لٹنے کے لیے کچھ باقی نہ بچا ہو۔ خانماں برباد شخص کی بے حسی اور قناعت اُسے اس بھنڈار میں کچھ بھی محفوظ کرنے سے روکتی تھی' جس کا ہر در' ہر کُنڈا' ہر تالا اُکھاڑ دیا گیا تھا۔

ماہم کی نئی شادی پر اُس کے ایک سابق شوہر نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ناگن جسے پہلی بار ڈنگتی ہے۔ اس کے لہو کا ست اُس کے وجود کا حصہ ہو جاتا ہے۔ وہ اُس کی تلاش میں گھومتی ہے۔ بہت سوں کو ڈستی ہے' لیکن پہلے ڈنگ کی لذت میں سرگرداں رہتی ہے۔ بالآخر اُسے برس بعد برس ڈھونڈ نکالتی ہے۔ ڈسنے کے لیے۔''

اگرچہ ماہم نے پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے ان بے ہودہ الزامات کی سختی سے تردید کی تھی لیکن جب کسی اخباری نمائندے نے اُس سے پوچھ لیا تھا۔

کیا آپ اپنے پہلے عشق میں رہنے کی کوشش میں محبت کے تجربات کیے جا رہی ہیں۔

یہ تو بس اک کوشش سی تھی پہلے پیار میں رہنے کی
سچ پوچھو تو ہم لوگوں میں کس نے عشق دوبارہ کیا

تو اُس وقت اپنی تمامتر ذہانتوں اور تحمل مزاجی کے باوجود اُسے جواب دینا نہ آیا اور وہ متعلقہ اخباری نمائندے پر برس پڑی اور اُس کے برسنے کے انداز نے پھر بھولی ہوئی کہانی دوبارہ یاد دلا دی اور ایک بار پھر معاذ اور ماہم کی عشقیہ کہانی شہ سرخیوں کے ساتھ اخبارات کی زینت بنی۔ معاذ اُن دِنوں بیرونی دورے پر تھا' جب وہ واپس آیا' تو گھر خالی تھا اور اخبارات بھرے ہوئے تھے' مہوش روٹھ کر جا چکی تھی۔ معاذ تحائف سے لدا پھدا اُس کے دروازے پر دستکیں دینے لگا' دستکوں کی بازگشت میں درخاموش تھے اور تحائف بولتے تھے' اللہ جانے اُس نے طلاق کے بعد کا عرصہ کہاں گزارا ہو۔ ان ایکٹرسوں کے لیے تو امریکہ گھر آنگن سا ہی ہے نا بھرے ہوئے پیالے کو بھرنے کا فائدہ' چھلک ہی تو جانا ہے اسے' معاذ اپنی لاتعلقی کا یقین دلانے کو قسمیں کھاتا' خط لکھتا' فون کرتا رہا۔ ربیعہ انتظار کرتی لیکن جونہی کال موصول ہوتی۔ معاذ کے گلے میں ماہم کا سُر بجتا سنائی دیتا اور فون رکھ دیتی' معاذ بند دروازے پر پھر دستکیں دیتا' جن میں ماہم کی پوروں کی دھڑکن کا آہنگ شامل ہوتا۔ وہ دستکیں بجاتا رہا۔۔۔ ''بجاتا رہا۔۔۔'' بے ثمر دستکوں سے آواز اُبھری' آج کا اخبار پڑھ لو' اس کے بعد اس دروازے پر کبھی دستک نہ دینا' یہ اُس کے لیے اب کبھی نہ کھلے گا' جس کے وجود کی شراکت داری کسی اور سے مشروط ہے۔

اُس روز جب خاموش دستکوں کی سنسناہٹوں میں لپٹا وہ واپس پلٹا' تو اس غیر روائتی عشق کی روائت کی سولی سے لٹک گیا' اخبار نے سرخی جمائی تھی۔

''تلاش ابھی ناتمام ہے۔''

معروف اداکارہ کی ایک گُم نام کیمرہ مین سے نئی شادی۔

گویا ماہم ابھی زندہ تھی۔ ناتمام تلاش زندگی کے فریب پر دھڑکتی رہتی ہے۔ تمام ہو چکی تلاشِ زندگی کو آسودگی کے سرد ہاتھوں میں منجمد کر دیتی ہے۔

تمام ہو چکی تلاش کا انجماد نس نس میں اُترنے لگا تھا۔ کوئی بوجھل ہاتھ دل کو پکڑے دھڑکنیں تیز کرتا کبھی بند کرتا کبھی کھولتا' ربیعہ قریب ہوتی تو اس بے ترتیبی میں بھی ماہم ماہم کا ردھم سُن لیتی' نسوں میں رگوں میں' وجود میں اضافی کچرا بھرا تھا۔ اس کی صفائی ہوتے رہنا ضروری ہے۔ ورنہ یہ رکاوٹ اور اٹکاؤ زندگی کی نس بندی کر دیتا ہے۔ ماہم زندہ ہے کہ وہ بند نسوں رگوں میں تازہ بہ تازہ لہو کی گردش سے بھل کی تہہ جمنے نہیں دیتی' وجود کی نہر کی مسلسل صفائی آبِ زندگی کی روانی کا باعث ہے۔ متعفن موری سی زندگی جا جا رکتی تھی۔ چھلکے' جالے' خالی لفافے' ٹوٹے اور کرچیاں۔ سب کچھ بساند چھوڑتی گار میں تبدیل ہو گئے تھے۔ بے روانی رکاوٹ جھٹکے کھاتا ہوا بہاؤ۔ کبھی منوں ٹنوں رکاؤ کو زوردار پریشر سے کھائی میں دھکیلتا تو کبھی بساند زدہ موریوں کو بلاک کرتا ہوا' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا ڈرائیور یہ دھک دھک سننے کا عادی تھا۔ پر آج بے ترتیبی حد سے زیادہ تھی' جیسے وجود کا گٹار بجتے بجتے بے ردھم ہو گیا ہو' جیسے دل کی سارنگی کا کوئی تار ٹوٹ جائے۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک طرف روکی اور موبائل پر دفتر اطلاع کی' صاحب کو دِل کا دورہ پڑا ہے' جو جان لیوا۔۔۔ اُس کے ہاتھوں میں وہ اخبار بھنچا تھا' جس میں ماہم کی نئی شادی کی خبر ضمنی سرخی کے طور پر چھپی تھی۔ ''تلاش ابھی ناتمام ہے۔''

اس جملے کے آہنگ پر دل کی بے ترتیب دھڑکنیں آسودگی کے سکوت میں اُترتی چلی گئیں' جیسے کسی تاریک سُرنگ کی خاموشی' پیانوں کے تاروں کی آسودگی جیسے کسی غیر روائتی عشق کی روائتی موت۔۔۔

سارے جہاں سے اچھا۔۔۔

مورخہ ۹۔ جون ۱۹۳۸ء

بھائی محمد حسین۔

آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے یعنی میں کیا لکھوں؟ لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا'' پڑھی تو میرا دل اُبھر آیا۔ اور دورانِ قید تو سینکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

آپ کا

مولانا داس کرم چند گاندھی

''مگر حقیقت ہے!''

رینو بہل
(چنڈی گڑھ)

کبھی کبھی کسی کو جاننے کے لیے ایک عمر بھی کم پڑ جاتی ہے اور کبھی پہلی ہی ملاقات میں لگتا ہے کہ آپ اس شخص کو جانتے پہچانتے ہیں۔ پچھلے چھ مہینے میں آلوک نے اپنی زندگی کی کتاب کا ہر ورق اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ ورندا کے لیے اب آلوک کی زندگی کھلی کتاب تھی مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ہر شخص کی کتاب میں کچھ سیاہ ورق بھی ہوتے ہیں جس کی تحریر وہ خود سے بھی چھپا کر رکھتا ہے۔ کچھ ایسے ہی پنّے اُس کی کتاب کے بھی تو ہیں جنہیں وہ کسی پر عیاں نہیں کر سکتی۔

آئینے کے سامنے بیٹھے بال بناتے اُس نے خود کو ایک بار گہری نظروں سے دیکھا اور ہلکے سے مسکرا دی۔ کتنی بدل گئی ہے وہ۔ سالوں پہلے اُس نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ کبھی خود پر توجہ ہی نہیں دی نہ تو اُسے اس کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ہی اُس کے پاس وقت تھا خود کے لیے۔ زندگی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ بھاگتے دوڑتے ہی سرسری نظر آئینے پر ڈالی اور کام کے لیے نکل گئی۔ مگر اب سکول سے ریٹائر ہونے کے بعد اُس کے پاس وقت ہی وقت ہے۔ آلوک کے آنے کے بعد مُرجھائی خواہشوں کی کونپلیں پھر سے پھوٹنے کو بے تاب ہو اُٹھیں ہیں۔ زندگی میں رنگ بکھرنے لگے ہیں۔ آلوک نے ایک شام اُسے کہا تھا:

''تمہاری کشادہ پیشانی پر لال بندیا بہت جچے گی۔ ایک دن لگا کر دیکھنا۔''

''بندیا اور میں؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں۔۔۔تم۔۔۔کون روکے گا تمہیں؟''

اُس نے مجرم کی طرح نگاہیں جھکا لیں۔ ایک بیوہ ہوتے ہوئے وہ بندیا کیسے لگا سکتی ہے؟

آلوک نے اُس کے ہاتھوں پر اپنا گرم ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

''کب تک سوچتی رہو گی لوگوں کے بارے؟ زندگی تمہاری ہے۔ جی بھر کر جی لو۔''

''تم مرد ہو اس لیے یہ بات آسانی سے کہہ سکتے ہو۔''

''بات مرد اور عورت کی نہیں۔ بات سوچ اور نظریہ کی ہے۔ زندگی ایک بار ملتی ہے اور ہم اپنی حسرتیں اپنی خواہشیں اس لیے دبا لیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟ نہ جانے کتنے دن ہمارے حصّے کے بچے ہیں اس لیے ہر دن بھرپور زندگی جی لو۔''

ورندا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اُس کی آنکھوں میں اُس کے بیان کی صداقت تولتی رہی۔

آلوک کو جاننے کے بعد وہ یہ تو سمجھ گئی تھی کہ Age is just a number عمر کے ساتھ جسم تو ڈھل جاتا ہے مگر دل بوڑھا نہیں ہوتا۔ نہ خواہشیں مرتی ہیں اور نہ جذبات۔ وقت اور حالات کے ساتھ ان کی آنچ ضرور مدھم پڑ جاتی ہے۔ آلوک بے شک زندگی کی ستر بہاریں دیکھ چکا تھا مگر پھر بھی جواں دل تھا۔ نظم وضبط کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے خود کو Fit اور تندرست رکھتا تھا۔ متوسط قد، گندمی رنگت اور بالوں کی چمکتی چاندنی کے باوجود جینے کی آرزو اور دل کی خواہشوں کو بجھنے نہیں دیا۔ اُس کی زندگی میں بھی کئی طوفان آئے، تیز آندھیاں بھی چلیں، چراغ کی لَو بھی تھرتھرائی مگر اُس کے بلند حوصلوں نے اُس لَو کو بجھنے نہیں دیا۔ اُس کی یہ ہی سوچ اور جذبات ورندا کی زندگی کی شاہراہ پر چلنے کو اُکسانے لگتے۔

آلوک سے ملنے سے پہلے اُس کی زندگی بے رنگ اور نیرس تھی جسے جیئے جانا محض ایک رسم ہو۔ بیس برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ پچیس برس کی عمر میں دو بچوں کی ماں بن گئی اور تیس برس کی عمر میں بیوہ بھی ہو گئی۔ اُس کا وجود پت جھڑ کے موسم میں تیز ہواؤں کا سامنا کرتا ٹنڈ منڈ شجر تھا۔ کئی بہاریں آئیں مگر اس پیڑ پر بہار کا رنگ نہیں چڑھا۔ ذمہ داریوں اور ضرورتوں نے گھر کی دہلیز پار کرائی تو ایک نئی دنیا سے آشنائی ہوئی۔ گھر کی محفوظ چار دیواری کے باہر ایسا جنگل تھا جدھر ہر طرف رال ٹپکاتے کُتے اور بھوکے بھیڑیئے جوان جسموں کے شکار کو تاک لگائے بیٹھے تھے۔ خوف سے وہ لرز اُٹھی پھر کچھ ایسے مہربان بھی ملے جنہوں نے شکاریوں کے چُنگل سے بچنے کا ہُنر بھی سکھا دیا۔ زندگی آسان بنانے کے لیے اُس نے خواب، خواہشوں، حسرتوں کے دروازے بند کر دئے اور دوستوں کی تعداد محدود کر لی۔ اُس کی دنیا اُس کی خوشیاں صرف اُس کی اولاد تک سمٹ کر رہ گئی۔ حالانکہ روحی ریحان سے دو سال چھوٹی تھی مگر بھائی سے زیادہ سمجھدار اور زیادہ حساس۔ جب تک سکول کی پڑھائی مکمل نہیں ہوئی دونوں ماں کے ساتھ آتے جاتے۔ تینوں کا وقت کیسے گزر جاتا انہیں پتا ہی نہیں چلتا۔ پھر سکول چھوٹا، آنے جانے کا ساتھ چھوٹا تو بچوں کو نیا ماحول نئے دوست ملے۔ پرندے کو کھُلا آسمان ملا تو اُس کی پرواز بھی اونچی سے اُونچی ہوتی گئی۔ نیا ماحول، نئے رشتے، نئی منزلوں کی چاہ نے نئی دنیا بسا دی۔ جیسے جیسے اُن کی مصروفیت بڑھی ویسے ویسے ماں کا انتظار بھی بڑھتا گیا۔ اب اُس کا وقت پرندوں کے گھر لوٹنے کے انتظار میں گزرتا۔ وقت گزرتا رہا پرندے اپنی اپنی منزلوں کو پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنے گھونسلے بنا کر ماں کو ذمہ داریوں سے فارغ کر دیا مگر موہ کے جال میں پھنسی ممتا خود کو اس موہ جال سے نکال نہ سکی۔ موہ اور ممتا ایسی دلدل ہے جس میں انسان دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ پھر ایک روز ایسی بجلی چمکی کہ ماں کی آنکھوں پر پڑی ممتا کی پٹی جل اُٹھی۔ خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ گری۔ ساری عمر اُس نے اپنے وجود کو نکار کر صرف موہ کے پیچھے بھاگتے گزار دی۔ اس شدید جھٹکے نے اُسے زمین پر پٹک کر وجود کی حقیقت سے آشنا کر دیا۔

ریحان کے رنگ تو شادی کے دوسرے دن ہی بدل گئے تھے مگر اُس کو یہ احساس نہ تھا کہ یہ رنگ سال بھر میں اتنا گہرا ہو جائے گا کہ سبھی رنگ پھیکے پڑ

جائیں گے۔ وہ خاموشی سے بدلتے رنگ دیکھتی رہی۔ روحی پاس ہوئی تو اُس کو دل کے چھالے دکھا دیتی۔ بیٹی بیاہ کر سات سمندر پار اپنے شوہر کے ساتھ نئی دنیا سجانے میں لگی تھی۔ اُسے اُس وقت اپنے زخم دکھانا ورندا کو مناسب نہیں لگا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اُس کے دُکھ کا سایہ بھی بیٹی کی خوشیوں پر پڑے۔ لہٰذا خاموشی سے بدلتے رنگ، بدلتا موسم دیکھتی رہی۔ اُس روز وہ ٹوٹ کر بکھر گئی جب ریحان نے دوٹوک بات کرتے ہوئے کہا:

''ماں آپ اگلے مہینے اوپر والا حصہ کرایہ داروں سے خالی کرالیں ہم اوپر شفٹ ہو رہے ہیں۔''

''کس سے الگ ہو رہے ہو؟ مجھ سے؟ کیا کہتی ہوں میں تمہیں؟'' اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''ہمیں Privacy چاہیے''

''Privacy میں دخل دیتی ہوں؟''

''آپ کو اب اپنی زندگی جینی چاہیے''

''میری زندگی تو تم ہو'' اُس نے آنکھوں میں آئی نمی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

''اب یہ اموشنل بیلک میل کرنا چھوڑ دے ماں۔ ہمیں ہماری زندگی جینے دے۔ اگر کرایہ دار نہیں گئے تو مجبوراً ہمیں کہیں اور گھر دیکھنا پڑے گا۔''

اتنا کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

جس اولاد کی خاطر اپنی زندگی قربان کر دی اُسے ایک منٹ نہیں لگا ماں کی قربانیاں فراموش کرنے میں۔ صدمہ گہرا تھا لہٰذا چوٹ کو بھرنے کے لیے اُسے کئی روز لگ گئے۔ کبھی انسان ٹھوکر کھا کر ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے تو کبھی وہ سنبھل بھی جاتا ہے۔ یہ چوٹ تیس برس پہلے والی چوٹ سے بھی گہری تھی۔ اُس وقت اس کے پاس جینے کا سہارا تھا دو پھول سے بچوں کی زندگی کے گرم سرد موسم کے تھپیڑوں سے بچا کر پروان چڑھنا اور اب تو جینے کا کوئی مقصد ہی نہیں بچا تھا۔ زندگی پھر اُسی موڑ پر آ کر کھڑی ہو گئی جدھر دُور دُور تک راستہ ویران اور منزل نظروں سے اوجھل۔ نہ پاؤں میں چلنے کی ہمت نہ جینے کی تمنا۔

درد کی شدت انسان کو خاموش کر دیتی ہے۔ الفاظ تو اندر تک چبھتے ہیں مگر خاموشیاں مار ڈالتی ہیں۔ انسان کو بھی اور رشتوں کو بھی۔ ورندا کو چُپ کا روگ لگ گیا۔ وہ بیٹے کی کہی بات بھول نہ سکی۔ بیٹے نے بھی چُپ کی دیوار توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ ہر گزرتا لمحہ فاصلے بڑھاتا رہا۔ مایوسی میں اضافہ کرتا رہا۔ حیرتوں کے بندھ ٹوٹ کر ماں کی آنکھوں سے برستے رہے۔ جو بیٹا ماں کو ایک روز کے لیے بھی اپنے سے دُور نہیں جانے دیتا تھا وہ آج اُسی ماں کو بڑی آسانی سے تنہا چھوڑ کر اپنی بیوی بچے کو لے کر الگ دنیا بسانے چلا گیا۔ نہ جاتے وقت دُکھ تھا نہ ملال۔ نہ ماں نے شکایت کی نہ اُسے روکا۔ لب خاموش تھے مگر خاموشی سے دعاؤں کی چھاؤں میں بیٹے کو رُخصت کر دیا۔ ایک ہی چھت کے نیچے اجنبی بن کر رہنے سے بہتر ہے ایک ہی شہر میں دُور دُور رہ کر سانس لی جائے۔

موبائل کی گھنٹی نے اُسے خیالوں کی دنیا سے حقیقی دنیا میں پہنچا دیا۔ اُس نے آئینے میں خود کو دیکھا تو ماتھے پر چپکی لال بندیا اُتار کر دوبارہ ڈبی میں ڈال دی۔ فون آلوک کا تھا یہ بتانے کے لیے کہ وہ پندرہ منٹ میں اُسے لینے آ رہا ہے۔

آلوک سے اُس کی ملاقات سینئر سٹیزن ڈیٹنگ ایجنسی کے ذریعے ہوئی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ سالوں بعد ایک شام رشمی اچانک اُس سے ملنے آئی۔ اُس کا اجڑا حال دیکھ کر وہ پریشان ہو اُٹھی۔ جتنی دیر اُس کے ساتھ رہی اُسے سمجھاتی رہی، اندر تک جھنجھوڑتی رہی، اُس کے سوئے ضمیر کو بیدار کرتی رہی۔ اگلی صبح وہ دندناتی ہوئی پھر آئی اور ورندا کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اُسے اپنے ساتھ لے گئی۔ وہاں جا کر اُسے پتا چلا کہ اُس جیسے بے شمار لوگ ہیں جو تنہائی کا عذاب سہہ رہے ہیں مگر اُن میں زندگی جینے کی آرزو ہے وہ اس عذاب سے لڑنا چاہتے ہیں، باہر نکلنا چاہتے ہیں اور اپنی زندگی کا آخری پڑاؤ ہنسی خوشی گزارنے کے خواہش مند ہیں۔

ایجنسی میں سب سے پہلے کاؤنسلر نے اُس سے ملاقات کی اُس کی زندگی کے اوراق پڑھے، اُس کے زخم دیکھے، اُس کی پریشانیاں محسوس کیں اور اُس کی نفسیاتی اُلجھنوں سے نجات دلانے کی کامیاب کوشش کی۔ جب وہ دو گھنٹے بعد رجسٹر کرا کر ایجنسی سے باہر نکلی تو خود کو بڑا ہلکا محسوس کیا۔ اُس کے چہرے پر سکون کا رنگ دیکھ کر رشمی کا چہرا بھی کِھل اٹھا اور مسکراتے ہوئے کہا۔

''دوستوں سے ملتے رہنا چاہیے۔ ہر مرض کی دوا ہوتی ہے اُن کے پاس'' مسکرائے بنا ورندا بھی نہ رہ سکی۔

اگلے روز ایجنسی والوں نے شام چار بجے اُسے دوبارہ کسی سے ملنے کے لیے فون پر بلا لیا۔ رشمی اُسے ساتھ لے کر گئی۔ فارم میں بھری تفصیل، اُس کے مزاج اُس کی دلچسپیوں کے مطابق آلوک کو اُس کے لیے مناسب پارٹنر چُنا۔ آپس میں بات کر کے ملاقات کر کے آگے کا فیصلہ وہ خود کر سکتے ہیں۔

ورندا کے لیے ایجنسی میں آ کر کسی مرد سے ملنا اتنا آسان نہیں تھا۔ ساری رات وہ خود سے اُلجھتی رہی۔ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس عمر میں اسے یہ قدم اٹھانا چاہیے یا نہیں؟ کیا اُسے واقعی کسی ساتھی کی ضرورت ہے؟ اس عمر میں وہ کسی مرد سے ڈیٹنگ کرے گی تو لوگ کیا کہیں گے؟ بچوں کو جب معلوم ہو گا تو کیا جواب دے گی انہیں؟ عورت کی ساری زندگی سب کو جواب دیتے ہی گزر جاتی ہے۔ پہلے والدین، پھر شوہر پھر بچے۔ اسی کشمکش میں اُس نے رات گزار دی اور فیصلہ وقت کے ہاتھوں چھوڑ کر سو گئی تھی۔

آلوک سے ایک گھنٹے کی ملاقات نے اُس کے دل کے خوف کو کافی حد تک کم کر دیا تھا۔ آلوک کی سادگی اور صاف گوئی نے اُسے یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ اچھے دوست ضرور بن سکتے ہیں۔

آلوک کا بھرا پورا پریوار تھا۔ جائداد تھی، دولت تھی، نام تھا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ تنہا تھا۔ بتیس سال شادی شدہ زندگی کا ہر سُکھ دے کر ایک روز

''چہارسُو''

اُس کی بیوی موت کی آغوش میں چلی گئی۔ادھر وہ ریٹائر ہوا اُدھر بیوی کا ساتھ چھوٹ گیا۔گھر پر دو بیٹے دو بہویں چار پوتا پوتی تھے۔سب خیال رکھتے تھے۔ بہوؤں نے گھر اچھے سے سنبھال لیا۔زندگی پٹڑی پر لوٹ آئی تھی۔صبح جلدی اُٹھ کر سیر اور یوگا کی عادت نہیں چھوڑی تھی۔وقت پر کھانا، وقت پر سونا، سارا دن خود کو کبھی باغبانی کبھی گھوم پھر کر، کبھی موسیقی سن کر، اچھی کتاب پڑھ کر، بچوں کے ساتھ بیٹھ کر دن اچھے سے گزر جاتا۔ پھر دھیرے دھیرے سب کی مصروفیت بڑھنے لگی۔ چھوٹے بچے بھی بڑے ہوگئے تھے۔اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جارہا تھا۔وقت پر کھانا مل جاتا، کپڑے الماری میں ٹانگ دیئے جاتے مگر اب کسی کے پاس فرصت نہیں تھی دو پل اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کا حال جان لے۔ پہلے سب کھانا ساتھ کھاتے تھے اور اب کسی کے کھانے کا کوئی وقت نہیں تھا۔وہ کھانا وقت پر ہی کھاتا تھا مگر اکیلے۔اکیلے بیٹھ کر کھانے سے اُس کی بھوک بھی آدھی ہی رہ گئی ہے۔

زندگی کے دس سال اسی طرح گزر گئے مگر اب اُسے راتوں کی تنہائی پریشان کرنے لگی تھی۔آنکھوں سے نیند اُڑ جاتی، کروٹیں بدلتے بدلتے سر بھاری ہو جاتا، جسم ٹوٹنے لگتا۔اُسے شدت سے ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہونے لگی جو اس کے دکھ سکھ میں شریک ہو جس سے وہ دل کی بات کر سکے جو اُس کا خیال رکھے۔جس اولاد کی خاطر اُس نے زندگی کے دس سال گنوا دئے اُن کے پاس اب دس منٹ کی فرصت بھی نہیں اُسے کے پاس بیٹھنے کی۔سب اپنی اپنی زندگی میں خوش ہیں تو وہ کیوں اُداس ہے؟ وہ تنہائی کی سزا کیوں کاٹ رہا ہے؟ اُسے دنیا سے کیا لینا؟ کیا جانے کتنے دن زندگی کے باقی ہیں؟ دل میں جب ولولے اُٹھنے لگے تو اُس نے اپنے قریبی دوست کے آگے دل کھول کر رکھ دیا۔اُس نے آلوک کو ایجنسی کا راستہ دکھایا۔ پانچ ہزار روپے دے کر اُس کی رجسٹریشن ہوئی مردوں سے رجسٹریشن کی رقم لی جاتی ہے جبکہ عورتوں کو یہ معاف ہے۔اپنے ذوق، شوق، حالات زندگی، پسند ناپسند کے متعلق ساری تفصیل وہاں درج کرا دی۔ ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایجنسی سے فون آ گیا۔پہلی کی ملاقات اُس کی ورندا سے ہوئی۔ ہر لحاظ سے اُسے ورندا مناسب لگی دونوں کا دُکھ یکساں تھا۔دونوں تنہائی کا شکار تھے اور دونوں اس خول سے باہر نکلنا چاہتے تھے۔

پھر سلسلہ آگے بڑھا فون پر باتوں کا، ملاقاتوں کا، ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جاننے کا، خوشی اور غم میں شریک ہونے کا۔ کچھ ہی دنوں میں اجنبیت ختم ہوگئی اور بے تکلفی کا رنگ گہرا ہو گیا۔آپ سے تم تک کا سفر چند ملاقاتوں میں ہی طے ہو گیا۔اب دونوں ایک ساتھ گھومنے جانے لگے۔دیر رات ڈنر کر کے گھر لوٹتے۔آلوک کے اصرار پر وہ اُس کے ساتھ فلم بھی دیکھنے لگی تھی اور ورندا کی فرمائش پر وہ اس کے ساتھ مندر بھی جانے لگا۔اداسیوں کے بادل چھٹنے لگے، تنہائیوں کا احساس مٹنے لگا خوشیوں کے رنگ زندگی میں بھرنے لگے اور پیار کی خوشبو پھیلنے لگی۔ چہ مگوئیاں ہونے لگیں مگر دونوں ان باتوں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتے گئے۔آلوک کا یہ معمول بن گیا تھا کہ وہ اُس کے سارے دن کا حساب لیتا۔اُس کی ہدایت پر اب ورندا جلدی سو کر صبح جلدی اٹھنے لگی تھی۔صبح کی سیر اور یوگا بھی شروع کر دی تھی۔کھانے پینے میں بد پرہیزی بالکل بند۔ورندا کو اچھا لگتا تھا کہ کوئی تو ہے جس کو اس کی صحت کی فکر ہے۔ دونوں کی ادھوری خواہشوں کی فہرست بڑی طویل تھی۔ دھیرے دھیرے مل کر ان خواہشوں کی تکمیل کا انہوں نے ارادہ کر لیا تھا۔

چھ مہینوں میں وہ اپنے دُکھ تکلیف، اکیلے پن کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ جینے کی آرزو پھر سے زندہ ہوگئی تھی۔ایک احساس جو دل میں گھر کر گیا تھا کہ اُن کے جینے کا نہ تو کوئی مقصد ہے اور نہ ہی کسی کو ضرورت ہے، وہ اب مٹ چکا تھا۔ادھوری خواہشوں کو پورا کرنے کی بے تابی بڑھ گئی تھی۔اب باقی کی زندگی وہ ایک ساتھ اچھے دوست اچھے ساتھی بن کر گزاریں گے۔زندگی کا آخری پڑاؤ خوشگوار اور رنگین بنانا طے کر لیا تھا تاکہ مرتے وقت یہ ملال نہ ہو کہ زندگی گزر گئی اور انہوں نے کچھ کیا نہیں۔

آلوک نے ورندا کے گھر کے باہر گاڑی روکی تو اُسے منتظر پایا۔ یہ احساس اُسے سرشار کر گیا کہ کوئی اُس کے انتظار میں بیٹھا ہے، کسی کو اُس کی ضرورت ہے۔

''بہت اچھی لگ رہی ہو ہمیشہ کی طرح'' ورندا کے گاڑی میں بیٹھتے ہی آلوک نے کہا۔

وہ ہلکے سے مسکرا دی۔

گاڑی ایجنسی کی طرف چل پڑی۔

''تم نے بتا دیا ریحان کو؟''

''نہیں۔فارملیٹیز پوری کرنے کے بعد بتاؤں گی۔اور تم نے؟''

''میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی ویسے بھی اگر ہم شادی کرتے تو جائیداد کو لے کر انہیں مسئلہ ہوتا اب تو کوئی دقت ہی نہیں۔''

''جیسا تم ٹھیک سمجھو۔روحی کے کانوں سے میں نے بات نکال دی ہے۔''

''کیا کہتی ہے؟''

''اُسے Shock لگا۔''

''پھر؟''

''پھر کچھ نہیں۔وقت کے ساتھ سمجھ جائے گی۔'' ورندا نے لاپرواہی سے کہا۔

آلوک اُس کا جواب سن کر کھلکھلا پڑا۔

''وہ چھ مہینے پہلے والی ورندا کدھر گئی جو سہمی سہمی، خوفزدہ رہتی تھی جسے ہر وقت یہ بات ستاتی تھی کہ لوگ کیا کہیں گے؟''

''وہ ورندا مر گئی۔اس ورندا کو اب اپنے حصے کی خوشیاں بٹورنی ہیں۔اسے جی بھر کر جینا ہے۔'' اس نے پُر اعتماد نظروں سے آلوک کو دیکھتے

ہوئے جواب دیا۔

دونوں نے ایجنسی پہنچ کر بنا شادی کے ایک ساتھ لِو اِن رلیشن شِپ میں رہنے کا کنٹریکٹ سائن کیا۔ دونوں کا راضی نامہ تھا کہ دو آزاد انسانوں کی طرح باقی کی زندگی گزاریں گے۔ ایک دوسرے کے ساتھی بن کر ہر سُکھ دکھ میں ساتھ نبھائیں گے۔ گھر کے کام باہر کے کام کون کرے گا، ہر ماہ گھر کے خرچ کے علاوہ آلوک اس کے سارے اخراجات کا ذمہ بھی لے گا۔ جسمانی کیفیات کے بارے میں دونوں نے اپنی پوزیشن واضح کردی تھی۔

ایجنسی سے باہر نکلتے ہی آلوک نے پوچھا۔

"اب کیا حکم ہے؟"

"میرے گھر چلو بیگ تیار کر کے آئی تھی۔ ریحان کو فون بھی کرنا ہے"

"تم پہلے سری نگر گھومنا پسند کرو گی یا مہا کلیشور مندر جانا؟"

"تم جہاں لے چلو گے مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بس میرے گھٹنوں کے درد کا خیال رکھنا" ورندا نے اس پیار اور اعتماد سے کہا کہ آلوک کا چہرہ کِھل اُٹھا۔

گھر سے سامان لے کر ایک بھرپور نگاہ ورندا نے گھر پر ڈالی اور گھر کی چابیاں کرایہ داروں کو دے کر وہ آلوک کے پاس آ گئی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے ریحان کا فون ملایا۔ پہلی بار اُس نے فون نہیں اٹھایا گھنٹی بج کر بند ہوگئی۔ دوسری بار لمبی گھنٹی کے بعد جب فون اٹھایا تو کوئی دُعا سلام نہیں۔ نہ ہی حال احوال پوچھا۔

"بولو ماں کیسے یاد کیا؟"

"تجھے بتانا تھا کہ میں جا رہی ہوں اور گھر کی چابیاں کرایہ داروں سے لے لینا۔ اب تم اپنے گھر میں شفٹ ہو سکتے ہو۔"

"کدھر جا رہی ہیں آپ؟"

"تم نے ہی کہا تھا نہ کہ اپنی زندگی جیو؟ وہ ہی کرنے جا رہی ہوں۔"

"کب واپس آئیں گی؟"

"میں نے ایک ساتھی چُن لیا ہے اُسی کے ساتھ جا رہی ہوں۔ پتا تمہیں بعد میں بھیج دوں گی۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ شادی کر رہی ہیں؟ آپ ایسا نہیں کر سکتی؟" وہ تقریباً چیختا ہوا بولا۔

"کیوں نہیں کر سکتی؟ کیا مجھے جینے کا حق نہیں؟ بہت ہو گیا دوسروں کے لیے جینا۔ اب مجھے اپنے لیے جینا ہے۔ اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو مجھے کسی کی ضرورت نہیں تھی مگر تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ اب تم اپنی زندگی جیو اور مجھے میری زندگی جینے دو۔ خوش رہو۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ اور ہاں فکر نہ کرو میں کسی سے شادی نہیں کر رہی۔"

"ماں آپ۔۔۔"

ورندا نے فون کاٹ کر سوئچ آف کر دیا۔۔۔!

تصویرِ بُتاں

(غیر معروف شعراء کے معروف اشعار)

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

..... حیرت الہ آبادی

چاہت کا جب مزہ ہے کہ وہ بھی ہوں بیقرار
دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی

..... ظہیر دہلوی

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

..... ظہیر دہلوی

کہہ رہا ہے موجِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

..... سعید احمد ناطق لکھنوی

بھانپ ہی لیں گے اشارہ سرِ محفل جو کیا
تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں

..... لالہ مادھو رام جوہر فرخ آبادی

کیا خوب برق تو نے دکھایا ہے زورِ طبع
کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

۔۔۔ لالہ رام رکھا برق

چند تصویرِ بُتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے یہ گھر سے مرے ساماں نکلا

..... بزم اکبر آبادی

اب مجھ سے کاروبار کی حالت نہ پوچھئے
آئینہ بیچتا ہوں میں اندھوں کے شہر میں

..... محمود سروش

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخیِ نقشِ پا کی

..... میر حسین تسکین

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے دل آزاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

..... منّو لال صفاؔ لکھنوی

عید قرباں سے پہلے۔۔۔

ڈاکٹر شکیل احمد خاں
(کراچی)

پینتالیس سالہ ابراہیم نے اوپر تلے کی اپنی دونوں لڑکیوں کو زینت کے سامنے لا کھڑا کیا، دونوں بہنیں اپنی جسمانی ساخت میں ایک دوسرے کی ضد تھیں، لمبے قد والی جو غالباً عمر میں بڑی تھی نہایت دبلی پتلی اور بیمار سی لگ رہی تھی جب کہ دوسری کا قد تھوڑا چھوٹا مگر صحت میں اچھی اور جسم بھرا بھرا تھا، چہرے کے نقوش اور رنگت کے لحاظ سے بھی وہ پہلی والی سے بہتر تھی، زینت انہیں قریب سے دیکھنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھی اور بڑی والی کو نظر انداز کرتے ہوئے سیدھی چھوٹی کے پاس جا پہنچی ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ماروی'' اس نے مختصر جواب دیا

''ماروی کی عمر کیا ہوگی؟'' زینت نے ابراہیم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کوئی تیرہ۔۔چودہ''

اس نے ایک بھرپور نظر ماروی کے سراپے پر ڈالی ''یہ شادی کے قابل تو ہوگئی ہے نا۔۔''

''جی ادی''

پھر وہ جانوروں کے دلّال کی طرح اسے گھما پھرا کر، بدن کے ایک ایک عضو خاص طور پر آگے پیچھے کی ابھرتی ہوئی چھوٹی بڑی گولائیوں کا ہاتھ پھیر کر جائزہ لینے لگی، جائزے کے دوران ابراہیم اور اس کی بڑی بیٹی کی نظریں زمین میں گڑھی ہوئی تھیں، خود ماروی زینت کی حرکاتِ بے جا سے پریشان بار بار اپنے باپ کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی مگر وہ تو خود اس سودے کا ایک فریق تھا، کیسے مدد کرتا، مجبوراً اس نے خود کو زینت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا،

''ابرہیم۔۔! مجھے یہ ماروی پسند ہے''

اس نے کوئی جواب دینے سے پہلے اپنی دونوں بیٹیوں کو اندر بھیجا، پھر زینت کے سامنے ہاتھ باندھ کر سر جھکاتے ہوئے بولا ''جیسی آپ کی مرضی ادی۔۔ مجھے تو اپنے بیٹے اسماعیل کے علاج کے لیے رقم چاہیے''

''وہ تمہیں کراچی پہنچ کر مل جائے گی۔۔تم ماروی کو صاف ستھرے کپڑے پہنا کر لے آؤ، ہمیں اب چلنا ہے۔۔رات اسلام کوٹ رک کر صبح کراچی روانہ ہو جائیں گے''

''ٹھیک ہے ادی'' یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

زینت کا لڑکیوں کے حصول کے لیے اندرونِ سندھ آنا جانا لگا رہتا تھا، اُسے یہاں اچھا اور سستا مال با آسانی مل جاتا تھا لیکن ان کی تلاش کا آغاز وہ شہر کے بڑے بڑے سرکاری ہسپتالوں سے کرتی تھی جہاں گاؤں گوٹھ کے غریب اور مجبور لوگ اپنی معمولی جمع پونجی کے ساتھ علاج کی غرض سے آتے تھے اور رقم ختم ہونے پر پریشان ہو جاتے تھے، وہ ان سے ان کی پریشانی اور مجبوری کا پہلے سودا کرتی پھر ان کی بہن بیٹیوں کو شہر میں لا کر اپنے دھندے میں استعمال کرتی تھی، اُسے اس کام میں ''بڑے لوگوں'' کی آشیر باد حاصل تھی اسی لیے وہ بلا خوف و خطر اور مکمل پروٹوکول کے ساتھ سارے سندھ میں گھومتی رہتی تھی، وہ کوئی خاندانی پیشاور نہیں تھی ،اس کام کو اختیار کرنے سے پہلے اس نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پالنے کے لیے اپنی ایف اے تک کی تعلیم کی بنیاد پر مختلف آفسوں میں کام کیا لیکن اس کی خوب صورتی ہر جگہ عذابِ جان بنی اور ہر باس اس سے آفس کا کام لینے کے بجائے اُسے اپنے ذاتی استعمال میں لانے کا خواہش مند رہتا تھا، یوں اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے کئی نوکریاں چھوڑیں، آخر کار ایک باس نے اس پر قابو پا کر اُسے عزت دار سے عزت فروش بنا دیا اور وہ جو گھر کی زینت تھی اب لوگوں کے بستر کی زینت بننے لگی، اس دھندے میں آنے کے بعد اس نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی رسائی شہر میں اچھی ساکھ رکھنے والے طاقت ور بیوروکریٹ، تاجر اور سرمایا داروں تک بڑھائی اور اپنی گفتار، حسنِ سلوک اور مہذّبانہ طور طریقوں کی بدولت جلد ہی اپنا ایک مخصوص و محدود حلقہ بنا لیا اور ان کے دلوں پر راج کرنے لگی، اس طرح اس کی ان ٹٹ پونجیوں سے بھی جان چھوٹ گئی جو وقت بے وقت اسے تنگ کرتے رہتے تھے، مگر اس دھندے میں عورت کا توتی اس وقت تک بولتا رہتا ہے جب تک حسن اور جوانی اس کا ساتھ دے، زینت کو بھی اس تلخ حقیقت کا سامنا اُس وقت کرنا پڑا جب وہ سن یاس (menopause) کو پہنچی، اُس نے اس تبدیلی کو خندہ پیشانی سے قبول کیا اور جسم فروش سے منیجر (نائیکہ) بن گئی اور اپنے حلقے میں لڑکیاں سپلائی کرنے لگی، اس پیشے میں اس نے ماضی کے تجربات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کچھ اصول بھی وضع کیے، وہ گاہک کی خوشنودی کے لیے جہاں لڑکی کی کم عمری، کنوارپن، بلوغت اور صحت کو ذہن میں رکھتی تھی وہاں لڑکی کے تحفّظ کے لیے وہ ایک وقت میں ایک ہی گاہک کو بلاتی تھی اور دونوں کو موذی بیماریوں سے بچانے کے لیے کنڈوم استعمال کرواتی تھی، اجتماعی زیادتی کے خدشے کے پیشِ نظر وہ لڑکی کو گاہک کی مطلوبہ جگہ بھیجنے کے بجائے اپنے بنگلے میں اس کا بندوبست کرتی تھی، صحبت کے دوران یا صحبت کے بعد کسی لڑکی کی حالت خراب ہو جانے کی صورت میں اس نے ایک ماہر لیڈی ڈاکٹر کا انتظام بھی کر رکھا تھا جو ایک فون کال پر دوڑی چلی آتی تھی، وہ لڑکی کو عموماً ایک ماہ اپنے پاس رکھتی تھی اور ہر دن کی بجائے ایک ہفتے کے وقفے سے گاہک کو پیش کرتی تھی پھر اسے لیڈی ڈاکٹر سے کلیئر کروا کے واپس والدین کے پاس بھیج دیتی تھی، اس کا ان صولوں پر سختی سے پابند رہنے کا یہ عالم تھا کہ وہ سودا چھوڑ دیتی تھی لیکن اصول نہیں توڑتی تھی، اس کی اس وضع داری سے حلقے کے کچھ لوگ خوش تو کچھ ناخوش بھی تھے مگر وہ اسی طرح اپنا کام کرتی رہی، کوئی سال بھر

''چہار سُو''

پہلے اس کی جواں سال غیر شادی شدہ بیٹی بریسٹ کینسر میں مبتلا ہوگئی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن منتقل ہوگئی اور اس کے علاج پر اپنی ساری جمع پونجی لگادی، حتیٰ کہ اپنا ذاتی بنگلہ بھی ایک دوست بیوروکریٹ نذیر بیگ کے پاس گروی رکھ دیا، علاج کرانے کے بعد وہ واپس پاکستان لوٹی اور بیگ صاحب سے اپنا ہی بنگلہ معمولی کرائے پر لے کر، علاج سے بچ رہی تھوڑی بہت رقم سے اپنا گزر بسر کرنے لگی، اس نے بیٹی کی صحت یابی تک سپلائی کے کام کو موقوف کر دیا تھا، ایک ہفتے پہلے اس کی بیٹی کی پھر طبیعت خراب ہوگئی اور ڈاکٹر نے دوسری کیموتھراپی تجویز کی، جس کے لیے فوری طور پر ایک بڑی رقم درکار تھی، زینت نے دوبارہ بیگ صاحب سے رابطہ کیا اور بیٹی کے علاج کے لیے اور عید سے پہلے اچھا مال فراہم کرنے کے وعدے پر ان سے ایک بڑی رقم ایڈوانس میں لی اور اپنی بیٹی کو ایک نجی ہسپتال میں داخل کرا دیا، اس کے بعد وہ خود شکار کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی، اتفاق سے اسے اگلے دن ہی ایک سرکاری ہسپتال میں ایک تھری مزدور ابرہیم ٹکرا گیا، وہ اپنے جوان بیٹے کو جس کے گردے ناکارہ ہو چکے تھے، علاج کے لیے تھر سے یہاں لایا تھا مگر پیسے ختم ہو جانے کے باعث بہت پریشان تھا، زینت جیسی گھاگ عورت نے منٹوں میں اُسے شیشے میں اتار لیا اور اُسے لے کر آج ہی اس کے گاؤں پہنچی تھی۔

سورج دن بھر اپنی کنواری کرنوں کا شباب بیچ کر جب مغرب میں ڈوبنے کی تیاری کر رہا تھا، سرکاری نیم پلیٹ کی حامل کالے رنگ کی ڈبل کیبن گاڑی نے دو مسلح محافظوں کے ساتھ جو گاڑی کے پچھلے کھلے حصے میں آنکھوں پر کالی عینک لگائے اور چہرے پر فلسطینی رومال لپیٹے چوکنا بیٹھے تھے کراچی ٹول پلازا پار کیا، ابراہیم کسی سوچ میں گم، آنکھیں بند کیے، ڈرائیور کے ساتھ والی نشست پر جب کہ زینت اور ماروی پچھلی نشستوں پر بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں، اس طویل سفر میں وہ دونوں ایک دوسرے سے خاصی گھل مل گئی تھیں، ماروی کا گاؤں سے شہر کی طرف یہ پہلا سفر تھا، اس لیے وہ سفر کے آغاز میں کچھ کچھ اداس اور خاموش تھی لیکن ہائی وے پر آنے جانے والی چھوٹی بڑی گاڑیوں، دیوہیکل ٹریلروں اور اطراف کی دیگر چیزوں کو دیکھ کر اس کی اداسی پہلے حیرانی میں بدلی، پھر ان کے بارے میں زینت سے پوچھنے پر اس کی خاموشی بھی ٹوٹ گئی، اس طرح ان کے درمیان قایم اجنبی ماحول رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔

حکومت کی جانب سے لگائی گئی مویشی منڈی جو اس وقت دور سے ایک روشن ہالے کی طرح دکھائی دے رہی تھی پہنچتے پہنچتے ٹریفک کی رفتار سست ہوگئی، ہر طرف عوام اور گاڑیوں کا ہجوم تھا، لوگ اپنے اپنے جانور پرائیویٹ ٹرانسپورٹ میں لاد کر شہر جانے کے لیے کوئی صحیح سمت میں تو کوئی غلط سمت سے موڑوے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا جس کی وجہ سے ٹریفک کی روانی میں بار بار خلل پڑ رہا تھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے۔۔؟ اور لوگ گاڑی میں جانور بھر بھر کے کہاں لے کر جا رہے ہیں؟'' ماروی نے یہ سب حیرت سے دیکھتے ہوئے زینت سے پوچھا

''یہ کراچی کی سب سے بڑی مویشی منڈی ہے۔۔ یہاں مختلف شہروں سے جانور بکنے آتے ہیں۔۔تمہارے تھر سے بھی بہت مال آتا ہے۔۔ یہ لوگ قربانی کے لیے جانور خرید کر اپنے گھر لے جا رہے ہیں''

''لیکن اس بھیڑ کی وجہ کیا ہے۔۔؟'' اس نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بھیڑ کی شکل بناتے ہوئے سوال کیا:

''میری بھولی ماروی۔۔'' زینت نے مسکراتے ہوئے کہا ''اس بھیڑ کی وجہ۔۔کل کی بڑی عید ہے۔۔زیادہ تر مسلمان عید کے پہلے دن جانوروں کی قربانی کرتے ہیں۔۔تمہیں نہیں پتا۔۔!''

آخری جملے پر ماروی نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا، پھر ایک گہری اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی ''بڑوں سے سنا ہے یہ عیدیں پیسے والوں کی ہوتی ہیں۔۔ان کا ہم تھر واسیوں سے کیا میل۔۔زندگی بھر بھوک اور بیماری سے لڑنے والوں کو نہ ان کے آنے کا پتا چلتا ہے نہ جانے کا''

اس کی یہ بات زینت کے دل پر چوٹ بن کر لگی اور وہ ملامت کے احساس تلے دب کر صرف اتنا کہہ سکی ''اچھا چھوڑو۔۔ دکھی نہ ہو۔۔اب تو پتا چل گیا ناں۔۔کل قربانی ہوتے دیکھ بھی لینا''

''ویسے یہ قربانی کیا ہے۔۔؟ اور اس کا عید سے کیا تعلق۔۔!''

''قربانی کسی کے عشق یا محبت میں، اپنی ہر چیز حتیٰ کہ اپنی جان بھی سچّے دل سے قربان کر دینے کا نام ہے۔۔ اللہ تعالیٰ نے جب اپنی راہ میں حضرت ابرہیم سے اپنا چہیتا بیٹا حضرت اسماعیلؑ قربان کرنے کے لیے کہا تو وہ بغیر سوچے سمجھے اس آزمایش کے لیے تیار ہوگئے، اسی طرح بیٹے نے بھی اس آزمایش پر کوئی سوال نہیں اٹھایا اور دونوں قربان گاہ کی طرف چل دیے، ابراہیمؑ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے جیسے ہی زمین پر لٹایا اللہ تعالیٰ نے فوراً ایک جانور فرشتے کے ذریعے وہاں بھیجا اور اسمعیلؑ کے بجائے اُسے ذبح کروایا، اللہ کو ابراہیمؑ کے عشق کی یہ ادا اتنی پسند آئی کہ اُسے رہتی دنیا تک یادگار بنا دیا اور ہم مسلمان ہر سال اُسے عیدِ قرباں یا بڑی عید کے طور پر مناتے ہیں''

ابھی اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ ڈرائیور نے گاڑی الآصف پر روک دی اور پیچھے مڑ کے درخواست کرنے کے انداز میں زینت سے بولا ''میڈم اگر آپ کی اجازت ہو تو گاڑی یہاں سے بائیں لے لوں، مجھے پیراڈائیز بیکری پر ایک ضروری کام ہے۔۔صرف دس منٹ کے لیے''

''ٹھیک ہے۔۔لیکن زیادہ وقت مت لگانا'' اس نے درشت لہجے میں کہا

''جی بہتر ہے'' یہ کہہ کر اس نے گاڑی ابوالحسن روڈ پر لے لی، یہاں بھی دن نکلا ہوا تھا اور دونوں جانب کا بے ہنگم ٹریفک سست روی کا شکار تھا، اوپر سے ان کے ہارن اور بغیر سائیلینسر کی موٹر سائیکلوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، سڑکوں کی طرح پیدل راستوں کا بھی یہی حال تھا، ہر تھوڑے فاصلے پر جانوروں کے کھانے اور ان کو سجانے کی اشیاٗ دکان دار اپنے اپنے تھڑوں پر رکھے

بیٹھے تھے، کہیں چھری بغدوں پر دھار لگ رہی تھی تو کہیں بیوپاری اپنے چھوٹے بڑے جانور فروخت کے لیے لے کر کھڑے تھے، رہی سہی کسر ان لوگوں نے پوری کر دی تھی جو اپنے جانوروں کو سجا کر اِدھر سے اُدھر گھما پھرا رہے تھے، ان میں زیادہ تر تعداد بچوں کی تھی، ماروی شیشے سے اپنی ناک اور ماتھا چپکائے زندگی میں پہلی بار ایسے انوکھے مناظر کا سامنا کر رہی تھی، اچانک اس کی نظر لمبی قطار میں لگے شامیانوں اور ان میں میں کھڑے مختلف رنگوں کے اونچے اور بھاری بھرکم قربانی کے جانوروں پر پڑی، ان کے سامنے دیکھنے والوں کا رش بھی لگا ہوا تھا'' ماسی یہ کیا ہے۔۔؟'' وہ آنکھیں پھاڑ کر حیرانی سے بولی

انہیں دیکھ کر زینت کے چہرے پر بھی طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی ''نمود و نمایش۔۔ دکھاوا میری گڑیا۔۔ ہم مسلمانوں میں قربانی کے جذبے سے زیادہ ایک دوسرے سے مقابلے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔۔ ہم اللہ کی رضا کے بجائے محلّے پڑوس میں دھاک بٹھانے کے لیے تگڑا اور مہنگا جانور خریدتے ہیں، پھر ان کی اس طرح نمایش کرتے ہیں جب کہ اللہ کو جانور یا اس کے گوشت کی ضرورت نہیں، وہ تو قربانی کرنے والی کی نیت دیکھتا ہے''

زینت کی یہ بات اس کے کچھ پلّے پڑی کچھ نہیں پڑی مگر وہ اپنا بھرم رکھنے کے لیے ''اچھا'' کہنا نہ بھولی۔

ڈرائیور نے جیسے تیسے وہاں سے گاڑی نکالی اور بیکری کے قریب ایک محفوظ جگہ پر جہاں رش کم تھا، گاڑی پارک کر کے اپنے کام سے چلا گیا، اس کے جانے کے بعد ماروی زینت سے باہر چلنے کی ضد کرنے لگی، وہ آس پاس کھڑے جانوروں کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔

''جھلّی ہو گئی ہے کیا۔۔ چپکی بیٹھی رہ۔۔ پٹر پٹر مسلسل بولے جا رہی ہے۔۔ دیکھ نہیں رہی باہر کتنی بھیڑ ہے'' ابرہیم نے پہلی بار اپنی خاموشی توڑی

''بابا مجھے ان پیارے پیارے جانوروں کو پاس سے دیکھنا ہے۔۔ دیکھو ناں کیسے سجے ہیں۔۔ گاؤں میں تو ہم نے ایسا کبھی نہیں دیکھا۔۔ جانے دے بابا'' وہ بڑے حسرت بھرے لہجے میں بولی،

اس کی التجا سن کر زینت کو اپنی بیمار بیٹی یاد آ گئی، وہ بھی جانوروں سے بے حد محبت کرتی تھی، ہر سال بقر عید سے دو تین دن پہلے اپنے لیے ایک بکرا لاتی تھی اور اسے سجا کر محلّے بھر میں گھماتی پھراتی تھی، یہ سوچتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں مگر وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی ''تم فکر نہ کرو ابراہیم ۔۔ میں اس کے ساتھ رہوں گی''

زینت کی بات سن کر وہ کھل اٹھی پھر وہ دونوں گاڑی سے نیچے اترے اور اس کے ساتھ ہی لگ کر کھڑے ہو گئے، دونوں محافظ بھی ان سے کچھ فاصلے پر دائیں بائیں آن کھڑے ہوئے، ماروی وہاں سے گزرنے والے بکروں، دنبوں اور گائے، بیلوں کو جنہیں مختلف زیوروں، ہار پھولوں اور رنگین دوپٹوں کے علاوہ مہندی سے بیل بوٹے بنا کر سجایا گیا تھا، دل چسپی سے دیکھنے لگی، ان کی سجاوٹ دیکھ کر اس کے دماغ میں پھر ایک سوال کلبلایا جو وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی ''یہ انہیں سجایا کیوں گیا ہے ماسی۔۔؟''

''بہت سے بچّوں اور نوجوان لڑکوں کو جانور سجانے کا شوق ہوتا ہے، یہ اپنے بڑوں سے ضد کر کے عید سے پہلے جانور منگا لیتے ہیں، پھر انہیں کھلاتے پلاتے ہیں، روز نہلا دھلا کر سجاتے ہیں اور گلی کوچوں میں گھماتے پھرتے ہیں۔۔ وہ قربانی کے جانور کو اللہ کا مہمان سمجھتے ہوئے اس کی خوب خدمت کرتے ہیں'' زینت نے آس پاس کے شور کی وجہ سے اونچی آواز میں اُسے سمجھایا

''اچھا تو یہ بات ہے'' وہ سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی،

اسی اثنا میں ڈرائیور واپس آ گیا اور وہ سب گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے، ابھی گاڑی کچھ ہی دور چلی تھی کہ زینت کا موبائل فون بج اٹھا، اس نے کال ریسیو کرتے ہوئے موبائل کان سے لگا لیا،

''زینت صاحبہ کہاں رہ گئیں؟۔۔ خاصی دیر ہو گئی ہے'' دوسری طرف سے گمبھیر اور غصّے میں ملی جلی مردانہ آواز آئی

''بیگ صاحب، بہت معذرت۔۔ ہر طرف ٹریفک جام تھا۔۔ میں گھر پہنچ کر اور سب کچھ تیار کر کے آپ کو اطلاع کرتی ہوں۔۔ مشکل سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ اور لگے گا۔۔ ایک بات اور۔۔ ہو سکتا ہے میں آپ کو بنگلے پر نہ مل سکوں، کیوں کہ مجھے بیٹی کے پاس ہسپتال جانا ہے۔۔ ویسے خدا بخش وہاں ہو گا، اُس کے پاس آپ کا موبائل نمبر ہے، وہ فون کر کے آپ کے مشروبات کا بھی پوچھ لے گا'' وہ جواباً بولی۔

''او کے۔۔ میں آپ کے فون کا ویٹ کر رہا ہوں۔۔ اور ہاں میرے گارڈ اور گاڑی کو جلد فارغ کر دیجیے گا'' یہ کہہ کر دوسری جانب سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

بنگلے پر پہنچ کر سب نے کھانا کھایا، پھر زینت نے رقم سے بھرا ایک لفافہ ابراہیم کے سپرد کیا اور اسے ڈرائیور کے ساتھ ہسپتال روانہ کر دیا، اس کے بعد وہ ماروی کو تیار کرنے اپنی خواب گاہ میں لے گئی، پہلے اسے اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح مل مل کے نہلایا، پھر شب خوابی کا مہین لباس پہنا کر اس کا میک اپ کرنے لگی، ماروی یہ سب کچھ نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی سے برداشت کر رہی تھی، حتیٰ کہ اس لباس کو بھی جو اس کے معصوم اور پاکیزہ وجود کو چھپانے میں ناکام رہا تھا، اسی بنا پر وہ آئینے کے سامنے بیٹھی ہونے کے باوجود، اُس میں خود کو دیکھنے سے مسلسل کترا رہی تھی، کچھ دیر بعد جب اس سے رہا نہیں گیا تو وہ اس سے پوچھ بیٹھی،

'' مجھے اتنا کیوں تیار کر رہی ہو ماسی۔۔؟ وہ بھی قربانی کے جانور کی طرح۔۔ پہلے ٹکر مانی کھلائی پھر نہلایا، کپڑے بدلوائے، رنگوں سے چہرے کو سجایا، اب میرے بالوں میں پھول لگا رہی ہو۔۔ کیا میری قربانی کا وقت قریب آ گیا ہے۔۔؟'' اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے طنز کیا

''کیا مطلب؟''

'' ارے ماسی۔۔ یہ سچ ہے ہم گوٹھائی لوگ بڑے سیدھے ہوتے ہیں۔۔ مگر کچھ چیزیں ہمارے سامنے بچپن سے ہو رہی ہوتی ہیں۔۔ جس کام کے

لیے تم مجھے یہاں لائی ہو۔۔میں اسی کی بات کر رہی ہوں''

اس کا آخری جملہ کان میں پڑتے ہی وہ چونک پڑی اور ہاتھ روک کر حیرت سے اس معصوم بچی کو دیکھنے لگی جس میں ایک پوری عورت سمائی ہوئی تھی، ماروی کے بارے میں اس کا اندازہ غلط نکلا تھا،مگر یہ سوچ کر کہ وہ پہلے سے سب کچھ جانتی ہے،اسے خاصی حد تک اطمینان ہو گیا ورنہ اور لڑکیوں کی طرح اس سے بھی دماغ سوزی کرنی پڑتی، پھر وہ سنبھل کر اس سے مخاطب ہوئی ''چلو اگر ایسا ہی ہے۔۔تو تم اس کے لیے تیار ہو؟''

زینت کا سوال سن کر ماروی کے مسکراتے بھولے چہرے پر اچانک سنجیدگی کے بادل چھا گئے ''میں ماروی کے دیس کی ہوں ماسی۔۔ہم سے ہماری مرضی کب پوچھی جاتی ہے ۔۔!''اس کے اس جملے میں زمانے بھر کا درد سمٹ آیا تھا''ویسے بھی گاؤں گوٹھ کی ماروئیوں کو اپنے باپ، بھائی اور شوہر کا جائز اور ناجائز قرضہ چکانے کے لیے اکثر وہاں کے وڈیرے، کمدار، ان کی مرضی کے خلاف اٹھا کر لے جاتے ہیں۔۔اگر میں بھی اپنے پیارے بھائی کے علاج کے لیے قربانی دے رہی ہوں تو اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے''

یہ باتیں سن کر زینت کو واقعی کوئی اچنبھا نہیں ہوا، کیوں کہ اس دھندے میں اسے عموماً مجبور لڑکیوں سے اسی طرح کی باتیں سننے کو ملتی تھیں مگر عورت ہونے کے ناطے وہ اپنے دل میں اُس کا درد ضرور محسوس کر رہی تھی، جب سے اُس کی بیٹی کینسر میں مبتلا ہوئی تھی وہ بہت زیادہ حساس ہو گئی تھی، اُسے ماروی کی صورت میں اپنی بیٹی نظر آتی تھی اسی لیے وہ اس کا شروع سے خیال رکھ رہی تھی۔

ماروی کو تیار کرنے کے بعد اس نے بیگ صاحب کو فون ملایا اور انہیں آنے کی دعوت دینے لگی۔

''تاخیر کی معذرت بیگ صاحب۔۔اب آپ تشریف لا سکتے ہیں''

''بہت خوب۔تو آپ نے اپنا کام مکمل کر لیا''دوسری جانب سے مسرت کا اظہار کیا گیا''ویسے لڑکی آپ نے ہماری پسند کے مطابق منتخب کی ہے۔۔میں نے واٹس ایپ پر اس کی پکچر دیکھی تھی''

''شکریہ جناب۔۔پھر آپ آ رہے ہیں ناں۔۔!''

''ہاں ہاں محترمہ۔۔ہم ابھی حاضر ہوتے ہیں۔۔لیکن ایک رعایت درکار ہے، میرے ساتھ لاہور سے آئے ہوئے دو مہمان اور بھی ہیں۔۔''

مہمانوں کا سن کر زینت کی پیشانی پر بل پڑ گئے مگر اس نے تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی ملایمت سے کہا''بیگ صاحب۔۔لڑکی ابھی کم عمر اور ناتجربہ کار ہے، وہ تین مردوں کو جھیل نہیں پائے گی۔۔آج آپ اکیلے تشریف لے آئیں۔۔مہمانوں کے لیے میں کل کوئی اور بندوبست کر دوں گی''

''ایسی باتیں نہ کریں زینت صاحبہ۔۔پرانے تعلقات کا کچھ تو خیال کریں''لہجے میں لجاجت قایم تھی

''پلیز۔۔آپ میری بات سمجھیں بیگ صاحب۔۔اس طرح لڑکی کی جان جا سکتی ہے یا وہ شدید زخمی ہو سکتی ہے۔۔''

''ضد نہ کریں زینت صاحبہ۔۔کچھ نہیں تو میرے احسانات ہی سامنے رکھیں۔۔ابھی دو دن پہلے آپ کس طرح منہ لٹکائے میرے پاس آئی تھیں اور کینسر میں مبتلا اپنی بیٹی کے علاج کے لیے مجھ سے ایک بڑی رقم ایڈوانس میں لے کر گئیں تھیں۔۔کچھ اسی کا احساس کر لیں''

''میں ان کی دل سے قدر کرتی ہوں بیگ صاحب۔۔وہ میری ذات سے متعلق ہیں لیکن یہاں ایک لڑکی کی زندگی کا سوال ہے''

''مجھے ایسا لگ رہا ہے آپ دو افراد کے اضافے پر اپنی رقم بڑھانا چاہتی ہیں۔۔تو ٹھیک ہے۔۔میں رقم دگنی بلکہ تگنی کیے دیتا ہوں''بیگ صاحب کے لب و لہجے میں آہستہ آہستہ تلخی بڑھ رہی تھی

''بیگ صاحب آپ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔۔مجھے رقم سے زیادہ اپنے اصول پیارے ہیں''

زینت کے سخت جواب پر بیگ صاحب نے فوراً پینترا بدلا''آپ تو ناراض ہونے لگیں۔۔دیکھو زینت گاؤں دیہات کی لڑکیاں بڑی مضبوط ہوتی ہیں۔۔دو تین مردان کے لیے کوئی بڑی بات نہیں۔۔اور اگر اُسے کچھ ہو گیا تو ہم بیٹھے ہیں نا۔۔!سب سنبھال لیں گے''

''لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں۔۔میں اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتی''اس نے دوٹوک فیصلہ سناتے ہوئے کہا

''بھاڑ میں گئے تمہارے اصول''اچانک بیگ صاحب کا لہجہ اور بات کرنے کے آداب دونوں بدل گئے''میرے گھر میں رہتے ہوئے مجھے آنکھیں دکھا رہی ہو۔۔ایڈوانس رقم واپس کرو اور بنگلہ بھی۔۔میں اسی وقت یہ سودا ختم کرتا ہوں''وہ فون پر دھاڑتے ہوئے بولا

بیٹی کے علاج کے اخراجات کا سوچ کر کچھ لمحوں کے لیے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہوئے لیکن پھر وہ اپنے اصولوں پر ڈٹے رہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے حوصلے سے بولی''رقم تو اب میرے پاس نہیں ہے بیگ صاحب۔۔وہ میں نے لڑکی کے بھائی اور اپنی بیٹی کے علاج کے لیے دے دی۔۔مگر کچھ دنوں بعد میں اسے پھر بھی لوٹا دوں گی۔۔رہی بات بنگلہ خالی کرنے کی۔۔تو وہ کل تک خالی۔۔''

جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ اپنی شکست پر دوسری طرف سے چیخ اٹھا''مجھے ہر حال میں اپنی رقم ابھی چاہیے۔۔ورنہ میں تمہارے ساتھ تمہاری بیمار بیٹی کو بھی جان سے مار دوں گا۔۔تم جانتی ہو میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں''

زینت نے اس دھمکی کے جواب میں ایک طنزیہ''ہونہہ''بھری اور غصّے سے موبائل بند کر دیا، ماروی ان دونوں کی باتیں جو خاصی اونچی آواز میں ہو رہی تھیں پاس کھڑی سن رہی تھی، اس نے زینت کو متفکر دیکھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے سہلاتے ہوئے کہنے لگی''تمہیں اپنی بیٹی سے بہت پیار ہے ماسی۔۔؟''وہ

باقی صفحہ ۷۷ پر ملاحظہ کیجیے

اضطراب

قمر جمالی
(حیدرآباد، دکن)

وہ بڑی دیر سے یوں ہی ساکت کھڑی تھی ـــــ دم سادھے۔

سمندر کے کنارے اس طرح کھڑے نظارہ کرنے کا کوئی پہلا موقع نہ تھا، وہ کئی بار سمندر کے کنارے آچکی تھی۔ مگر آج ـــــ اس پر خوف طاری تھا۔ آج سمندر کے تیور بالکل مختلف تھے۔ موجوں کی تندی میں تشنج کی کیفیت تھی۔ لہریں ایک دوسرے پر چڑھتی، غرّاتی ہوئی اس کی طرف بڑھ رہی تھیں، وہ وہاں سے لوٹ جانا چاہتی تھی۔ مگر مجبور تھی اسکے پاؤں گھٹنوں گھٹنوں ریت میں دھنس گئے تھے۔

وہ دیکھ رہی تھی۔ ساکت آنکھوں سے ـــــ سینے میں نہ سنبھلتی سانسوں کا یلغار تھا۔

اس نے دیکھا ـــــ ایک سیاہ پہاڑ بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا تھا اور سمندر کی مہیب لہریں کسی عفریت کی طرح اس سیاہ پہاڑ کو اپنی پیٹھ پر لادے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

پتہ نہیں کیا ہوگیا تھا سمندر کو!

ورنہ ـــــ یہی لہریں اسے کتنی راحت بخشتیں ـــــ!

ان لوٹ پوٹ کرتی لہروں کو دیکھ کر اُسے ہمیشہ معصوم بچوں کی شرارتیں یاد آتیں۔ لہریں جب ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کے لئے ایک دوسرے پر چڑھ جاتیں اور لوٹتے ہوئے سمندر کے وشال سینے میں جذب ہوجاتیں تو اسے ماں کے آنچل کی ٹھنڈک اور بھینی بھینی شیریں خوشبو کا احساس ہوتا جسے وہ ننھے پھلا پھلا کر اپنے اندر سمیٹ لیتی اور ایک نئی تازگی اور قوت کا احساس کرتی تھی۔

مگر آج ـــــ سمندر اس سے بری طرح ناراض تھا۔ اندھیرے کا پہاڑ اب اس کے بالکل قریب آگیا تھا۔

''عفریت ـــــ!!''

اس کے جسم نے جھرجھری لی۔ اس نے دیکھا چشم زدن میں ایک قہر آلود لہر اس سیاہ پہاڑ کو اپنے شانوں سے اٹھا کر اس کی طرف پھینکنے کے درپے تھی کہ ـــــ اس نے زور کی ہانک لگائی۔

''یا خدا! ـــــ'' اس نے پوری قوت لگا کر پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی اور دوڑنے لگی۔ پتہ نہیں کیسے وہ ریت کے شکنجے سے آزاد ہوگئی۔

''موت اگر پیچھے پڑ جائے تو زندگی ہی مزاحمت پر اتر آتی ہے۔'' اس کے دل نے کہا۔

اب وہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بھاگ رہی تھی۔ وہ بھاگتی رہی۔ بس بھاگتی رہی۔ کتنے دن اور کتنی راتیں اسے یاد نہیں۔ اس کے پاؤں لہولہان ہوگئے اور جسم کی ساری توانائی سلب ہوگئی تھی، اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی اور اس کی بینائی اس کا ساتھ چھوڑنے لگی تھی۔ اب اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا اور سناٹا تھا۔ وہ بے سُدھ ہوکر گر پڑی۔

وہ بیہوش نہیں تھی اگرچہ اس کے حواس ساتھ چھوڑنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ اس میں ہلنے ڈولنے کی طاقت نہیں تھی۔ اس نے خود کو دھرتی ماں کے سپرد کردیا تھا۔ دونوں ہاتھ اور پیر پھیلا کر وہ زمین پر پسر گئی اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

اب ـــــ اسے ایک انجانے سکون کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ خود سے بے خبر ہوگئی۔

دوبارہ ـــــ جب اس نے آنکھیں کھولیں، صبح کی سپیدی پھیل رہی تھی۔ کھلے آسمان پر پنکھ پکھیرو اونچی پرواز کے لئے اپنے کس بل سدھار رہے تھے۔ حدِ نظر تک جنگل ہی جنگل تھا۔ درختوں کا ایک بے ہنگم سلسلہ..... وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اپنے پیروں کو یوں ہی دراز رکھے دونوں ہاتھوں کو پیچھے کی طرف زمین پر ٹیکے، اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگی۔

''چلنا چاہئے۔''

وہ پاؤں کو سمیٹنے کی کوشش کرنے لگی مگر پاؤں من من بھاری لگتے تھے۔ جسم اتنا ناتواں تھا جیسے کسی نے ساری توانائی نچوڑ دی ہو۔

''کبھی کبھی بے انتہاء لاچاری طاقت کا منبع بن جاتی ہے۔''

یہ اس کے شوہر کی آواز تھی۔ ''نوید ـــــ''

وہ یکلخت اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور چاروں طرف نظریں گھما گھما کر ڈھونڈنے لگی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے جھک کر اپنی ٹانگوں کی طرف دیکھا۔

''نوید میری طاقت کا سرچشمہ۔!!''

وہ خود سے گویا ہوئی، جھک کر دونوں پاؤں کو چھو کر محسوس کیا اور ـــــ پھر سے دوڑنے لگی۔

بے سمت ـــــ اور بے ارادہ ـــــ دوڑتے دوڑتے وہ بہت دور نکل آئی تھی۔ اس نے دیکھا ـــــ دور ـــــ کہیں ـــــ افق کے پار۔ ایک عمارت کے موہوم سایے آہستہ آہستہ نیچے کی طرف لڑھک رہے تھے۔ عمارت کے وہ موہوم سایے اسے منزل کے نشان لگے۔

اس نے اپنی رفتار تیز کردی۔ کہتے ہیں منزل کے نشان انسان کی ٹوٹتی امید کو ایک نئی توانائی بخشتے ہیں۔ اس کے اندر بھی ایک توانائی ابھر آئی تھی۔ وہ اب اس عمارت کے سامنے تھی۔

وہ ایک دواخانہ تھا۔ نہایت بوسیدہ اور خستہ حال۔ عمارت کے رنگ و

روغن انسانی لمس سے محرومی کا رونا رو رہے تھے۔ بڑی سرعت کے ساتھ وہ دواخانے کے اندر پہنچ گئی۔ اندر ایک بڑے ہال میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر اوپر کی منزل تک پہنچانے والی سیڑھیوں پر پڑی۔ وہ ان سیڑھیوں سے گذر کر ایک وارڈ کے سامنے رک گئی۔ لمحہ بھر توقف کر کے وہ بے دریغ اندر گھستی چلی گئی۔

''آپ اندر نہیں جاسکتیں۔'' ایک کرخت آواز والا سیکیوریٹی گارڈ اس کے راستے میں حائل ہوگیا۔

''کیوں ـــــ؟''

''یہ آئی. سی. یو ہے۔ یہاں داخلہ منع ہے۔''

''میرا بھی ـــــ؟''

اس نے حیرت سے 'بھی' کو لمبا کھینچ کر پوچھا۔

''کیوں آپ کچھ خاص ہیں؟''

''ہاں ہوں ـــــ اس وارڈ میں میرے شوہر ہیں۔''

''بہت سے شوہر، بہت سی بیویاں، نانیاں، دادیاں ہیں تو ـــــ؟''

سیکیوریٹی گارڈ نے تمسخر آمیز لہجے میں سوال کیا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

''تم مجھے اندر جانے سے روکو گے ـــــ؟''

''یہ میری ڈیوٹی ہے۔''

''کیسی ڈیوٹی ـــــ اندر میرے شوہر اکیلے ہیں۔ دیکھتی ہوں تم مجھے کیسے روکتے ہو؟''

اس نے سیکیوریٹی گارڈ کو پوری قوت سے پرے دھکیلا اور بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اپنے شوہر کے بیڈ تک پہنچ گئی۔

''ہائے ـــــ! جن ہاتھوں نے مجھے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچایا، جس کے پنجوں پر پاؤں رکھ کر میں نے اس مکر وفریب سے بھری دنیا کی سنگلاخ زمین پر چلنا شروع کیا۔ آج وہ کتنا بے بس ہے ـــــ!!''

اس نے اپنے سینے پر دوہتڑ مارے اور زار وقطار رونے لگی۔

''یہ کیا کیا تم لوگوں نے ـــــ؟ کیا کیا ان کے ساتھ ـــــ؟ یہ زندہ کہاں ہیں ـــــ بتاؤ مجھے میرا نوید کہاں ہے؟''

اس نے چیخ چیخ کر پورا وارڈ سر پر اٹھالیا۔

''یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟ چلئے۔ چلئے یہاں سے۔'' اندر کا عملہ اُسے روکنے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ ہاتھا پائی پر اُتر آئی اور جو چیز ہاتھ لگی اُسے توڑ پھوڑ دیا۔

''چھوڑو مجھے ـــــ چھوڑو ـــــ نہیں تو سب تباہ کردوں گی۔ دواخانے کو جلا کر راکھ کردوں گی ـــــ چھوڑو ـــــ چھوڑو ـــــ چھوڑو۔''

اس کی آواز اندر ہی اندر ڈوبتی چلی گئی۔

"Panic Attack" ڈاکٹروں نے تشخیص کیا۔ ویسے یہ جملہ وہ کئی بار سن چکی تھی۔

''لمّاں! سنبھالو اپنے آپ کو۔''

دو موٹے موٹے آنسو اس کی بیٹی کی آنکھوں سے ٹپک کر اس کے رخسار پر گر پڑے۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بیٹی اس پر جھکی اس کا چہرہ صاف کر رہی تھی۔

''میں ـــــ میں ـــــ میں کہاں ہوں؟''

''گھر پر ہی ہو۔ یہ دیکھو ہم سب یہیں ہیں آپ کے پاس۔''

اس نے سر گھما گھما کر اپنے اطراف دیکھا۔ بچیوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ اسے اپنے بازو پر سوائی چبھنے کا احساس ہوا اور اس پر غنودگی طاری ہونے لگی، پھر وہ دنیا سے غافل ہوگئی۔

''ایسا کب تک چلے گا ڈاکٹر ـــــ؟''

''اسٹرونگ ری فلیکسیز ہیں۔ کریٹیو مائنڈز کی یہی پرابلم ہوتی ہے۔ اسے وقت لگے گا۔ وقت سے اچھا کوئی مرہم نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں سدھارنے کے لئے دوائی کی نہیں Attention کی ضرورت ہے۔ علاج تو خود انہی کے ہاتھ میں ہے۔ آپ لوگ انہیں اس ماحول سے نکالئے۔ ورنہ یہ ڈپریشن میں چلی جائیں گی۔''

وقت کبھی یکساں نہیں ہوتا۔ اور ـــــ نہ ہی اچھا ہوتا ہے نہ برا۔ اس کا کام تو بس گذرنا ہوتا ہے۔ گذرتا ہی رہتا ہے۔ یہ تو حوادثِ زندگی ہیں جو زندگی کے نشیب وفراز کا تعین کرتے ہیں اور اپنے انمٹ نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ نشان سنگِ میل کی طرح زندگی کی راہ میں ثبت ہوجاتے ہیں اور انسان انہی میل کے پتھروں کو اچھا یا برا وقت گردانتا ہے۔ ثمر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ ماضی کسی آہنی شکنجے کی طرح اسے دبوچتا رہا۔ وقت اپنی چال چلتا رہا۔ اچھا یا برا گرداننے سے اس کی چال میں کوئی فرق نہ پڑا۔ پر ـــــ ثمر نا سٹیلجیا کا شکار ہوگئی۔

ویسے ـــــ ثمر کوئی اَن پڑھ یا جاہل عورت نہیں تھی۔ ایک ذمہ دار عہدے سے سبکدوش ہوئی تھی۔ خاصی پڑھی لکھی اور خدا پرست خاتون تھی۔ مگر اُس وقت تک، جب تک وہ خود کو پہچانتی تھی۔ یہاں معاملہ ہی الٹا تھا ـــــ ثمر خود کہیں کھوگئی تھی۔ کبھی کبھی اس کا وجود اس کے ہونے سے انکار کرتا اور وہ خود کو ڈھونڈتے بہت دور نکل جاتی۔

اکثر وہ انجماد کا شکار ہوجاتی۔ اپنے بستر کے ایک کونے میں گھنٹوں پڑی خلاء میں بیتے وقتوں کے لمحوں کو جوڑتی رہتی۔ پر یہی لمحے کبھی کبھی باردودی سالموں کی طرح پھٹ کر بکھر جاتے تو وہ خود کو ریزہ ریزہ منتشر ہوتے دیکھتی اور بے خود ہوجاتی۔

آج ـــــ صبح سے وہ بڑی مضطرب تھی۔ بچوں سے فون پر بات کی۔ ناشتہ کیا اور اپنے دارالامان یعنی بستر کے کونے میں دبک کر بیٹھ گئی۔ اُسے لگا اس کا دل پھسل کر دونوں پسلیوں کے پیچھے کلیجے میں اُتر آیا ہے اور فقط ایک تارِ نفس

سے معلق لٹک رہا ہے۔

ایک تلاطم تھا پسِ دیوار ـــــ! اگر پسلیوں کی دیوار آڑے نہ ہوتی دل کب کا سینہ پھاڑ کر باہر نکل پڑتا۔ شورشِ حیات جسم کے روم روم سے سنائی دینے لگی تھی۔ اس پر رعشہ طاری ہوگیا تھا۔ اسے یقین ہوگیا کہ دل شدید احتجاج پر اُتر آیا ہے۔ اب تارِ نفس ٹوٹنے کو ہے۔

''یا خدا ـــــ!!!'' اس نے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کرلیا اور گھٹنوں کو پیٹ کے اندر سمیٹ کر کروٹ لیٹ گئی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ خواب آور گولی، اس کی نجات دہندہ تھی، بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور نیند کی گولی منہ میں ڈال لی۔ کچھ ہی دیر میں اس پر غنودگی طاری ہونے لگی اور وہ اس باشعور دنیا سے بے خبر ہوگئی۔

مگر ـــــ شعور کے غائب ہوتے ہی ایک بار پھر وہ اسی دنیا میں پہنچ گئی جو اس کے لاشعور میں بسی تھی۔

وہی عمارت ـــــ وہی دواخانہ ـــــ وہی آئی. سی. یو وارڈ۔

اس نے دیکھا ڈاکٹروں کی ایک ٹیم اس کے شوہر کو اپنے حلقے میں لئے ہوئے تھی۔ اطراف پردہ کس دیا گیا تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی اندر پہنچ گئی۔

''وہاٹ نان سنس ـــــ!! انہیں اندر کس نے آنے دیا ـــــ؟''

''سیکیوریٹی ـــــ!!'' ڈاکٹر نے ہانک لگائی۔

''کیا ہوا ـــــ؟ کیا ہوا انہیں ـــــ؟ کیا کر رہے ہو تم لوگ ان کے ساتھ؟''

''چھوڑو مجھے۔ چھوڑو۔ میں تم سب کو مار ڈالوں گی۔ ختم کردوں گی۔''

''تم تو خود کو مسیحا سمجھتے ہونا۔ پھر یہ کیا کیا۔ میرے شوہر کو روز روز موت کی طرف کیوں دھکیل رہے ہو بتاؤ مجھے ـــــ بتاؤ'' وہ زور زور سے چلّانے لگی۔

''میم ـــــ میم ـــــ ان کا دل رُک گیا تھا۔ ہم اُسے REVIVE کر رہے ہیں۔ آپ پلیز باہر جایئے۔ پلیز۔''

''ـــــ سیکیوریٹی ـــــ!'' ڈاکٹر نے پھر سے سیکیوریٹی کو آواز دی۔

سیکیوریٹی کا عملہ اُسے گھسیٹ کر باہر لے آیا اور وارڈ کے سامنے ایک اسٹول پر بٹھادیا۔

وہ اسٹول پر بیٹھی روتی رہی ـــــ بے حساب ـــــ بے شمار جانے کتنے گھنٹے ـــــ!!

پھر کسی نے اسے وہاں سے ہٹانے کی جرأت نہ کی۔ وہ ایک پتھر کے بت کی طرح جم گئی۔ ہوش تو اس وقت آیا جب کسی نے اُسے شانوں سے پکڑ کر ہلایا۔

''امّاں ـــــ چلو۔''

''کہاں ـــــ؟ اندر تیرے بابا کو وینٹی لیٹر پر ڈال دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے ـــــ علاج ہی تو ہے۔ آخر کب تک امّاں ـــــ! سنبھالو خود کو ـــــ لو کچھ کھالو، مجھے آفس جانا ہے۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو، آپ دواخانے میں نہیں گھر پر ہی ہیں۔''

یہ اس کی بڑی بیٹی تھی۔ بچیوں نے باری باری اپنی ڈیوٹی لگالی تھی۔ وہ جی جان سے اس کی تیمارداری میں لگی تھیں۔ مگر بیماری کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتی جارہی تھی۔ غذاء گھٹ کر چار لقموں میں محدود ہوگئی تھی۔ اس کا وزن تیزی سے گر رہا تھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ خود کو سنبھال نہیں رہی تھی۔

مگر زخم شاید اتنے گہرے تھے کہ بھرنے کا نام ہی نہ لیتے۔

''امّاں ـــــ! آپ بیمار نہیں ہیں۔'' یہ اس کی منجھلی بیٹی تھی۔ زندگی کی واجبات کو ان کے حقیقی روپ میں دیکھنے کی عادی، ایک Realistic لڑکی۔

''آپ پہلے یہ قبول کرلیں امّاں کہ آپ بیمار نہیں ہیں۔''

''ہاں بیٹا ـــــ! ڈاکٹر بھی یہی کہتا ہے۔''

''ہاں! کیوں کہ درد کا درماں کوئی اور نہیں، امّاں خود آپ ہیں۔ آپ ہی کو اس مشکل سے نجات کی راہ ڈھونڈنی ہوگی۔ اپنے لئے نہ سہی امّاں! ہمارے لئے۔ ہم سب کے لئے۔'' یہ اس کی چھوٹی بیٹی تھی جو زار و قطار رو رہی تھی۔

''میں جانتی ہوں۔ میرے وجہ سے تم سب پریشان ہو۔ بیٹا! یوں کرو۔ مجھے تنہاء چھوڑ دو۔ ڈرو نہیں۔ کیونکہ زندگی کی ڈور جب ٹوٹنے کو ہوتی ہے تو انسان اُسے پوری قوت سے تھام لیتا ہے اور جب موت آنکھیں دکھاتی ہے، زندگی اس سے زیادہ طاقتور ہوجاتی ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ میری لڑائی ہے۔ مجھے لڑنے دو۔ میں تم سے شرمندہ ہوں ـــــ اور خود سے شرمسار بھی۔''

''لو۔ دوائی کھالو۔'' اس نے دوائی لے لی۔ کیونکہ وہ خود نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنی بچیوں کی تکلیف کا سبب بنے۔

شام کے سایے تیزی سے پوری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔ وہ بڑی دیر سے آرام کرسی میں دھنسی اپنی بیٹی کو گھریلو کام کاج میں منہمک دیکھ رہی تھی۔ وہ خود کسی فرم میں اچھے عہدے پر فائز تھی۔ مگر ثمر کی تربیت کہ اس کی بچیاں زندگی کی ہر ذمہ داری خندہ پیشانی سے اٹھانے کی اہل تھیں۔ وہ اس معاملے میں دنیا کی خوش نصیب ترین ماؤں میں شمار ہوتی تھی۔

''یا اللہ ـــــ! میں تجھ سے شاکی نہیں ہوں اور نہ ہی تجھ سے کوئی شکایت ہے۔ میرا ایمان متزلزل بھی نہیں ہے۔ میں ایک سچی مسلمان ہوں۔''

گھڑی بھر کو وہ چپ ہوگئی اور آنکھیں موندلیں۔

''یا حیّ یا قیّوم! موت ایک حقیقت ہے اور ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہی ہے۔ مجھے معاف کردے۔ میں تجھ سے ناراض نہیں ہوں۔ بس ـــــ ایک پچھتاوا رہ گیا ہے کہ ـــــ جس شخص نے ہمیں زندگی دینے کے لئے اپنی زندگی کی تھرتھراتی لو پر توجہ نہ دی۔ اس دیئے کو ہم نے ہواؤں کی زد پر چھوڑ دیا ـــــ''

کاش ـــــ! ہم انہیں آئی. سی. یو سے نکال لاتے!
کاش ـــ ! وہ دنیا چھوڑنے سے قبل اپنوں کے درمیان ہوتے ـــــ!
کاش ـــــ! وہ بول سکتے اور اپنی تنہائی پر احتجاج کر سکتے ـــــ!
کاش آخری وقت میں ان کے پہلو میں کھڑی ہوتی ـــــ!
کاش وہ ـــــ ! کاش میں ـــــ ! کاش ـــــ کاش ـــــ کاش ـــــ!''

اس کا سر درد سے چیخ کر پھٹ گیا اور کہیں پاس میں بجلی ٹوٹ کر گری اور گھڑی بھر کو سارا ماحول منور ہو گیا۔ اس نے دیکھا ـــــ سامنے جنازہ رکھا تھا۔ لوگ اسے سہارا دے کر میّت کے قریب لے جا رہے تھے کہ مہر بخشوا سکے۔ وہ کیا جانتے کہ اس شخص نے مقررہ حد سے سوا ادا کر دیا تھا۔

''بی بی! عفو و درگذر سے کام لو۔ آگے پیچھے کہا سنا معاف کر دو تا کہ سفر آسان ہو۔''

اس نے دیکھا نہیں۔ یہ کون کہہ رہا تھا۔ اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ آنسوؤں کی باڑھ اس کی بینائی پر حاوی ہو گئی تھی۔ ورنہ اس مرد کا گریبان پکڑ لیتی کہ کس کو معاف کرنے کو کہتے ہو ـــــ! جس نے کچھ کیا ہی نہ ہو اس کی معافی کیسی ـــــ! فی الحال وہ کسی کی بات پر توجہ نہیں دے رہی تھی۔ وہ تو بس اپنے شوہر کو آخری وقت نظر بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی بینائی اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''چلو چلو ـــــ! اٹھاؤ جنازہ ـــــ دیر ہو رہی ہے ـــــ'' مجمع میں ایک ہلچل ہوئی۔

''نہیں ـــــ ٹھہرو ـــــ ایسا نہ کرو۔ مجھے دیکھنے دو۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ سنو ـــــ خدا کے لئے۔ انہیں ابھی نہ لے جاؤ۔ سنو! ذرا ٹھہرو۔ میرا بھی دم نکلنے کو ہے ـــــ مجھے بھی..... مجھے بھی ان ہی کے ساتھ ـــــ مجھے بھی ـــــ'' اس کی آواز آہستہ آہستہ ڈوبتی گئی۔ اندھیرے کا وہ پہاڑ جس سے وہ ہمیشہ لڑتی آ رہی تھی اس زور سے اس پر ٹوٹا کہ وہ چکنا چور ہو گئی۔

بہت دیر بعد ـــــ کسی نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بیٹیاں اس پر جھکی ہوئی تھیں۔

''بیٹا ـــــ سنو۔ انہیں روکو۔ تمہارے بابا ـــــ تمہارے بابا۔ انہیں روکو۔

روکو انہیں ـــــ روکو۔ نہیں تو مجھے بھی ـــــ''

کسے روکیں امّاں ـــــ کہاں کے بابا ـــــ! سنبھالو خود کو امّاں ـــــ بابا کو گذرے تو ایک سال بیت گیا۔

☆

- بقیہ -

عیدِ قرباں سے پہلے۔۔۔

اس کی بیمار بیٹی کے بارے میں سن کر خاصی رنجیدہ ہو گئی تھی ''اُسے بچانے کے لیے فوراً پیسے کہاں سے لاؤ گی؟''

زینت نے پیار سے اس کے گال سہلائے پھر اس کے دونوں کاندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی ''تم پریشان مت ہو۔۔ میں کچھ کرتی ہوں''

''تم میری پریشانی چھوڑو ماسی۔۔ بلکہ میری زندگی کی فکر بھی چھوڑو'' اس نے روہانسی ہو کر کہا ''اور انہیں بلا لو۔۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔۔ اس طرح تمہاری بیٹی کا علاج بھی ہو جائے گا اور جان بھی بچ جائے گی''

اس کی ہمدردی کے اظہار پر زینت کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں اور وہ اسے لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی ''مجھے تمہاری زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے اصول بھی پیارے ہیں۔۔ مجھے اب زیادہ فکر اپنی بیٹی کی ہے۔۔ کہیں وہ اس کو نقصان نہ پہنچا دیں'' پھر وہ کچھ سوچ کر بیڈ سے اٹھی ''تم ایسا کرو اپنا میک اپ صاف کر کے، اپنے پرانے کپڑے بدلو اور اسی کمرے میں بیٹھی رہو۔۔ میں ہسپتال سے تھوڑی دیر میں بیٹی کو لے کر آتی ہوں۔۔ اسی دوران کوشش کروں گی کہیں سے روپوں کا بندوبست بھی ہو جائے۔۔ لیکن عید کی وجہ سے تھوڑا مشکل ہے۔۔ خیر میں دیکھتی ہوں'' یہ کہہ کر اس نے پرس اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی مگر پھر لوٹی اور اس کے قریب آ کر بولی ''اس دوران اگر کوئی مین گیٹ پر آئے تو فوراً خدا بخش سے کہنا، وہ مجھے فون کر لے گا۔۔ ویسے میں اسے بھی سمجھا کر جاؤں گی۔۔ اپنا خیال رکھنا'' اس نے مسکراتے ہوئے اس کے گال پر پیار کی ہلکی سی چپت لگائی اور کمرے سے نکل گئی، زینت کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر یوں ہی سوچوں میں گم رہی، پھر وہ ایک فیصلہ کر کے اپنی جگہ سے اٹھی اور اُسی لباس اور میک اپ کے ساتھ خدا بخش کے کمرے کی جانب چل دی۔

عید کے دن ٹی وی پر جانوروں کی قربانی اور پکوانوں کی خبروں کے ساتھ یہ بریکنگ نیوز بھی گردش کر رہی تھی ''پولیس کو سی ویو کے ساحل پر ایک کم سن لڑکی کی لاش ملی ہے۔۔ ابتدائی تفتیش کے مطابق اُسے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا تھا''۔

" خاک کے ذرّے "

پنڈت ہری چند اختر

(۱۵۔اپریل ۱۹۰۱ء.....یکم جنوری ۱۹۵۸ء)

کلیوں کا تبسّم ہو، کہ تم ہو، کہ صَبا ہو
اِس رات کے سناٹے میں، کوئی تو صدا ہو

یوں جسم مہکتا ہے، ہوائے گلِ تر سے
جیسے کوئی پہلو سے، ابھی اُٹھ کے گیا ہو

دنیا ہمہ تن گوش ہے، آہستہ سے بولو
کچھ اور قریب آؤ، کوئی سن نہ رہا ہو

یہ رنگ، یہ انداز نوازش تو وہی ہے
شاید کہ کہیں پہلے بھی، تُو مجھ سے مِلا ہو

یوں رات کو ہوتا ہے گماں، دِل کی صدا پر
جیسے کوئی دیوار سے، سر پھوڑ رہا ہو

دنیا کو خبر کیا ہے، میرے ذوقِ نظر کی
تم میرے لیے رنگ ہو، خوشبو ہو، ضیا ہو

یوں تیری نگاہوں میں، اثر ڈھونڈ رہا ہوں
جیسے کہ تجھے، دِل کے دھڑکنے کا پتہ ہو

اِس درجہ محبت میں، تغافل نہیں اچھا
ہم جو کبھی تم سے، گریزاں ہوں تو کیا ہو؟

ہم خاک کے ذروں میں ہیں اخترؔ گہر بھی
تم بامِ فلک سے، کبھی اُترو تو پتہ ہو

○

اعتبار ساجد

(لاہور)

مال و زر کے کسی انبار سے کیا لینا ہے
عشق کو گرمیٔ بازار سے کیا لینا ہے

تیرے کنبے کی وراثت سے ہمیں کیا مطلب؟
تجھ سے مطلب ہے پریوار سے کیا لینا ہے

عمر بھر ساتھ نبھانا ہے تو پھر بات کرو
ہم کو مہمان اداکار سے کیا لینا ہے

کونسے ہم بھی فرشتے ہیں کہ تجھ کو جانچیں
تیری سیرت، تیرے کردار سے کیا لینا ہے

جھونپڑی اپنی بنا لیں گے کسی کونے میں
قصرِ شاہی! تیرے معمار سے کیا لینا ہے

اپنے اشکوں کے لیے جیب میں رومال رکھو
کام اپنا کسی غمخوار سے کیا لینا ہے

برف باری کا وہ شیدائی ہے ساجد اس کو
تیرے جلتے ہوئے اشعار سے کیا لینا ہے

○

ولی عالم شاہین
(کینیڈا)

گھر ہے مخدوش شہر سارا بند
اور رستہ سوئے خرابہ بند

در ہوا سے کھلا رہے یا بند
شعر کچھ شرط کا نہیں پابند

ایک ہی موج آتی جاتی ہے
ایک ہی موج میں ہے دریا بند

کوئی اندر کہیں نہ تھا موجود
اور بابِ فصیل بھی تھا بند

کون تھا اُس کا دیکھنے والا
اک نظر میں رہا نظارہ بند

اب بھی بے دست و پا ہے کالا باغ
ہے خجل آج بھی فرخا بند

○

جاوید زیدی
(امریکہ)
(ساغر صدیقی کی زمین میں)

کاروبارِ جہاں ہے کذب و ریا
سچ جو بولیں تو کیا تماشہ ہو

تری روح و بدن کے سب رسیا
تجھ کو چھو لیں تو کیا تماشہ ہو

یہ جو دیر و حرم کے فیصلے ہیں
راز کھولیں تو کیا تماشہ ہو

اس زمینِ خدا پر قبضہ ہے
چھوڑ بیٹھیں تو کیا تماشہ ہو

گر بھلا پھر تیرا بھلا ہو گا
ایسا سوچیں تو کیا تماشہ ہو

سرِ ساحل پہ بیٹھنے والے
ڈوب جائیں تو کیا تماشہ ہو

نیند سو گند ہو گئی جن کو
وہ جو سَو لیں تو کیا تماشہ ہو

شاعری بن گئی نصیب آخر
لکھ نہ پائیں تو کیا تماشہ ہو!!

یاد کچھ بھی رہے نہ اب زیدؔی
بھول جائیں تو کیا تماشہ ہو

○

نسیم سحر
(راولپنڈی)

یہ مختلف مزاج کی رعنائی دیکھنا !
پانی پہ مدّتوں سے جمی کائی دیکھنا

جب بھی کسی پہاڑ کی اونچائی دیکھنا
آگے جو آنے والی ہے وہ کھائی دیکھنا

ہر شاخِ گل کو کانٹوں سے زخمائی دیکھنا
کب چاہتی تھی یہ مری بینائی دیکھنا؟

شہرِ خرد میں میری طرف دیکھتا تھا کون؟
دشتِ جنوں میں میری پذیرائی دیکھنا

افسوس، مَیں دِکھا نہ سکوں گا وہ معجزہ!
جو چاہتی ہے چشمِ تماشائی دیکھنا

یکجا ہیں، اور پھر بھی ہیں گُم اپنے آپ میں
ہر فردِ خاندان کی تنہائی دیکھنا

رکھ کر زوالِ عُمر کے منظر میں آئنہ
سورج کی ختم ہوتی توانائی دیکھنا

پھر سے شکستِ شیشۂ دِل کا ہے اہتمام
خود کو دوبارہ اُس کا تمنّائی دیکھنا

گلشن پہ آنے والا ہے وہ وقت عنقریب
کِھلتی ہوئی کلی کو بھی مُرجھائی دیکھنا

اب زہر ہی پلاتے ہیں تریاق کی جگہ
رائج ہے اب جوطرزِ مسیحائی، دیکھنا

لشکر کے سب سپاہی مرے دوست تھے نسیم
میدانِ جنگ میں مری پسپائی دیکھنا !

○

آفتاب مضطر
(کراچی)

حادثہ کیا یہ نیا سا نہیں ہے
مجھے اب اپنی تمنّا نہیں ہے

حجرۂ جان میں یوں آ بسا کوئی
مجھ میں اب اپنا ہی ڈیرا نہیں ہے

آشنا ہو ہی چلا ہے وہ جو ہے
اجنبی کہہ لو، پرایا نہیں ہے

جان اپنا لُوں تمہیں، اس کے بعد
جان کی خیر ہے، پروا نہیں ہے

داغِ سینہ جیسے تم کہہ اُٹھے ہو
یہ اُجالا ہے، اندھیرا نہیں ہے

یہ کسی عشقیہ دل سے پوچھو
عاشقی کھیل تماشا نہیں ہے

آیتی ماں کو نہ سمجھو کم زور!
تمہیں لگتی ہے، یہ چڑیا نہیں ہے

یہ کُھلا راز ہے رازِ غم دہر
راز یہ کس پہ ہویدا نہیں ہے

تم ہی سمجھاؤ ذرا بابت عشق
عشق گر عین مسیحا نہیں ہے!؟

ناز جس دل پہ تھا کل تک مجھے بھی
مضطر اب وہ بھی تو میرا نہیں ہے

○

انور زاہدی

(اسلام آباد)

مہکی ہوائیں یاد کی گزری کہانیاں
باتیں تمہاری شامیں وہ اجڑی کہانیاں

وہ قہقہے ہنسنا وہ کسی بات پہ تکرار
منانا پھر مسکرا کے وہ بکھری کہانیاں

خود قصہ سنانا خود ہی حیران بھی ہونا
جلنا وہ چراغوں کا ادھوری کہانیاں

شہروں میں اداسی کے سوا کچھ نہیں باقی
قصبوں میں سنی ان سے کچھ اپنی کہانیاں

انور وہ سرِ شام پرندوں کی طرح سے
دیواروں پہ سجتی وہ سنورتی کہانیاں

○

اشرف جاوید

(لاہور)

امیرِ شہر منادی کراتا پھرتا ہے
غنیمِ خلقِ خدا کو ڈراتا پھرتا ہے

کسی کے دستِ ہُنر کی کمائی چاہتا ہے
کسی کے مُنہ کا نوالہ چراتا پھرتا ہے

خراج مانگتا ہے سانس سانس کے بدلے
حیات پر بھی اجارہ جتاتا پھرتا ہے

سمجھ رہا ہے کہ بستی میں سارے اندھے ہیں
ہر ایک شخص کو آنکھیں دکھاتا پھرتا ہے

سوانگ بھرنے سے عادت کہاں بدلتی ہے!
وہ تاجِ شاہی کو کاسہ بناتا پھرتا ہے

رکھے ہیں گروی دل و جاں خوشی خوشی پہلے!
اب اِس خیال سے دامن چھڑاتا پھرتا ہے

ہَوا کے ساتھ بنا لی ہے ان دنوں اُس نے
چراغ آج کل اپنا جلاتا پھرتا ہے

وہ چھوڑ جاتا ہے چوپال'' پھر سہی ،، کہہ کر
کہانیاں بھی ادھوری سناتا پھرتا ہے

نہ دل میں خواہشِ سادہ، نہ آنکھ میں تصویر
مگر وہ خواب کی تعبیر لاتا پھرتا ہے

○

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

ختم ہوئیں وہ رفاقتیں، صنم کیسے کہوں
دل پہ اک چوٹ پڑی میرے، صنم کیسے کہوں

یوں لگا بیتے مہ و سال ، چند گھڑیوں میں
من میں آباد ہے اک دنیا، صنم کیسے کہوں

ایک ہی پل میں جو ٹوٹیں رفاقتیں اُن سے
بجھ گئے دیپ امیدوں کے، صنم کیسے کہوں

وہ میری بزم سے نکلے، بتاتے تو سہی
کیوں نہ اک بار پلٹ آئے، صنم کیسے کہوں

ان کے وعدے فریب دیتے رہے
ہم لٹ گئے انجانے میں، صنم کیسے کہوں

زندگی یوں بھی گزر جاتی جو نہ ملتے ان سے
کیسے اب گزرے ہے زیست، صنم کیسے کہوں

کیسے ہوتے ہیں کچھ لوگ وفا کے پیکر
جان الفت میں لٹاتے ہیں، صنم کیسے کہوں

ہم نے اس دورِ ستمگر میں جو دیکھا ہے ریاض
گر بتا دوں تو قیامت ہے، صنم کیسے کہوں

○

ڈاکٹر نبیل احمد

(لاہور)

محبتوں کا کوئی سلسلہ تو ہو گا ہی
کہ اُس کے سامنے اِک آئنہ تو ہو گا ہی

گزر رہا ہوں میں لمحہ بہ لمحہ شب کی طرح
جو ہے یہ درد کا موسم، کڑا تو ہو گا ہی

اب اِس پہ گریہ گزاری کا فایدہ کیا ہے؟
بُرائی کرتے رہے ہو، بُرا تو ہو گا ہی

تمام رات سُلگتی رہی مرے غم سے
کوئی ستارہ کہیں سے بجھا تو ہو گا ہی

شجر ہی کاٹ دیا شام سے ذرا پہلے
یہ پنچھیوں کے لیے سانحہ تو ہو گا ہی

یہ حبس ٹوٹ گیا تو ہَوا سے پُوچھوں گا
کبھی ہَوا سے مرا سامنا تو ہو گا ہی

سیاہ رات سے نکلے تو پھر بتانا مجھے
نگارِ صبح! ترا سامنا تو ہو گا ہی

ترے لبوں کی خموشی بتا رہی ہے مجھے
جو میرے دل میں ہے تُو نے سُنا تو ہو گا ہی

کبھی تو ہجر کے لمحے بھی ختم ہوں گے نبیل
کوئی تو وصل کا لمحہ بنا تو ہو گا ہی

○

ماسک

فرخندہ شمیم (راولپنڈی)

سڑک پر چلتے چلتے میری نظر ایک بار پھر آسمان کی طرف اٹھ گئی۔۔۔میں آج تک اپنی اس عادت پر قابو نہیں پا سکی ہوں کہ میں جس زمین پر چل رہی ہوں، اس کے آسمان کو ضرور دیکھتی ہوں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ دنیا کا ہر آسمان ایک جیسا ہوتا ہے، پوری طرح طاقتور، جسے کسی ستون کی ضرورت نہیں۔۔۔خوش ہو تو بارش اور جلال میں آئے تو ظالم زمین پر سنگ باری بھی کرتا ہے۔۔۔مخلوق کو گمان ہے کہ آسمان والے نے اپنے تعلقات صرف اسی کے ساتھ رکھے ہوئے ہیں لیکن اسے وہ خچر یاد نہیں ہے جس کی بے زبان فریاد پر آسمان نے زبان دراز بستی کو آناً فاناً تہس نہس کر ڈالا تھا۔۔۔ویسے میں موسم ڈھونڈنے کیلیے آسمان کو نہیں کھوجتی، مجھے اس کے پھیلاؤ میں غیب نظر آتا ہے۔۔۔غیب میں اسرار کہانیاں ہوتی ہیں اور مجھے پراسراریت سے عشق ہے۔۔۔میں اسی لیے وباؤں پر بھی غور کرتی رہتی ہوں۔میرا کشف کہتا ہے کہ یہ آسمانی پراڈکٹ ہیں، جو زمین والوں کے لیے جھٹکا ہوتی ہیں لیکن زمین والے اسے کیمیاوی آمیزش سے موت بنا دیتے ہیں۔

میں ان دنوں جس زمین پر چل رہی تھی، وہ اس زمینی وباء کی جنم بھوم تھی۔۔۔میں اپنی بہن اور نوعمر بھانجی سے ملنے اس کے دیس گئی تھی، جب اس کارستانی کی زد میں آ گئی تھی۔۔۔اس زمین کے لوگوں نے پہلے تو مجھے پکڑا اور پھر قرنطینہ کر دیا۔۔۔ایک روز کے بعد جب میں کلیئر ہوئی تو اکیلی نہیں تھی، ماسک اور دستانوں کے ساتھ نمودار ہوئی تھی۔۔۔مگر میں نے آسمان کو دیکھنا نہیں چھوڑا تھا۔

اس دوران میری بوریت اور وطن سے محرومی دور کرنے کی غرض سے میری جینئس بھانجی میرے ساتھ جوڑ دی گئی تھی۔۔۔میں تو اسے ایک عام بچی سمجھنا چاہتی تھی لیکن وہ بلا کی خاص تھی۔۔۔کمرے میں گلوب کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے کہا:

خالہ۔۔۔یہ وائرس انسان کی مرضی سے اوپر والے نے بھیجا ہے۔۔۔زمین پر رہنے والے ایک دوسرے سے دور ہونا چاہتے تھے، اپنے اپنے ماسک اور اپنے اپنے دستانوں میں۔خفیہ رہنا چاہتے تھے۔۔۔انہیں دوسروں سے بدبو آتی تھی۔۔۔جان بوجھ کر دوسروں سے فاصلے پر رہتے تھے۔۔۔"اس نے طنزاً کہا لیکن۔۔۔قریب بھی تو آتے تھے۔۔۔کسی کام کسی اپنایت کیلئے۔"

میں نے چھوٹی عمر کی بچی کا ذہن بٹانا چاہا۔

"آتے تھے مگر۔صرف عارضی مزے کے لیے میں پسینے پسینے ہو گئی۔

بھانجی نے بے نیازی سے گلوب کا جسم گھما دیا، اس کے دونوں ہاتھوں میں سفید دستانے تھے۔

دیکھیں خالہ۔۔۔میں اس گلوب پر آپ کو وہ ملک دکھاتی ہوں جن میں وباء نہیں ہے۔۔۔۔

اس نے ایک براعظم پر انگلی رکھی۔۔۔

یہاں کئی ملکوں میں وائرس نہیں ہے، اب بھی! کیا احتیاط اس کی وجہ ہے؟

"جی ہاں۔۔۔لیکن۔۔۔تاریک براعظم کے ان لوگوں نے وحشت کی بُو وقت پر سونگھ لی تھی۔زمینی حقائق کو سمجھ گئے تھے۔بنی اسرائیل کی طرح نو معجزوں کے منتظر نہیں تھے"

میں نے پہلی بار بڑے تعجب سے بھانجی کو دیکھا اور پھر اپنی بہن کو سراہا جس نے تاریخ کا اس قدر شعور اپنی بیٹی کو دیا تھا۔لیکن بھانجی، ایک نظریہ اور بھی ہے، "وباء کی وجوہات کا"

میری بھانجی اب گلوب کے اوپر کی مٹی جھاڑ رہی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ مذہب سے دوری اس کی وجہ ہے؟

مذہب نہیں دین سے دوری کہیے۔۔۔کیونکہ دین ڈسپلن اور مذہب نظریئے کا نام ہے۔۔۔ڈسپلن سکھاتا ہے کہ چمگادڑ سانپ اور چھپکلی کھانے کے لیے نہیں ہوتے ہیں۔۔۔تو پھر یہ وباء۔۔۔ان خطوں میں کیوں اور کیسے پہنچی۔؟

یہاں تو ایسا کچھ نہیں کھایا جاتا۔۔۔میں نے گلوب کے ایک حصے پر اشارہ کیا

خالہ۔۔۔یہاں عیاشی کھائی جاتی ہے۔۔۔سر سے پاؤں تک چادر میں لپیٹ کر۔۔۔بھوکوں کے سامنے رکھی جاتی ہے۔۔۔مقدس کتاب کو الماری کے سب سے بلند خانے میں تہہ۔کر دیا گیا ہے۔۔جرنیل اعظم سے چھپا کر لیکن۔۔۔کیا سپہ سالار اپنی فوج کے سپاہیوں کی نقل و حرکت کو نہیں جانتا ہے؟

میری بھانجی پر تبلیغ سوار تھی۔میرا دل گھبرانے لگا میں نے بھانجی سے کہا" کھڑکی کھول دو۔۔۔مجھے وحشت ہو رہی ہے مجھے آسمان کو دیکھنا ہے۔

آسمان مصروف ہے خالہ۔۔۔زمین کیلئے ماسک ڈھونڈ رہا ہے۔

کیوں؟ ماسک پہن تو رکھے ہیں۔میں نے جھنجھلاہٹ سے کہا۔

یہ ماسک کافی نہیں ہے اس ماسک سے صرف وائرس بچ سکتا ہے وباء نہیں۔وباء تو بدن کے اندر ہے نا۔۔۔آسمان نے ابھی بہت جرثومے دھونے ہیں۔خالہ اور اس دھلائی میں اسے کسی ماسک کی ضرورت نہیں، وہ بے محتاج ہے۔۔۔ماسک کی ضرورت صرف دنیا کو ہے۔۔۔

یہ کہتے ہوئے میری بھانجی نے ایک بڑا سا کپڑا گلوب کے اوپر ڈال کے اسے اندھا کر دیا تھا۔"

موت کے سائے

کاروبارِ زندگی ایسے ہی گر چلتا رہے
موت کے سائے سروں پر یونہی منڈلاتے رہے
ایسا جینا، کیا ہے جینا، قہر ہے یہ زندگی
حیف! اب ملنے ملانے سے بھی ہم جاتے رہے

حافظ محمد احمد (راولپنڈی)

ہائے رے یہ مجبوریاں!

معین الدین عثمانی
(مہاراشٹر)

روزانہ کی طرح آج بھی میں اس گلی کے نکڑ سے گزر رہا تھا تو اچانک ایک آواز کانوں سے ٹکرائی۔ مانو کوئی بہت بڑا حادثہ ہو گیا ہو۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

رام پرکاش بابو ہاتھوں میں دا تون لیے مجھے آواز دے رہے تھے۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے اور میں منہ پھیر کر ان کی طرف پلٹ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکا موٹر سائیکل پر سوار میرے قریب سے ایسے گزرا کہ میں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ موٹر سائیکل کے شور اور زناٹے دار آواز سے ہاتھ میں جھول رہا تھیلا دور جا گرا۔

ابھی میں اپنے حواس پوری طرح سے یکجا بھی نہ کر پایا تھا کہ پھر رام پرکاش کی آواز فضا میں گونج اٹھی۔

''ارے منوہر لال جی اتنی صبح صبح کہاں چلے جا رہے ہو؟''۔۔۔ اس کے بے تکے سوال سے میں ہیجان میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے اس قدر بلند آواز میں پکارا تھا کہ گلی میں پاس پڑوس کے لوگ بھی متوجہ ہو گئے تھے۔ میں اس غیر متوقع سوال کے لیے ذہنی طور پر بالکل تیار نہ تھا۔ مگر اخلاقی طور پر جواب دینا بھی ضروری تھا۔ اس لیے تھوڑی سی مصنوعی مسکراہٹ چہرے پر پھیلائے میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''کہیں نہیں بھائی۔ بس تھوڑا بازار تک جا رہا ہوں۔''

''ارے بھائی کہیں بھی جاؤ مگر سنبھل کر جایئے گا۔ دیکھتے نہیں وہ لڑکا موٹر سائیکل لیے کتنے قریب سے گزر گیا۔''

''ارے ہاں بھئی ہاں''۔۔۔ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک خیال ذہن میں آیا۔ کیا واقعی میں لاپرواہی سے جا رہا تھا؟ ایک سوال پنڈولم بن کر میرے سامنے منڈلانے لگا۔

قصور تو اس لڑکے کا تھا جو لاپرواہی اور اتنی تیز رفتار سے گاڑی چلا کر میرے قریب سے گزر گیا۔

رام پرکاش جی اسے کچھ کہنے کے بجائے مجھے ہی سمجھا رہے تھے کہ سنبھل کر جایئے گا۔ میں سوچنے لگا، ملازمت سے ریٹائرڈ ہوئے آج تیسرا ہی دن ہے۔ میں نے تو پورے چالیس برس احتیاط سے گزارے ہیں۔ یہ طویل عرصہ تو آدھی حیات پر مشتمل ہے۔ سوچنے لگا، میں نے تو آدھی زندگی پابندیوں کے درمیان گزاری ہے۔ پھر یہ بداحتیاطی تیسرے ہی دن کیسے ہو گئی۔ یہ سوچ کر سر چکرانے لگا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی میں سامنے والے چائے کے ٹھیلے کے ایک بانکڑے پر بیٹھ گیا۔

چائے کا ٹھیلے والا میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں خاموشی کی زبان میں مجھ سے کئی باتیں کہہ رہی تھیں۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ بابو جی گھر سے ناراض ہو کر چلے ہوں گے۔ تبھی تو وہ آج ٹھیلے پر چائے پینے آ گئے۔ اتنے برسوں میں تو کبھی انھیں باہر کھاتے پیتے نہیں دیکھا۔ پھر آج وہ اس طرف کیسے آ گئے۔

اس کی آنکھوں سے برستے سوالات اور بازار میں آتے جاتے لوگوں کی گہما گہمی عجیب سی بے چینی پیدا کر رہی تھی۔

مجھ سے رہا نہ گیا تو میں خود ہی بغیر سوچے سمجھے بول پڑا:

''لاؤ بھیا! آج تمھارے ہاتھوں کی گرما گرم چائے پلاؤ۔''

''ہاں! کیوں نہیں''۔۔۔ کہہ کر وہ میرے قریب آیا اور پھر بڑے ہی رازدارانہ انداز میں کہنے لگا:

''بابو جی! ہم نے سنا ہے کہ آپ ریٹائرڈ ہو گئے۔ چلو اچھا ہو گیا۔ روز روز کی جھنجھٹ سے چھٹی مل گئی۔ مگر اب ہمارا ایک مشورہ ہے اب آپ گھر پر ہی آرام کیجیے گا۔ بازار آنا اور جانا دوسرے کے لیے چھوڑ دیجیے گا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے، وہ رام ناتھ بابو ہیں نا، کل بھیڑ میں کسی نے ان کا بٹوہ مار دیا۔ بے چارے دو گھنٹے اِدھر سے اُدھر پریشان پھرتے رہے۔ مگر کچھ نہ ہوا۔ آپ بھی ذرا ہوشیار رہیے گا۔''

مجھے اس کی باتیں تیر کی طرح چبھنے لگیں۔ اب تک تو میں لوگوں کو صلاح دیا کرتا تھا مگر اب لوگ مجھے مشورہ دینے لگے ہیں۔ ویسے اتنے طویل عرصے میں میرا نقصان تو ہوا نہیں۔ پھر اب یہ اس طرح کی باتیں کیوں سامنے آنے لگی ہیں۔

میں نے بے زاری سے جواب دیتے ہوئے کہا: ''ہاں بھئی! ذرا سنبھل کر رہنا ہوگا۔'' اتنا کہہ کر دو گھونٹ گرم چائے کے حلق سے اتارے اور آگے بڑھ گیا۔

سورج کی تمازت اب بڑھنے لگی تھی۔ حالاں کہ سردیوں کے دن تھے۔ مگر گرمی بدن کو چبھنے لگی تھی۔ ماتھے پر پسینے کی ہلکی ہلکی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ گھر سے نکلتے ہوئے میں قمیض کے اوپر صدری ڈال لی تھی کہ سردی سے بچاؤ ہوگا۔ مگر کیا پتہ تھا کہ وہ بھی اب بوجھ بن جائے گی۔ طبیعت تو چاہ رہی تھی کہ کسی آڑ میں کھڑے ہو کر اسے اتار دوں۔ مگر رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ پھر اسے ہاتھ میں لٹکائے گھومنا ہوگا۔ ایک ہاتھ میں تو پہلے ہی تھیلا جھول رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ بھی مصروف ہو گیا تو خریداری مشکل ہو جائے گی اور چلنا پھرنا بھی دشوار ہو جائے گا۔

ابھی میں ان ہی خیالات کی اُدھیڑ بُن میں آگے بڑھ رہا تھا کہ سامنے سے گھوش بابو آتے ہوئے نظر آئے۔

مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر پھیکی سے مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر بڑے تپاک سے ہمدردانہ انداز میں کہنے لگے:

''کیسے ہیں منوہر لال جی؟ آپ دوبارہ دفتر نہیں آئے؟!''

میں نے مصروفیات بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہوئے جواب دیا: ''ارے گھوش بابو اب گھر کے کاموں سے کسے فرصت ہے؟''

''ہاں بھئی! آپ تو نصیبوں والے ہیں جو عزت کے ساتھ ریٹائرڈ ہو گئے۔ ہمیں دیکھیے اب بھی کولہو کے بیل کی طرح چکر لگا رہے ہیں۔'' اس نے مایوسی سے کہا اور پھر ذرا نزدیک آ کر کہنے لگے: ''میری مانیے تو اب دفتر نہ آیئے گا۔''

''وہ بھلا کیوں؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے

پوچھا۔

''ارے منوہرلال جی کیا بتائیں۔کل تک جو دفتر میں آپ کے آگے پیچھے گھوما کرتے تھے،باس بنے بیٹھے ہیں۔کہتے ہیں آپ کے آنے سے کام میں خلل پڑتا ہے اور پھر روز روز بُوڑھوں کے لیے چائے پانی کا خرچہ کون برداشت کرے گا۔''

گھوش بابو کی باتیں سن کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور پھر میں کام کا بہانہ بنا کر آگے بڑھ گیا۔کہنے کو تو میں وہاں سے چل پڑا تھا مگر میرا وجود مجھے وہیں دھنسا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

گھوش بابو کا ایک ایک جملہ ہتھوڑا بن کر میرے دل و دماغ پر ضربیں لگا رہا تھا۔

میں سوچنے لگا مجھے ریٹائرڈ ہوئے ابھی ہفتہ بھر بھی نہیں ہوا ہے۔بڑی مشکل سے تھوڑی دیر کے لیے دو مرتبہ دفتر گیا تھا۔پہلی بار تو خود اُن کے بلانے پر گیا تھا۔دوسری بار کچھ ضروری کاغذات اُنھیں دینے تھے۔چائے کے لیے تو میں نے منع کر دیا تھا،مگر ان کا اصرار بڑھا تو میں نہ نہیں کہہ سکا۔میرے جاتے ہی وہ ایسی بے رُخی اختیار کر لیں گے۔ایسی امید تو نہ تھی۔پھر خیال آیا یہ دنیا چڑھتے سورج کی پجاری ہے،ڈوبتے سورج سے اسے کوئی سروکار نہیں۔مگر انھیں معلوم نہیں کہ ڈوبتے خورشید کی زرد کرنیں بھی اپنی اہمیت رکھتی ہیں۔شام کی سیاہی کو پھیلنے سے روکنے کا اس میں بھی دم ہوتا ہے۔وقتی ہی سہی مگر ہوتی تو ہے سونے کی طرح قیمتی وہ بھی۔

خیالات کی ان ہی تگ و دو میں،میں نے آدھا ادھورا سودا خریدا اور گھر کی طرف چلا آیا۔

گھر کے احاطے میں داخل ہوتے ہی کان میں بہو کی آواز گونجی۔وہ شکایت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھیں:''ماں جی!دوپہر ہونے کو ہے،بابو جی صبح سے بازار گئے ہیں،کھانا کب تیار ہوگا؟منّا اب اسکول سے آتا ہی ہوگا۔آتے ہی کھانا مانگے گا۔''

''ارے بہو!اُن کا کیا؟اب تو وہ بے فکر ہو گئے ہیں۔بیٹھے ہوں گے کسی کے ساتھ گپیں ہانکتے ہوئے۔''بیوی نے اس کی حمایت میں بولتے ہوئے کہا۔

ان کی اس طرح کی باتیں سن کر میری رفتار مزید دھیمی ہوگئی۔میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور جھولا ایک طرف رکھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

مجھے نہیں معلوم کیوں اور کیسے بازار تک آنے جانے میں آج میلوں چلنے کا احساس ہونے لگا تھا۔قمیض اتار کر میں نے اسے کھونٹی پر لٹکایا اور مسہری پر نیم دراز ہو کر آہستہ آہستہ گھوم رہے پنکھے کی طرف دیکھنے لگا۔میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔کمرے کی چار دیواری میں عجیب طرح کی گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔حالاں کہ یہی کمرہ تھا جب میں آفس سے تھکا ماندہ لوٹتا تھا تو یہاں یک گونا راحت کا احساس ہوتا تھا۔پچھم کی اَور کھلنے والی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نیند کی دیوی کے حوالے کر دیتے تھے۔یہاں بیٹھ کر آرام کر کے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جایا کرتا تھا۔مگر آج معلوم نہیں کیوں مجھے بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔کھڑکی سے پڑوس کے بچوں کے شور سے تلاطم پیدا ہو رہا تھا۔

پھر یکا یک خیال آیا،پچھلے ہفتے تک تو سب کچھ حسب معمول تھا۔آفس سے آتے ہی بہو ٹیبل پر چائے رکھ جاتی تھی۔بیوی قریب آکر دیکھتی تھی۔مانو وہ اَن کہے مجھ سے پوچھتی تھی کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔مگر آج ماحول میں یکلخت یہ تبدیلی کیسے آگئی۔مجھے بازار سے آنے میں دیر کیا ہوئی،جیسے کوئی پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو اور یہ بدگمانیاں،توبہ!

میں سوچ کے دائروں میں الجھتا چلا گیا اور پھر دُور،بہت دُور کسی اور دنیا میں کھو گیا۔

عدالت کا کمرہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا،اس کے باوجود بھی کمرے میں غیر معمولی خاموشی تھی۔لوگ حیرت و استعجاب کی تصویر بنے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

جج صاحب نے ترحم آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر پوچھا:''تم نے اپنی صفائی کے لیے کوئی وکیل مقرر کیا ہے؟''

مجرم کے کٹہرے میں نظریں جھکائے میں نے جواب دیا:''جناب والا میں خود اپنی صفائی پیش کروں گا''۔۔۔''ٹھیک ہے!'' کہتے ہوئے انھوں نے کارروائی کو آگے بڑھانے کا حکم دیا تھا۔

پیش کار نے جرح کرتے ہوئے کہا:''جناب والا!جب سے یہ ملازمت سے سبک دوش ہوئے ہیں،ان کے رویے میں غیر معمولی تبدیلی آگئی ہے۔''

''وہ کیسے؟ذرا وضاحت سے بیان کیا جائے!''جج نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''جناب والا!اس سلسلے میں آج ہی کی مثال دوں گا۔یہ صاحب جب تک برسرِ ملازمت تھے،ہر چیز میں احتیاط برتتے تھے۔اب دیکھیے نہ صبح جب یہ راستے سے گزر رہے تھے،ایک موٹر سائیکل سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گئے۔وہ تو خیر ہوئی کہ ان کے ایک پڑوسی نے انھیں بروقت چوکنا کر دیا،ورنہ ایکسیڈنٹ ہو جاتا اور یہ زخمی ہو جاتے۔بھلا اس میں اس موٹر سوار لڑکے کا کیا قصور ہے؟

پھر جناب جب یہ چائے کے ٹھیلے پر گئے تو بے چارے ٹھیلے والے نے ازراہ ہمدردی ان سے خیریت دریافت کی تھی۔مگر یہ حیرت سے منہ پھاڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

۔۔۔اور حضور انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا،ان کی آفس کے ایک ملازم نے جب انھیں سچائی سے روشناس کروایا تو انھوں نے اپنے ہی سابق ساتھیوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا تھا۔حد تو یہ ہے کہ اپنے افرادِ خانہ سے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

۔۔۔اب آپ ہی بتلائیے جناب والا ایسی شخصیت کو جس نے لوگوں کے احسانات فراموش کر دیے ہوں،معاف کر دینا چاہیے؟!میرے خیال سے انھیں تو سخت سے سخت سزا دینی چاہیے!''

جج صاحب نے درشت نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور کہا:''کیا تم اپنے جرائم کو قبول کرتے ہو؟!''

میں سوچ کی اندھی کھائی میں چلا گیا اور خود ہی بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا یہ انسان اس قدر مطلبی کیوں ہوتا ہے۔دفتر کے لوگوں کا تو چھوڑیے، وہ چند ہی گھنٹوں کے ساتھی ہوا کرتے تھے۔مگر ان کے لیے بھی میں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔انسان حال کی دنیا میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اسے ماضی کا کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔حالاں کہ ماضی کا ایک ایک واقعہ تازیانۂ عبرت کا کام کرتا ہے۔مگر ہائے رے ابن الوقتی اسے سیدھا رہنے نہیں دیتی اور یہ افراد خانہ، جن کے لیے دن رات ایک کر دیے تھے۔اس کا یہ صلہ؟ اور شریک سفر کا رویہ۔کتنا دردناک ہے۔وہ تو عرصۂ حیات میں مزاج سے واقف ہو جاتی ہے مگر حالات کے بدلتے ہی سب بدل جاتا ہے۔تو کیا یہ بقیہ زندگی یوں ہی بے رُخی کی نذر ہو جائے گی۔

بہت دیر تک میں حیرت و استعجاب کی تصویر بنا کبھی جج صاحب تو کبھی عدالت میں بیٹھے لوگوں کو دیکھتا رہا۔میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دوں۔

پھر آہستہ سے گردن اٹھا کر میں نے کہنا شروع کیا۔

''حضور والا! میں بھی آپ ہی کی طرح ایک انسان ہوں۔آپ لوگ میرے جذبات و احساسات کو کیوں نہیں سمجھتے۔میں نے اب تک کی زندگی کا آدھے سے زیادہ حصہ پابندی میں گزارا ہے۔روزانہ زندگی کے میرے کچھ معمولات تھے۔جنھیں کولہو کے بیل کی طرح آنکھیں بند کیے ادا کرتا آیا ہوں۔یہ ساری چیزیں میری زندگی کا حصہ بن گئی ہیں۔میں کس طرح اچانک ان سے نجات حاصل کر سکتا ہوں۔اب آپ ہی بتلائیے اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

اتنا کہہ کر میں جج کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

جج صاحب نے پہلے تو اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بڑے ہی راز دارانہ انداز میں کہنے لگے: ''دیکھیے، میں آپ کی مجبوری سمجھ سکتا ہوں۔مگر تم کو یاد دلانا چاہوں گا کہ اب تم دفتر میں نہیں، معاشرے میں ہو۔جہاں ہر شخص آزاد ہے۔تم ان پر کسی طرح کی پابندی نہیں لگا سکتے۔تمھیں اپنے رویے، اپنی سوچ کے دھارے تبدیل کرنے ہوں گے۔بصورت دیگر دوسروں کا تو کچھ نہ ہوگا، تمھاری زندگی اجیرن ہو جائے گی۔اور ہاں سنو! چوں کہ یہ تمھاری پہلی غلطی ہے، اس لیے وارننگ دے کر احتیاط کی ہدایت دی جاتی ہے۔''

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔میں بت بنا یہ سب دیکھ رہا تھا کہ اچانک بیوی کے چلّانے سے چونک پڑا اور ادھر سارا عدالتی نظام درہم برہم ہو گیا اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

بیگم بہ آواز بلند بہو سے کہہ رہی تھیں کہ جب سے یہ ریٹائرڈ ہوئے ہیں، دن رات انھیں سونے کے سوا دوسرا کوئی کام نہیں ہے۔میں نے لاکھ سمجھایا کہ پڑوس کے چندولال جی کی طرح ریٹائرمنٹ کے بعد دوسرا کوئی کام کیوں نہیں دیکھ لیتے۔مگر میری سنتا کون ہے۔

بیگم کی آواز مجھے میلوں دور سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔بستر پر نیم دراز کی حالت میں پڑا میں سوچ رہا تھا کہ اگر آخر تک کام ہی کرنا ہے تو لوگ ریٹائرڈ ہی کیوں ہوتے ہیں۔اس سوال کا میرے پاس تو کیا کسی کے پاس بھی کوئی جواب نہ تھا۔

لوگ ہیں نا!

ہیما جین
(امرتسر)

تُو اپنی خوبیاں ڈھونڈ
کمیاں نکالنے کے لیے لوگ ہیں نا

اگر رکھنا ہے قدم تو آگے رکھ
پیچھے کھینچنے کے لیے لوگ ہیں نا

سپنے دیکھنے ہی ہیں تو اونچے دیکھ
نیچا دکھانے کے لیے لوگ ہیں نا

اپنے اندر جنون کی چنگاری بھڑکا
جلنے کے لیے لوگ ہیں نا

اگر بنانی ہیں تو یادیں بنا
باتیں بنانے کے لیے لوگ ہیں نا

پیار کرنا ہے تو خود سے بھی کر
دشمنی کرنے کے لیے لوگ ہیں نا

رہنا ہے تو تھوڑا بچہ بھی بن کر رہ
سمجھدار بنانے کے لیے لوگ ہیں نا

بھروسہ رکھنا ہے تو خود پہ رکھ
شک کرنے کے لیے لوگ ہیں نا

تُو بس سنوار لے خود کو
آئینہ دکھانے کے لیے لوگ ہیں نا

خود کی الگ پہچان بنا
بھیڑ میں چلنے کے لیے لوگ ہیں نا

تُو کچھ کر کے دکھا دنیا کو
تالیاں بجانے کے لیے لوگ ہیں نا

الوداع

ارشد نیم
(مالیرکوٹلہ)

سردی کا موسم اپنی شان وشوکت کچھ زیادہ ہی دکھا رہا تھا۔سرد ہوائیں جسم کو چیرتی ہوئی گزرتی تھیں۔گرم کپڑے پہننے کے باوجود یوں محسوس ہوتا تھا جیسے رگوں میں خون جم گیا ہو۔رات کا کھانا کھانے کے بعد میں انگیٹھی کے پاس بیٹھا اپنے جسم کو گرما رہا تھا۔میری ساس میرے پاس بیٹھی اپنی انگلیوں کے پوروں پر تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ابھی ابھی وہ عشاء کی نماز سے فارغ ہوئیں تھیں۔میری بیوی فاطمہ بیڈ پر بیٹھی ہمارے منّے کو کچھ کھلا رہی تھی۔میرے سسر کام سے لیٹ آئے تھے۔مجھ سے خیروعافیت پوچھنے کے بعد وہ ایک طرف بیٹھے کھانا کھانے میں مصروف تھے۔میں نے باہر کی طرف دیکھا دھند جلوہ افروز ہونا شروع ہوگئی تھی۔میری نظر دیوار پر لٹک رہے کلاک کی طرف گئی آٹھ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے۔تبھی میرے موبائل کی گھنٹی بجنی شروع ہوگئی۔میں نے جیب سے موبائل نکال کر سکرین پر اپنے دوست کا نام پڑھا تو موبائل آن کر کے کان کو لگاتے ہوئے سلام کیا اور ہاں ابھی کچھ دیر میں پہنچ رہا ہوں کہہ کر موبائل بند کر کے فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"فاطمہ چلیں کیا۔۔۔؟"

فاطمہ منّے کے منہ میں چمچہ ڈالتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں چلتے ہیں،بس ذرا منّے کو یہ کھلا دوں۔نہیں تو آپ کو پتا ہے کہ آدھی رات کے وقت یہ نیند سے جاگ کر کتنا پریشان کرتا ہے۔"

میری ساس منہ سے بھاپ چھوڑتے ہوئے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"چلے جانا بیٹے،ابھی تو آٹھ ہی بجے ہیں۔تھوڑی دیر اور رک جاؤ۔"

میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی سکرین پر اُبھرے میسیج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

امی دھند اترنا شروع ہوگئی ہے اور 8:30 بجے مجھے ایک ضروری میٹنگ میں بھی جانا ہے۔اُن کے فون اور میسیج بھی آرہے ہیں۔اِن دونوں کو گھر چھوڑ کر پھر میٹنگ میں جاؤں گا۔

میری ساس محبت بھرے لہجہ میں بولیں۔

"تم تو ہر وقت مصروف رہتے ہو۔کبھی اپنی اس ماں کے لئے بھی وقت نکال لیا کرو۔فاطمہ تو صبح سے ہی آجاتی ہے۔تم رات کے وقت اسے لینے ہی آتے ہو،اور آتے ہی جانے کی جلدی مچا دیتے ہو۔اس زندگی کا اب کیا بھروسہ میں کل رہوں یا نہ رہوں۔بیٹے کبھی میرے پاس بیٹھ کر بھی کچھ باتیں کر لیا کرو۔تم دونوں مجھے بہت پیارے ہو۔"

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"امی آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ کاروبار کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہی ہے۔اس لئے بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے،اور ہاں آپ یہ مرنے کی باتیں نہ کیا کریں۔ابھی تو آپ کو اپنے نواسے کی شادی بھی دیکھنا ہے۔آپ بھی ہمیں بہت پیاری ہیں۔میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کبھی میں پورا دن آپ کے پاس رہوں گا۔پھر آپ دل بھر کر باتیں کر لینا۔"

میری ساس کے منہ سے دعاؤں کی برسات ہونے لگی۔

"جیتے رہو بیٹا،خدا تمھاری عمر دراز کرے۔تم دونوں کی جوڑی سلامت رہے۔پروردگار تمھیں کاروبار میں اور ترقی دے۔"

اتنے میں فاطمہ نے منّے کو کھانا کھلا کر چھوٹے کمبل میں لپیٹ لیا تھا۔بیڈ سے نیچے اتر کر اس نے اپنا پرس اُٹھایا اور منّے کو سنبھالتی ہوئی میرے قریب آکر پیار سے بولی۔

"چلیئے جناب۔۔"

میں نے موبائل جیب میں ڈالا اور کرسی سے اُٹھ کر اپنے سسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا ابو جی اب ہم چلتے ہیں۔۔۔السلام علیکم۔"

وہ اپنے سامنے پڑا پانی کا گلاس اُٹھاتے ہوئے بولے۔

''وعلیکم السلام بیٹا۔۔۔ذرا دھیان سے جانا۔موٹر سائیکل دھیرے چلانا۔دھند بہت ہو رہی ہے۔"

میں نے اُن کی بات سن کر اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے۔

جی ابو۔۔۔"

کہا اور مین گیٹ کی طرف چل دیا۔فاطمہ بھی اُنھیں سلام کرنے کے بعد میرے ساتھ ہولی۔میری ساس بھی کرسی سے اُٹھ کر ہمارے ساتھ باہر کی طرف آگئی۔مین گیٹ پر آکر اُنھوں نے فاطمہ کو پانچ سو روپے کا نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ رکھ لو بیٹی۔"

فاطمہ نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

"امی آپ اسے رہنے دو۔"

میری ساس ممتا بھرے انداز میں ڈانٹتے ہوئے بولیں۔

"تو چپ چاپ اسے رکھ لے۔تم لوگ روز روز تھوڑے ہی آتے ہو۔بڑی مشکل سے پندرہ دنوں کے بعد آتے ہو۔کئی بار تو تمھیں آتے آتے مہینہ ہی گزر جاتا ہے۔زیادہ نخرے مت کرا اور اسے پکڑ لے۔"

فاطمہ میری طرف دیکھنے لگی۔میں نے اسے نوٹ پکڑنے کا اشارہ کر دیا۔کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ہم چاہے جتنا انکار کر لیں اس معاملہ میں میری ساس اپنی بات منوا کر رہتی ہیں۔مجھے جلدی جانا تھا اس لئے ٹائم ویسٹ نہیں کرنا چاہتا تھا۔فاطمہ نے نوٹ پکڑ کر اپنے پرس میں رکھ لیا۔میں نے موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا امی،اب ہم چلتے ہیں۔"

اُنھوں نے میرے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بیٹا، دھیان سے جانا اور گھر پہنچتے ہی مجھے فون کر کے بتا دینا۔"

پھر وہ سنسان گلی کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

"دیکھو لو فاطمہ تمھارا لاڈلا بھائی ماجد ابھی تک نہیں آیا۔ فلم دیکھنے گیا ہے۔ میں تو اسے روک رہی تھی کہ آج تم لوگ آئے ہوئے ہو کل چلے جانا۔ مگر ضد کرنے لگا کہ سبھی دوستوں نے پروگرام بنایا ہے ٹکٹ بھی لے رکھی ہے۔ کھانے کے ٹائم تک وہ آجائے گا۔ لیکن دیکھو لو ابھی تک نہیں آیا۔ آجائے تو وہ بھی کھانا کھا لے۔ نہیں تو مجھے پھر سے کھانا گرم کرنا پڑے گا۔"

میں نے موٹر سائیکل گرم کرنے کے ارادے سے ریس پر تھوڑا زور دیتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں امی، بچہ ہے وہ ابھی، آپ فکر نہ کریں تھوڑی دیر میں آجائے گا۔ ابھی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہی ہوگا۔"

اُنھیں میرے ریس پر زور دینے کی وجہ سمجھ آگئی تھی کہ میں جلدی میں ہوں۔ اس لئے اُنھوں نے فاطمہ کو گلے لگایا اور منّے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

"اب کی بار جلدی آنا، اس بار کی طرح نہیں کہ پورے ایک مہینے کے بعد چکر لگاؤ۔"

"جی امی۔"

کہتے ہوئے فاطمہ موٹر سائیکل پر سوار ہوگئی۔ ہم دونوں نے اُنھیں سلام کیا اور چل دیئے۔ وہ گیٹ پر کھڑیں ہمیں دیکھتے اپنا ہاتھ الوداعی انداز میں ہلانے لگیں۔ فاطمہ بھی بار بار پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلا رہی تھی۔ میں موٹر سائیکل کے سائیڈ دیکھنے والے شیشہ سے اُنھیں دیکھ رہا تھا۔ میری ساس کا یہ معمول تھا کہ جب بھی ہم وہاں سے چلتے وہ اپنے گیٹ پر کھڑیں تب تک ہمیں دیکھتی رہتیں جب تک ہم اُن کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔ فاطمہ بھی اُنھیں پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی رہتی۔ ان دونوں کا یہ پیار بھرا انداز مجھے بہت اچھا لگتا۔

فاطمہ سے میری شادی تین سال پہلے ہوئی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن میری ساس کی ہمارے تئیں محبت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ بہت اچھے سبھاؤ کی تھیں۔ حالانکہ شوگر کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہوگئی تھیں پھر بھی وہ بہت ہمت والی تھیں۔ گھر کے تمام کام وہ خود کرتیں اور ہمیشہ خوش رہتی تھیں۔ فاطمہ سے انہیں بے انتہا لگاؤ تھا۔ فاطمہ بھی اپنی امی سے بہت پیار کرتی تھی۔ ہر روز یہ دونوں آپس میں فون پر ایک یا دو بار بات بھی ضرور کرتی تھیں۔ پھر بھی اگر کبھی کام کی مصروفیات کی وجہ سے ہم مہینہ بھر ان سے ملنے نہیں جا پاتے تھے تو وہ فون پر ہمیں آنے کے لئے بار بار بولتی رہتیں تھیں مجھے ان کی شفقت میں ہر بار اضافہ ہی محسوس ہوتا۔

اس دن صبح کے وقت میرے سسر نے مجھے فون کر کے بتایا کہ تمھاری امی کو شوگر کا اٹیک ہوا ہے۔ ان کی حالت خراب ہے۔ ہم لوگ اسیسر کاری ہسپتال میں لے آئے ہیں۔ تم لوگ بھی آجاؤ۔ یہ سنتے ہی میں فاطمہ کو ساتھ لے کر جلدی سے ہسپتال پہنچ گیا۔ ایمرجنسی روم کے باہر میرے سسر اور ماجد غمگین بیٹھے تھے۔ اُن سے ملنے کے بعد ہم نے میری ساس کو دیکھا وہ ایمرجنسی روم میں بے ہوش پڑی تھیں۔ ڈاکٹر اُنھیں ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ فاطمہ اپنی امی کی حالت دیکھتے ہی رونے لگی اسے دیکھ کر ماجد بھی رونے لگا۔ میں نے فاطمہ کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

"فاطمہ پلیز رو مت، حوصلہ رکھو۔ دیکھو تمھیں روتا ہوا دیکھ کر ماجد بھی رونے لگا ہے۔ اگر تم اس طرح ہمت ہار گئی تو ماجد کا کیا ہوگا۔ اس لئے چپ ہو جاؤ اور ماجد کو سنبھالو۔ میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں۔ تم لوگ فکر نہ کرو اللہ پاک امی پر رحم کریں گے۔"

یہ سنتے ہی فاطمہ کے دل میں پتا نہیں کیا بات آئی اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے اور ماجد کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور اسے دلاسا دے کر سمجھاتے ہوئے بولی۔

"چپ ہو جا میرے بھائی امی کو کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ پاک اُنھیں جلد صحت یاب کریں گے۔ تم رو مت بلکہ اللہ کے حضور امی کے لئے دعا کرو۔"

کافی وقت کے بعد ایک ڈاکٹر باہر نکلا اور ہمارے پاس آ کر نرمی سے بولا۔

"میں نے بہت کوشش کی مگر۔۔۔ سوری۔۔۔ میں اُنھیں بچا نہیں سکا۔"

یہ سنتے ہی ہمارے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہم سبھی دوڑ کر اندر گئے۔ وہاں بیڈ پر میری ساس کی لاش پڑی تھی۔ ہمیں تو جیسے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اب ہم سے ہمیشہ کے لئے دور چلی گئی ہیں۔ ماجد ان کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا۔ میرے سسر کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔ مگر وہ حوصلہ سے کام لیتے ہوئے ماجد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دلاسا دے کر چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جبکہ فاطمہ پتا نہیں کہاں کھوئی اپنی امی کے چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ میں جیسے تیسے ان سبھی کو سنبھالتا ہوا اپنی ساس کی لاش کو گھر لے آیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد میری ساس کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ شام تک رشتہ داروں، دوستوں کا پرسے کے لئے آنا جانا لگا رہا۔ ماجد کا رو رو کر برا حال ہوا جا رہا تھا۔ میرے سسر کی بھی حالت خراب تھی۔ وہ بار بار اپنی بیوی کی باتوں کو یاد کرتے ہوئے رونے لگتے۔ مگر فاطمہ بالکل خاموش بت بنی بیٹھی کبھی اپنے ابو کی طرف کبھی ماجد تو کبھی اپنی امی کی کسی چیز کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ یا پھر وہ گم صم سی بیٹھی چھت کو گھورنے لگتی۔ صبح اپنی امی کے انتقال کے بعد ہی اس کا یہ حال تھا۔ اس کی آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہ نکلا تھا۔ وہ تو جیسے رونا ہی بھول گئی تھی۔ افسوس کے لئے آنے والی عورتیں اسے مل رہی تھیں۔ مگر وہ بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ مجھے اس کی یہ حالت دیکھتے ہوئے کافی فکر ہونے لگی تھی۔ اسی لئے میں نے من بنا لیا تھا کہ رات کو اسے یہاں نہیں رہنے دوں گا بلکہ اسے اپنے گھر لے کر جاؤں گا۔ تا کہ اس کا تھوڑا من بدل جائے۔ یہاں رہی تو کہیں یہ امی کی چیزوں کو دیکھ کر اپنی طبیعت خراب نہ کر لے۔ اس نے منّے کو بھی سنبھالنا تھا۔ صبح سے وہ میری بھابھی کے پاس ہمارے گھر پر ہی تھا۔ دن میں کئی بار میں فون پر اپنی بھابھی سے منّے کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔

رات ہوتے ہی جب میں نے فاطمہ سے چلنے کے لئے کہا تو وہ خاموشی کے ساتھ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ میں نے اپنے سسر سے اجازت لیتے ہوئے کہا۔

باقی صفحہ ۹۰ پر ملاحظہ کیجیے

افسانچے

محمد علیم اسماعیل
(اورنگ آباد)

پھول پودے اور پانی

وہ کاغذ فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ایک روز مالک نے اسے کسی کام کے سلسلے میں اپنے گھر بھیجا۔

مالک کی بیوی نے اسے دیکھا،اور کہنے لگی،''آج سے تم فیکٹری کی بجائے گھر پر کام کرنا۔''

''لیکن ساہیب۔۔۔۔؟''اس نے سوال پوچھنا چاہا۔

''تم اس کی فکر مت کرو،صاحب سے میں بات کرلوں گی۔''مالکن نے اس کا سوال مکمل سنے بغیر ہی جھٹ سے جواب دیا۔

''لیکن مجھے یہاں کیا کام کرنا ہوگا؟''اس نے پھر سوال کیا۔

''یہ گارڈن میں جو پودے نظر آرہے ہیں،انھیں پانی دینا تمھارا کام ہے۔صحیح طریقے سے اور وقت پر پانی نہ ملنے کی وجہ سے دیکھو یہ پودے اور ان کے پھول کتنے مرجھا گئے ہیں۔ان کی اچھے سے دیکھ بھال کرنا اور انھیں خوش رکھنا اب تمھاری ذمہ داری ہے۔''

''اوکے میم ساب''یہ کہتے ہوئے وہ کام سے لگ گیا۔

دوسرے دن مالکن کافی خوش نظر آرہی تھی اور ان کا چہرہ تازہ پھولوں کی مانند کِھل اٹھا تھا۔

حل

اس گاؤں میں پانی کی بڑی قلت تھی۔اور رواج یہ تھا کے عورتیں ہی پانی بھرتی تھیں۔ایک ہنڈا سر پر،ایک ہنڈا کمر پر رکھ کر،تقریباً تین چار کلومیٹر دور سے پانی لاتی تھیں۔بیوی حمل سے تھی۔وہ جب تک پانی لاسکتی تھی،تب تک لاتی رہی،اور جب مشکل بڑی تو اس نے اپنے شوہر سے کہہ دیا کہ اب اُس سے یہ کام نہیں ہوسکتا،وہ جلد بندوبست کرے۔

شوہر نے بیوی کو پورا یقین دلایا کہ دو چار دن میں ہی اس مسئلے کو حل کردے گا۔اور دو دن بعد ہی۔۔۔۔۔۔شوہر گھر میں دوسری بیوی لے آیا۔

شہرِ خموشاں

مظہر اس گاؤں میں سات سال سے میڈیکل اسٹور چلا رہا تھا۔وہ گاؤں اس کے شہر سے اسّی کلومیٹر دور تھا۔مظہر سبھی گاؤں والوں سے کافی گھل مل گیا تھا۔اب سات سال بعد مظہر اپنے ہی گاؤں میں میڈیکل اسٹور کے لیے ایک اچھی جگہ تلاش کررہا تھا۔

جب گاؤں والوں کو معلوم ہوا کہ مظہر ان کا گاؤں چھوڑ کر جانے کی تیاری میں ہے تب سبھی گاؤں والے مظہر کے پاس گئے اور کہا،''ہم چاہتے ہیں کہ تم اسی گاؤں میں ہمیشہ کے لیے بس جاؤ۔''

مظہر نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا:

''میں اسی گاؤں میں بس جاتا ہوں،اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن ڈر مجھے صرف ایک بات کا ہے۔''

گاؤں والوں کے چہروں پر کچھ تاثرات ابھرے پھر سب نے ایک آواز میں کہا،''کس بات کا ڈر ہے تمھیں ہمیں بتاؤ،ہم دور کیے دیتے ہیں۔''

مظہر نے کہا،''اس چھوٹے سے گاؤں میں خان،سید،شیخ اور قریشی فیملی کے لوگ رہتے ہیں۔سبھی کے قبرستان الگ الگ ہیں اور میری ذات فقیر ہے!!!اگر میں مرگیا تو مجھے کس کے قبرستان میں دفن کروگے۔''

مظہر کافی دیر تک سب کے منہ تکتا رہا لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔سبھی خاموش تھے۔خاموشی کا یہ منظر شہرِ خموشاں کی لرزہ خیز خاموشی سے کچھ کم نہ تھا۔

مظہر نے کہا،''بس اسی بات کا ڈر ہے مجھے۔''

باغی اور غلام

''تم پر الزام لگا ہے کہ تم باغی ہو اور تم نے حکومت سے بغاوت کی ہے۔''

''نہیں جج صاحب میں بے قصور ہوں۔''

''کیا تمھارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے؟''

''نہیں جج صاحب میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں نے غلام بننے سے انکار کیا تھا۔''

بہو اور بیٹی

''یہ بھارت ہے۔بھارتیوں کا ملک۔ایک اٹالین عورت۔۔۔سونیا گاندھی اس دیش کی پردھان منتری (وزیراعظم) کیسے بن سکتی ہے؟ کچھ بھی ہو جائے ہم یہ نہیں ہونے دیں گے۔''

اس نے بڑے فخر سے کہا تھا۔

کچھ برسوں بعد۔۔۔۔

''دیکھا تم نے!!! ہمارے ملک بھارت کی بیٹی کملا ہیرس امریکہ کی وائس پریزیڈنٹ بن گئی۔''

یہ کہتے ہوئے اس کا سینہ فخر سے چوڑا ہوگیا۔

قاتل کون؟

اس شخص نے اپنی دکان پر اردو میں لکھا ہوا بورڈ لگایا لیکن اس میں دو الفاظ کا املا غلط تھا۔

ایک اردو داں نے اس بورڈ کا فوٹو لیا اور فیس بک پر یہ لکھتے ہوئے

شیئر کر دیا کہ ''اردو ہم شرمندہ ہیں تیرے قاتل زندہ ہے۔''

پھر اس پوسٹ پر طرح طرح کے کمنٹ آنے لگے، لوگ اس دکاندار کو برا بھلا کہنے لگے۔ فیس بک والا یہ معاملہ اتنا وائرل ہوا کہ دکاندار کو معلوم ہو گیا۔ اب اس دکان پر اردو کی جگہ انگریزی کا بورڈ لٹک رہا تھا۔

بڑے میاں

بڑے میاں بوڑھے ہو چکے تھے لیکن جوان لڑکی بیاہ لائے تھے۔ اور گھر میں جیسے بھونچال سا آ گیا تھا لیکن بڑے میاں نے دوٹوک لفظوں میں کہہ دیا تھا،

''یہ میری دلہن ہے، یہ اسی گھر میں رہے گی، کہیں نہیں جائے گی، میرے ساتھ رہے گی، میرے کمرے میں رہے گی، اگر کسی کو منظور نہ ہو تو وہ یہاں سے چلا جائے۔ یہ گھر میرا ہے، میرے نام پر ہے، میرے روپیوں سے بنایا ہوا ہے۔ اگر مجھے زیادہ پریشان کرنے کی کوشش کی گئی تو میں اسے ساتھ لے کر ممبئی چلا جاؤں گا، اور وہاں ایک فلیٹ خرید لوں گا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ملے ہوئے روپے ابھی میرے اکاونٹ میں محفوظ ہیں۔''

یہ سن کر سبھی خاموش ہو گئے کسی نے کچھ نہ کہا۔ لیکن بڑی بی منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی،

''شرم نہیں آتی، قبر میں پیر لٹک رہے ہیں، اور بیٹی کی عمر کی لڑکی بیاہ لائے ہیں، میرے پاس آتے ہوئے گھٹنے درد کرتے تھے ان کے۔''

خوشی اور غم

دو ادیب آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ پہلا خوش تو دوسرا غمگین تھا۔ پہلے نے کہا،

''یار یہ سینئر ادیب کرونا کی وبا سے دھڑا دھڑ مر رہے ہیں۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہو رہا ہے کہ ہمارے لیے میدان صاف ہو رہا ہے۔ نہیں تو یہ کب ہمیں آگے بڑھنے دیتے!!! لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا ہے کہ تجھے کس بات کا غم کھائے جا رہا ہے۔ یوں تیرا منہ کیوں لٹک گیا ہے۔ لگتا ہے تجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹا ہے۔ آخر تُو اتنا غمگین کیوں ہے۔''

دوسرے دوست نے کہا،

''بھائی تو یہ کیوں نہیں سوچ رہا ہے کہ اب ہم کس کی انگلی پکڑ کر چلیں گے؟''

آنکھیں

وہ مکمل حجاب میں تھی۔ صرف اس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ خوبصورت آنکھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ جب معاذ نے اُن آنکھوں کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بھی معاذ کی جانب دیکھنے لگی تھی۔

اسے دیکھتے ہوئے گویا معاذ کی زبان باہر لٹک گئی تھی، جس سے رال ٹپک رہی تھی اور وہ للچائی ہوئی نظروں سے اُن آنکھوں کو دیکھے جا رہا تھا۔

کافی دیر بعد جب معاذ کی نظر اس کے ساتھ چل رہے بچے پر پڑی تو وہ ٹھٹھک گیا۔ اب اس نے نظریں نیچے جھکا لیں، اور شرافت کی چادر چہرے پر تان لی۔

کیا مرد صرف جان پہچان والی عورتوں کی نظر میں ہی شریف بننے کا ناٹک کرتے ہیں؟

یکساں فلیٹ

بوڑھے باپ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

بڑے پوتے نے دروازہ کھولا۔

گھر میں قدم رکھنے سے پہلے ہی انھیں احساس ہو گیا تھا کہ۔۔۔ تینوں پوتے پوتیاں دادا کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں گھر کے اندر کھینچ لیا۔ وہ ہانپتے کانپتے کرسی پر بیٹھ گئے اور عینک صاف کرنے لگے۔ بیٹا اور بہو کھانا کھا رہے تھے۔ دونوں بچے کھانا ادھورا چھوڑ، دادا کے پاس آ گئے۔

بہو نے پھس پھساتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا،

''شاید بابو جی غلطی سے یہاں آ گئے ہیں۔ آج ان کا کھانا تو دیور جی کے یہاں ہے نا۔''

''ہاں۔۔۔ لیکن انھیں اس بات کا ذرّہ برابر بھی احساس نہیں ہونا چاہیے۔ جس طرح سے یہ سارے فلیٹس باہر سے یکساں دکھائی دیتے ہیں ٹھیک اسی طرح ان کے تمام بیٹے بھی ان کے لیے یکساں ہی ہیں۔''

پھر بہو نے اونچی آواز میں کہا:

''بچوں چلو پہلے کھانا کھا لو، یوں کھانا ادھورا چھوڑ کر اٹھ جانا اچھا نہیں ہے، اور بابو جی آپ کا کھانا بھی لگ چکا ہے چلیے جلدی۔''

بقیہ : الوداع

"ابو اب ہم چلتے ہیں۔ میں فاطمہ کو صبح لے کر آ جاؤں گا۔ ابھی یہ گھر جا کر منّے کو سنبھال لے گی۔"

وہ بجھی آواز میں بولے۔

"ٹھیک ہے بیٹا۔۔۔"

میں نے انھیں سلام کیا۔ ماجد کو پیار دینے کے بعد میں فاطمہ کو ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ میرے موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہی وہ خاموشی سے میرے پیچھے بیٹھ گئی۔ میں دھیمی رفتار سے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔ میرا پورا دھیان فاطمہ کی طرف تھا۔ وہ بار بار اپنے گھر کے گیٹ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ فاطمہ کے آج اس طرح پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے کی وجہ سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اپنے آپ کو روک نہ سکا اور رندھی ہوئی آواز میں، میں نے فاطمہ سے پوچھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو فاطمہ۔۔۔؟! سنسان گیٹ۔۔۔؟!!"

میرے اتنا کہتے ہی اس نے اپنا سر میری پیٹھ کے ساتھ لگایا اور چیخیں مار کر رونے لگی۔

بچُو سیٹھ کی باڑی

گلزار جاوید
(راولپنڈی)

یہ آج کا معمول نہیں، ہم جب بھی بیرونِ ملک سے وطن آتے ہیں تو ہم چاروں دوستوں کا اتوار کے اتوار ملنا، کمپنی باغ کی سیر کو جانا، کریم کے سموسے کھانا اور تاج محل کی چائے پینا تفریح کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد بابو پان والے سے اپنی پسند کے پان کھا کر نئی ریلیز ہونے والی فلم کا پہلا شو دیکھنا بھی لازمی امر ہے۔ ہمیشہ کی مانند آج بھی ہم لوگ نئی ریلیز ہونے والی فلم کے پہلے دن پہلا شو دیکھنے گئے اور اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ کر ہمیشہ کی مانند خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ جونہی فلم کا آغاز ہوا تو ہماری گفتگو دھیمی پڑتے پڑتے ختم ہو گئی اور چاروں کی توجہ فلم کے پردے پر مرکوز ہو گئی۔ یہ ایک فارمولا فلم تھی جس میں ہیرو غریبی کے ہاتھوں تنگ آ کر پہلے جیب کترا اور پھر ڈان بن جاتا ہے۔

بچپن میں جس آدمی نے بچے کا ہاتھ پکڑ کر پہلے جیب کترا اور پھر ڈان بنایا تھا اُسے فلم کا ہیرو باپ کا درجہ دیتا تھا۔ اور اُس کی بیٹی کو بہن بنا لیا تھا۔ آج اُسی لڑکی کی شادی میں جب مجرے کا سین آیا تو ہال کی خاموشی نعروں اور سیٹیوں سے گونجنے لگی۔ آج کل کی فلموں کو چلانے اور کامیاب بنانے کا ایک فارمولا یہ دریافت کیا گیا ہے کہ موقع ہو یا نہ ہو مگر ایک آئٹم سونگ ضرور ہونا چاہیے۔ ہمارے خیال میں لڑکی کی شادی کا سین اور مجرے کے نام پر یہ آئٹم سونگ تھا۔ اور دوسری فلموں کی طرح اس فلم میں بھی آئٹم سونگ کے لیے جو لڑکی چنی گئی تھی وہ بھی دوسری فلموں کی آئٹم گرل کی طرح تیز، طرار اور تیکھے نین نقوش والی تھی۔ چونکہ آئٹم سونگ تیز میوزک اور چھوٹے شارٹس کی وجہ سے دیکھنے والوں کی نظر نہیں ٹھہرنے دیتا اس لیے ہماری نظر بھی کافی دیر بعد آئٹم گرل کے چہرے پر پڑی۔ پہلے تو ہم پر حیرت کا بم گرا اور آہستہ آہستہ اُس بم کی کرچیاں ہمارے جسم میں پیوست ہونے لگیں۔ جُوں جُوں تماش بینوں کے جملے اور سیٹیاں ہمارے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں وُوں وُوں ہمارے خون کی گردش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دل کو بہت سمجھایا، خود پر قابو پانے کی کوشش بھی کی مگر تماش بینوں کے جملے برداشت سے باہر ہو گئے۔ ایک دفعہ تو جی چاہا کہ باپ بن کر اس لڑکی کو کان سے پکڑوں اور پوری قوت سے اس کا منہ طمانچوں سے لال کر دوں کہ شریف لڑکیوں کا یہ وطیرہ نہیں ہوتا کہ چند ٹکوں کی خاطر تماش بینوں کا دل لبھانے کے لیے تہذیب و اخلاق کی سبھی حدیں پار کر جائیں۔ پھر خود ہی احساس ہوا کہ یہ لڑکی نہیں اُس کی تصویر ہے جو فلم کے پردے پر حرکت کر رہی ہے اور اس پر تمہارا کوئی بس نہیں چلتا۔

اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ہم خاموشی سے باہر نکل آئے اور رکشے میں بیٹھ کر گھر بھی پہنچ گئے ہیں مگر دو طرح کی پریشانیوں نے خون کا دباؤ اس قدر تیز کر دیا ہے کہ سر گھومتا محسوس ہو رہا ہے۔ ایک پریشانی تو ڈانسر کی، میرا مطلب لڑکی کی بیباکانہ ادائیں اور تماش بینوں کے فحش جملے اور سیٹیاں جبکہ دوسری پریشانی دوستوں کی واپسی پر چبھتے ہوئے سوالات کے جوابات۔ ذہن ماؤف ہوتا جا رہا ہے، آنکھیں مندنے لگی ہیں، خیالات کا دھارا بہت تیزی سے ماضی کی جانب بہائے لے جا رہا ہے۔

یوں تو ہر روز صبح نہانے کے بعد جب ہم شیشے کے آگے بال سنوارنے کے لیے کھڑے ہوتے تو ہمارے دماغ کا کیڑا تیزی سے کلبلانے لگتا۔ کبھی ہم آڑی مانگ نکال کر کسی معروف ہیرو سے خود کو مماثل گردانتے، کبھی ترچھی مانگ نکال کر کسی چوکلیٹی ہیرو سے اپنی نسبت پیدا کرتے، کبھی سیدھی مانگ نکال کر اپنے دور کے رنجیدہ ہیرو کو چیلنج کرنے کی سوچتے اور کبھی سارے بال پشت کی جانب پھینک کر لڑکھڑاتے قدموں سے شرابی کی اداکاری کا سوانگ رچاتے۔ ان تمام حرکتوں کے درمیان کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ خیالات کا دھارا ہمیں خود سے جدا کر کے ہواؤں کے دوش پر لے جاتا اور ہم کسی شوخ و چنچل ہیروئن کا دوپٹہ تھام کر اُس سے اٹھکیلیاں کرتے نظر آتے۔ جب ہماری والدہ پیٹھ پر دھپ مار کے کہتیں: ''ایکٹنگ کا شوق پورا ہو گیا ہو تو ناشتہ فرما لیجیے'' والدہ کے اس طرح مخل ہونے پر یہ سوچ کر غصہ آتا کہ اگر امّی اس طرح دخل نہ دیتیں تو نجانے یہ سلسلہ کہاں تک چلتا۔

اُس روز موسم کی تبدیلی کے باعث ہماری طبیعت قدرے سست تھی اور کام میں جی بھی نہیں لگ رہا تھا لہٰذا ہم چھٹی لے کر آرام کی غرض سے گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ بھینسالی گراؤنڈ کے قریب پہنچے تو وہاں ایک مجمعہ لگا ہوا تھا۔ ایک آدمی سفید چادر اوڑھے لیٹا تھا اور سامری جادوگر دائیں ہاتھ میں تھامی ہوئی چھڑی سے لوگوں کے پاؤں کے گرد بڑی تیزی سے گول لکیر کھینچتے ہوئے دعویٰ کر رہا تھا:

''مہربان قدردان آپ کے دل میں جو بھی چھپی خواہش یا سوال ہے وہ پوچھ ڈالیے۔ آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے بچہ جمورا اُس کا صحیح جواب نہ دے تو میں اپنا سر کاٹ کے آپ کے قدموں میں رکھ دوں گا۔''

مجمعے میں سراسیمگی پھیل گئی اور ایک ساتھ کئی لوگوں نے پہلے میں پہلے میں کہتے ہوئے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ ایک بزرگ کی جانب چھڑی کا اشارہ کرتے ہوئے جادوگر نے کہا:

''عامل'' لڑکے نے چادر کے اندر سے ''معمول'' جادوگر ''جو پوچھوں گا بتلائے گا'' ایک پھر چادر کے اندر سے لڑکے کی آواز ''بتلائے گا''

''میری بیوی گھر سے چلی گئی ہے وہ کب تک آ جائے گی'' ابھی بزرگ کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ زمین پر لیٹے لڑکے نے جواب دیا ''تمہاری بیوی پڑوسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے جب وہ اُس کے ساتھ دھوکا کرے گا تو وہ لوٹ آئے گی'' لڑکے کا جواب سُن کر سارا مجمعہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور بابا جی شرمندہ ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگے۔ جادوگر نے ایک نوجوان کی طرف اشارہ کر کے عامل، معمول کا سلسلہ دہرایا۔

''میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہے میں پاس ہو جاؤں گا نا؟'' اس بار بھی لڑکے نے تیزی سے ''اس بار تمہاری دو پرچوں میں کمپارٹ آئے گی اُن کا

امتحان دے کر پاس ہو جاؤ گے۔'' نوجوان کڑوا سا منہ بنا کر ہاتھ پہ ہاتھ مار کر افسوس کرنے لگا۔ پھر ایک خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جادوگر نے کہا ''ہاں بہن جی آپ بتلائیں آپ کا کیا مسئلہ ہے؟''

''میرا شوہر بہت دنوں سے بیمار ہے سارے حکیم ڈاکٹروں کو دکھالیا آرام نہیں آتا'' لڑکے نے فٹافٹ نہار منہ کلونجی کے سات دانے اور دوپہر کے کھانے میں لہسن کا ایک جوا، رات کو سوتے وقت دودھ میں ہلدی ڈال کر پینے کا علاج بتا کر عورت کو خوش کر دیا۔ چوتھی باری ہماری تھی۔ جادوگر نے چھڑی کا رُخ ہماری طرف کرتے ہوئے مخصوص جملے دہرائے۔

ہم نے دائیں بائیں نظر دوڑا کر اونچی آواز میں ''میں اسٹوری رائٹر ہوں اور میں نے کئی فلم ڈائریکٹروں کو اپنی اسٹوری بھیجی ہوئی ہے کامیابی ہوگی یا نہیں؟'' پہلے کی مانند لڑکے نے مشین کی طرح گھرر کر دیا ''صاحب جھوٹ بولتا ہے کہانی وانی بہانا ہے صاحب ایکٹر بننا چاہتا ہے'' مجمعے میں بہت زور کا قہقہہ پڑا طبیعت اتنی کسیلی ہوئی کہ مزید سوال کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

باری باری کوئی ایک درجن لوگوں سے سوال و جواب کرنے کے بعد جادوگر کا مجمعے پر سحر طاری ہو گیا تھا لوہا گرم دیکھ کر اُس نے پٹاری سے ایک تھیلی نکالی اور جذبات سے بھرپور آواز میں ''صاحبان قدردان'' کا نعرہ لگا کر تھیلی سے انگوٹھیاں دکھاتے ہوئے چاروں طرف گھوم کر بارہ آنے، بارہ آنے کہہ کر بولا ''صاحبان قدردان! یہ کوئی عام انگوٹھی نہیں طلسماتی انگوٹھی ہے جسے پہننے سے آپ کے بگڑے کام بن جائیں گے۔ صاحب پاس ہو جائے گا، صاحب ایکٹر بن جائے گا، صاحب کو لون مل جائے گا، صاحب کو نوکری مل جائے گی'' اس بار بھی پہلے میں پہلے میں کے چکر میں جادوگر کی ساری انگوٹھیاں منٹوں میں بک گئیں۔

شیشے کا سلسلہ اور شدت اختیار کر گیا اب تو ہمیں بڑے بڑے نامور ہیرو اپنے سامنے پھیکے نظر آنے لگے۔ بازار میں آتے جاتے جب بھی فلمی پوسٹروں پر نظر پڑتی تو کسی ہیرو کے کان بڑے نظر آتے، کسی کی آنکھیں چُندی نظر آتیں، کسی کی ناک پکوڑا لگتی، کسی کے دانت لمبے لگتے، کوئی ٹھگنا لگتا اور کسی کا پیٹ لٹکا نظر آتا۔ دوسری صبح ہم شیشے میں خود کو دیکھ کر دل ہی دل میں کہتے کہ ایک دفعہ چانس مل جائے پھر دیکھو میں ان سب کی چھٹی کیسے کراتا ہوں۔ شاید اُس دن ہماری قسمت کا ستارہ عروج پر تھا۔ جونہی ڈیوٹی پر پہنچے تو انصار نے ہمیں خوش خبری سنائی ''یار صبح سے تجھے ڈھونڈ رہا ہوں'' جواب میں ہم نے کہا ''خیریت'' انصار نے شوخی سے کہا ''منہ میٹھا کراؤ پھر بتلاؤں گا'' انصار کے چہرے کی لالی دیکھ کر سوال کرنے کے بجائے ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر نا نو حلوائی کی طرف بڑھ گئے۔ دو دو چورے کے لڈو اور ایک ایک چائے کا آرڈر دے کر کرسیوں پر بیٹھے تو میں نے انصار سے خوشخبری کی بابت پوچھا۔ انصار نے میری رانوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ''سمجھو تمہاری لاٹری نکل آئی'' ہمارے لیے لاٹری کا لفظ نیا تو نہیں تھا مگر حیرت اس بات پر تھی کہ ہم نے کوئی ٹکٹ وغیرہ خریدا نہیں پھر کون سی لاٹری نکل آئی ہے۔ انصار نے لڈو پر دانت گاڑ کے سُڑپ کر کے چائے کا بڑا سا گھونٹ بھرا ''خالو جی آ گئے ہیں۔'' ایک دم ہمارے منہ سے چیخ کے انداز میں نکلا ''کب''۔ انصار نے جواب دیا ''رات کو''۔

اُسی دن چھٹی کے بعد ہم اور انصار سیدھے انصار کے خالو شہنشاہ حسین نجفی سے ملنے چلے گئے۔ کھڑا پاجامہ اور کالی شیروانی پہنے ہوئے چارپائی پر بیٹھے بیڑی پی رہے تھے۔ چہرے مہرے سے شریف آدمی نظر آتے تھے، بات چیت میں بھی ویسے ہی نکلے۔ انصار نے خالو سے جس انداز میں ہمارا ذکر کیا اُس سے تصدیق ہو گئی کہ خالو ہمارے نام سے واقف ہیں۔ کچھ دیر بیڑی کا کش لے کر اُسے غور سے دیکھا اور پیر سے مسلنے کے بعد منہ سے دھواں نکال کر بولے ''دیکھو میاں بات یہ ہے کہ میں وہاں کوئی بڑا آدمی نہیں لگا ہوا کہ جاتے ہی آپ کو ایکٹر بنا دوں گا۔ ہاں چند لوگوں سے میرے مراسم ضرور ہیں۔ امید ہے کسی نہ کسی شعبے میں آپ فٹ ہو ہی جاؤ گے۔ مگر ایک بات صاف سُن لو، رہائش کا بندوبست آپ کو خود کرنا پڑے گا کیونکہ میں بھی کسی دوست کے پاس جا کر ٹھہروں گا۔''

نجفی صاحب کا جملہ سُنتے ہی ہمارے ذہن میں نعیم کا نام کوندا اور ہم نے خوشی خوشی جی کہتے ہوئے ہنکارا بھر کے اُن کی بات کی تصدیق کر دی۔ اب مسئلہ درپیش یہ تھا کہ وہ جائیں گے کب۔ جواب میں نجفی صاحب نے بتلایا کہ ان کی زمینوں پر رشتے داروں نے قبضہ کر لیا ہے جس پر وہ مقدمہ دائر کرنے آئیں ہیں۔ جونہی مقدمہ دائر ہو جائے گا تو واپس جا کر اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے کوئی بڑی سفارش ڈھونڈیں گے۔

ہمیں تسلی ہوئی کہ معاملہ مہینوں کا نہیں دنوں یا ہفتوں کا ہے۔ ہم خوشی خوشی گھر لوٹ آئے اور دوسرے دن کام پر جاتے ہی نعیم کو تلاش کر کے مسئلہ بیان کر دیا۔ نعیم نے جبڑے میں بیڑی منہ کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں گھماتے ہوئے ''یہ کون سی بڑی بات ہے تو ملا نہیں وہاب سے، جاتے وقت خط لے لیجو مجھ سے، وہاب بندوبست کر دے گا'' جتنی آسانی سے نعیم نے مسئلہ حل کر دیا تھا دل اور دماغ اُتنی آسانی سے قبول کرنے کو تیار نہ تھے مگر پھر وہاب کا خیال آیا کہ وہ جب بھی گھر آتا ہے قیمتی لباس کے ساتھ ہاتھ میں گولڈ فلیک کی ڈبی اور چمچماتا لائٹر ضرور ہوتا ہے۔ جس سے بھی ملتا اُسے سگریٹ پیش کرنے کے بعد بتلاتا کہ وہاں اُس کا ہوٹل ہے اور بڑے بڑے اداکار شام کو اُس کے ہاں کھانا کھانے آتے ہیں اور کئی ایک تو اُس کے بے تکلف دوست ہیں جن کے گھر وہاب کا آنا جانا ہے۔

اب ہمارا یہ معمول تھا کہ کام سے چھٹی کرنے کے بعد دوسرے تیسرے کچہری کا چکر ضرور لگاتے جہاں شہنشاہ حسین نجفی سے ملاقات ہو جاتی اور وہ اپنے کیس کی پیش رفت سے ہمیں آگاہ کرتے۔ پانچ سات ملاقاتوں کے بعد کوئی تین ہفتے گزرے ہوں گے کہ نجفی صاحب نے ہمیں خوشخبری سنائی کہ کل صبح آپ آٹھ بجے اسٹیشن پہنچ جائیں جمعرات کا ٹکٹ بک کروانا ہے۔ نجفی صاحب کی جانب سے خوشخبری سُن کے ہمارے منہ سے جھاگ برآمد ہو جاتے اگر ہم خود پر قابو نہ پاتے۔ ہم نے ہاتھ ملانے کے بجائے گرم جوش معانقہ کر کے نجفی صاحب سے بروقت اسٹیشن پہنچنے کا وعدہ کیا اور خوشی خوشی گھر آ کے تیاری میں جُٹ گئے۔ جمعرات کی شام پانچ بجے ٹرین روانہ ہوئی جہاں ہمارے دوست احمد، اصغر،

دلشاد جنہوں نے بدھ کی رات ہمیں ٹریٹ کے طور پر ہوٹل میں کھانا کھلایا اور رات نو سے بارہ فلم دکھائی تھی بھری آنکھوں سے ہمیں یہ کہتے ہوئے خدا حافظ کہا ''کسی بات کی فکر مت کیجو ہم یہاں بیٹھے ہیں''

زندگی میں ہمارا یہ پہلا طویل سفر تھا جو نہایت شفیق بزرگ شہنشاہ حسین نجفی کی ہمراہی میں کٹ رہا تھا وہ ہر اسٹیشن کی بابت مفید معلومات اور اُس شہر کی خصوصیات بتلا کر ہمیں باخبر کرتے رہے۔ ہفتے کی صبح جس وقت انہوں نے ہمیں نوید سنائی کہ اگلا اسٹیشن فلم نگری کا ہوگا تو خوشی سے ہماری باچھیں کھِل گئیں اور جلدی سے ہم نے اپنا ٹرنک برتھ سے اٹھا کر ٹرین کے فرش پہ رکھ لیا اور جوں ہی اگلا اسٹیشن آیا تو ہم ٹرین سے اترنے کے لیے تیار ہو گئے۔ نجفی صاحب نے ہمیں دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر کہا ''یہاں نہیں اترنا یہ لوکل اسٹیشن ہے'' اسی طرح پانچ اسٹیشن درمیان میں آئے اور ہم ہر بار دروازے کی جانب اترنے کے لیے لپکے اور ہر بار نجفی صاحب نے لوکل اسٹیشن کہہ کر ہمارا ہاتھ تھام لیا۔ جب سینٹرل اسٹیشن آیا تو ہمیں خود اندازا ہو گیا کہ ہماری منزل آ گئی ہے۔ سٹیشن سے اترنے کے بعد نجفی صاحب ہمیں ایرانی حمام لے گئے جہاں کے غسل، مالش اور کالی چائے نے تین دن کی تھکن منٹوں میں اُتار کر ہمیں پھول کی مانند ہلکا پھلکا کر دیا۔ اُس کے بعد ہم نے حمام کے سامنے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا جس کی ادائیگی نجفی صاحب نے کی۔ کھانے کے بعد چائے کا مشاہدہ بھی دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ نجفی صاحب نے دائیں ہاتھ کی انگلی کو بائیں ہاتھ کی انگلی کے درمیان میں رکھ کے دو کا اشارہ کیا۔ جب چائے آئی تو وہ آدھا کپ تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں پر آدھا کپ چائے بھی ملتی ہے۔ چائے سے فراغت کے بعد نجفی صاحب نے ٹیکسی بلائی اور اپنی منزل مقصود ناگ پاڑا پہنچ کر کاگل والا بلڈنگ میں اپنے دوست فیض عالم فیض آرٹ ڈائریکٹر کے گھر سامان رکھا اور ہمارا تعارف کرا کر تیزی سے نیچے اتر آئے اور اُسی ٹیکسی میں بیٹھ کر ہم سے مطلوبہ پتے کی چٹ مانگی اور باہر نکل کر ٹیکسی والے کو ایڈریس سمجھایا۔

مطلوبہ جگہ پہنچ کر کافی دیر ہم وہاب ہوٹل ڈھونڈتے رہے۔ ہر شخص اس نام کے ہوٹل سے ناواقف تھا۔ اسے ہماری خوش قسمتی کہیے کہ سامنے سے ایک بزرگ آتے ہوئے مل گئے۔ جب ہم نے اُن کو اپنی مشکل سے آگاہ کیا تو بزرگوار تنک کر بولے ''ساری زندگی ڈھونڈتے رہو گے نہیں ملے گا'' ہمارے منہ سے نکلا ''کیوں'' جواب میں بزرگوار نے کہا ''میاں! اس نام کا کوئی ہوٹل ہو تو ملے نا۔ سیدھا سیدھا کہو وہاب سے ملنا ہے، آؤ میں ملواتا ہوں'' بزرگوار مین روڈ پر کچھ دور چلنے کے بعد دائیں جانب ایک تنگ گلی میں مڑے اور اُس گلی میں چند قدم چلنے کے بعد ایک کھولی کے آگے رُک کر اشارہ کرتے ہوئے بولے ''وہ پیٹھ والا وہاب ہے جاؤ مل لو'' وہاب کے نام پر مذکورہ شخص چونکا تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ چھ بائی آٹھ کی سرنگ نما کھولی جس کی ٹین کی چھت میں بڑے بڑے مورے نظر آ رہے تھے وہاب صاحب ایک تہبند میں بیٹھے سیخ کباب بنا رہے تھے۔ ایک دفعہ تو ہمیں دیکھ کر سٹپٹائے پھر ہمت جٹا کر بے دلی سے ہاتھ ملایا اور بولے ''تم کیسے'' ہم نے جیب سے نعیم کا خط نکال کر وہاب کی طرف بڑھا دیا۔ خط پڑھنے کے بعد وہاب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ گئیں۔ ''یار یہ نعیم بھی نا سالا۔۔۔!'' منہ ہی منہ میں بڑبڑانے کے بعد چند قدم آگے چل کر ایک جھونپڑی کی جانب اشارہ کر کے معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوا ''بھائی بُرا مانو یا بھلا میرے پاس یہ جگہ ہے سامنے سے چارپائی خرید لو اور رات کو یہاں سو جایا کرو۔ دن میں جب تم جاؤ گے تو تمہارا بستر میں کہیں رکھ دیا کروں گا۔''

ہم نے جواب میں وہاب سے کہا کہ سامان تو فیض صاحب کے گھر ہے۔ وہاب نے اپنے ساتھی سے قمیض مانگ کر پہنی اور ہمارے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور راستے بھر فلم نگر کی زندگی کے مسائل سے آگاہ کرتے ہوئے بولا ''میرے پاس صرف ایک جوڑا ہے جو میں ہر روز صبح ارجنٹ دھلنے کے لیے دیتا ہوں اور رات کو دکان داری کے وقت پہن لیتا ہوں۔ واپسی پر پتہ لگا کہ باہر جو پان کا کھوکا ہے وہ وہاب کے بھائی کا ہے اور پتہ بتانے والے بزرگ وہاب کے سسر ہیں کیونکہ اُس نے اُسی دکان میں ہمارا ٹرنک رکھتے ہوئے بستر بند نیچے رکھ کر کہا ''آؤ چارپائی لے آئیں''

اوّل تو ساری رات نیند نہیں آئی بستر پر لیٹنے کے بعد علم ہوا کہ بچّو سیٹھ کی باڑی طوائفوں کا بازار ہے جہاں وہاب صاحب رات کو ٹھیلے پر کباب فروخت کرتے ہیں۔ ساری رات ہر کوٹھے سے ایک ہی گانے کی بے سُری آوازیں کانوں میں آنے کے سبب نیند نہ آئی۔ صبح اُٹھ کر ہم نے وہاب سے باتھ روم کی بابت دریافت کیا تو اس نے دانتوں میں نیم کی داتن دبائے سامنے گلی لائن کی جانب اشارہ کر دیا۔ دائیں جانب خواتین کی لائن تھی اور بائیں جانب مردوں کی۔ جان پہچان والوں کا آپس میں تبادلہ خیال جاری تھا۔ ہمارے لیے یہ صورتِ حال قطعی نئی تھی۔ ہم کبھی پیر پہ پیر رکھتے کبھی پیٹ دباتے کبھی جھکتے۔ خواتین کی لائن میں کھڑی تیکھے نین نقش والی لڑکی نے ہمیں مخاطب کر کے کہا ''کیوں رے چکنے! بہت پریشر لگا ہے'' جواب میں سر کے اشارے سے ہم نے ''ہاں'' میں سر ہلایا تو اُس نے اونچی آواز میں لائن میں اگلی طرف لگے کالے رنگ اور گھنگھریالے بال والے پستہ قد شخص کو مخاطب کیا ''او، سوڈے کی بوتل، ہاں ہاں تو اِچ، تیرے کو چکنے کی جگہ آنا مانگتا اور چکنے کو تیری جگہ'' کالے اور ٹھگنے شخص نے کڑوا منہ بناتے ہوئے ''بولے تو میرے کو بہت جور کا۔۔۔'' پستہ قد والے کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ تیکھے نین نقش والی لڑکی نے غصے سے ''بول دیا تو بول دیا، تیرے کو ادھر آنے کا، چکنے کو اُدھر جانے کا'' اظہار ممنونیت میں لڑکی کی جانب شکریہ سے سر ہلاتے ہوئے ہم پستہ قد کی جگہ لائن میں کھڑے ہو گئے اور ایک آدمی کے بعد ہماری باری آ گئی۔

یہاں بھی قسمت نے یاوری کی کہ نجفی صاحب اپنے دوست مہدی حسن جو ایک بڑے ادارے کے پروڈکشن منیجر ہوا کرتے تھے یہ کہہ کر اُن سے ملانے لے گئے کہ ان سے رابطے میں رہنے کا بہت فائدہ ہوگا۔ بڑا ادارہ ہے اور بہت سے لوگ آتے جاتے ہیں۔ جب ہم نجفی صاحب کی ہمراہی میں مہدی حسن صاحب کے دفتر گئے تو معلوم ہوا کہ وہ ڈائریکٹر بن گئے ہیں اور آج کل گولڈن اسٹوڈیو میں اپنی فلم ''گھر کی عزت'' کی شوٹنگ کر رہے ہیں۔ ایک طرف دوست کے ڈائریکٹر بننے پر نجفی صاحب خوش تھے، دوسری طرف اُنہیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ پوزیشن بدلنے کے بعد نجانے مہدی حسن صاحب کا رویہ کیا ہو۔

یہاں نجفی صاحب کی خوش قسمتی کام آئی کہ مہدی حسن صاحب نے نجفی صاحب کو دیکھتے ہی ''آہ ہا! میاں کہاں رہے اتنے دن، سب خیریت تو ہے؟'' نجفی صاحب نے سگریٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''سگریٹ ختم کر کے سیٹ پر آ کر سب کچھ بتاتا ہوں'' مہدی حسن صاحب نے گرمجوشی سے نجفی صاحب کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ''ابے یار! تمہارے بھائی کا سیٹ ہے، تم شوق سے حقہ پیؤ سگریٹ کیا چیز ہے۔''

رسمی علیک سلیک، خیر خیریت اور چائے کا دور چلنے کے بعد نجفی صاحب نے ہماری بابت اشارہ کرتے ہوئے بے تکلفانہ انداز میں صاف صاف مدعا بیان کر دیا۔ ایک منٹ کے لیے مہدی حسن صاحب ''ہوں'' کر کے سوچ میں گم ہو گئے پھر اسٹاف میں یسٰین نام کے کسی شخص کو آواز دیتے ہوئے بلا کر دریافت کرنے لگے ''ہاں بھئی کیا ہوا گلشن کا، کیا کہتا ہے وہ؟'' یسٰین صاحب نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو بغل میں دبا کر منہ میں دبے قلم کو نکالتے ہوئے ''سر کئی بار جا چکا ہوں اوّل تو گلشن صاحب ملتے نہیں اور اتفاق سے مل جائیں تو ڈھنگ سے بات نہیں کرتے'' مہدی حسن صاحب نے ایک بار پھر ''ہوں'' کہہ کر ٹھوڑی پر ہاتھ رکھا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا ''لعنت بھیجو گلشن ولشن پہ، اس لڑکے کو غور سے دیکھ کر بتاؤ، یہ کیسا رہے گا؟'' یسٰین صاحب نے ہمارے دائیں بائیں کا غور سے جائزہ لینے کے بعد سنجیدگی سے کہا ''میرے خیال میں تو ٹھیک ہے'' جواب میں مہدی حسن صاحب بولے ''صرف ٹھیک ہے؟'' یسٰین صاحب نے آواز کو اونچا کرتے ہوئے ''نہیں سر! بہت ٹھیک ہے'' مہدی حسن صاحب نے نجفی صاحب کے موہنڈے پر ہاتھ مارتے ہوئے ''لو بھئی نجفی تم بھی کیا یاد کرو گے کس رئیس سے پالا پڑا تھا، پھر یسٰین صاحب کی طرف منہ کر کے بولے اس شاٹ کے بعد لڑکے کے سکرین ٹیسٹ کی تیاری کرو۔''

یہاں سے فراغت کے بعد نجفی صاحب ہمیں مخاطب کر کے بولے ''میاں! آپ نے تو کمال کر دیا، کم از کم مجھے توقع نہیں تھی کہ آپ اس قدر اعتماد سے کیمرے کا سامنا کر لو گے مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں، میری کوشش ہو گی کہ جب تک میں کام پر نہیں لگتا زیادہ سے زیادہ لوگوں سے آپ کی ملاقات کراؤں، خدا کرے جس طرح آج اللہ نے مہربانی کی ہے ایسے ہی ایک دو مہربانیاں اور ہو جائیں تو پھر میں سرخرو ہو جاؤں گا۔''

شام کو تھک ہار کر ہم وہاب کے پاس بچّو سیٹھ کی باڑی میں پہنچے تو وہاب کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کلف لگی پینٹ شرٹ میں وہاب فلمی ہیرو سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ منہ میں دبی بائیں جانب ٹیڑھی سگریٹ نے وہاب کے انداز کو کچھ زیادہ ہی فلمی بنا دیا تھا۔ ٹھیلے پر گاہکوں کے ساتھ مصروف ہونے کے باعث وہاب نے سر کی جنبش سے سلام کا جواب دینے کے بعد ہاتھ کے اشارے سے ہمیں جھونپڑی کی جانب جانے کا اشارہ کر دیا۔ جوتے اور موزے اتار کر بستر بند جو پہلے سے وہاب نے وہاں رکھ دیا تھا کھولا اور تکیے پر سر رکھ کر خیالات کا تانا بانا بننے لگے۔ ایک دل کہتا کہ کسی طرح دوستوں کو آج کی کامیابی سے مطلع کروں۔ لاکھ سوچنے اور ذہن پر زور دینے کے باوجود کسی عزیز، رشتے دار یا دوست کے پاس فون ہونے کا دور دور تک گمان نہ تھا۔ سو جیب سے کاغذ اور قلم نکال کر خط لکھنے بیٹھ گئے۔

پیارے احمد سلام کے بعد سلام دعا بھی نہ لکھ پائے تھے کہ صبح والا پستہ قد شخص ہمارے قریب آ کر ''کس کو چٹھی لکھتا صاحب؟'' جوں ہی ہم نے نظر اٹھائی تو اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے پر توجہ کرتے ہوئے ''یہ کیا ہے؟'' پستہ قد شخص نے دائیں بائیں دیکھ کر تسلی کرتے ہوئے راز درانہ انداز میں ''میم صاحب نے بھیجا ہے'' لفظ ''میم صاحب'' پر حیرت سے ''کون سی میم صاحب؟'' پستہ قد شخص نے ہماری حیرانی کو نظر انداز کرتے ہوئے شوخی سے ''بولے تو، وہ، صبح والا میم صاحب'' صبح والی میم صاحب کا سنتے ہی ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلا ''پر کیوں'' پستہ قد نے بھی ہمارے سوال کے جواب میں ''میرے کو کیا معلوم؟'' پستہ قد کا جواب سن کر ہم نے بھی اُسی کے انداز میں کہا ''تیرے کو نی معلوم میرے کو نی معلوم، بس واپس لے جا'' ہمارا جواب سن کر پستہ قد خوشامد پر اُتر آیا ''صاحب لے لونا، آپ نی لے گا تو سمجھو میں کھلاس'' گلے کے اوپر چھری کا اشارہ کرتے ہوئے ''مطلب''۔ ''بہت غصے والا ہے میم صاحب'' پستہ قد والے کے چہرے پر خوف دیکھا تو مجھے اُس پر ترس آ گیا ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا تو اُس نے ٹرے ہماری گود میں رکھ کر ''آپ بہت اچھا ہے صاحب، بہت اچھا ہے'' ہم نے بھی محبت سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا ''تمہارا نام کیا ہے؟'' پستہ قد ''سوڈے کی بوتل'' لاڈ سے اُس کے گال پر چپت لگاتے ہوئے ''یار تمہارا نام پوچھ رہا ہوں'' اس بار پستہ قد کے چہرے پر مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ''اے اِچ نام ہے صاحب اپن کا، اپن جب ادھر آیا تو بہت چھوٹا تھا، سیٹھ لوگ ادھر آتا، کوئی دیسی، کوئی ٹھرّا، کوئی ولایتی لاتا اور ہمارے کو بولتا سوڈا لاؤ، ادھر سب لوگ اپن کو سوڈے کی بوتل بلاتا''

دوسرے دن نجفی صاحب ہمیں فلمستان اسٹوڈیو، نگار اسٹوڈیو اور نشاط اسٹوڈیو دوستوں سے ملانے لے گئے۔ کسی نے ہمارا قد پوچھا، کسی نے تعلیم، کسی نے تجربہ، کسی نے چال دیکھی، کسی نے ڈائیلاگ بلوائے اور سب نے ایک ہی طرح کا وعدہ کیا ''آتے جاتے رہو، ملتے ملاتے رہو جب بھی تمہارے لائق کوئی کام ہوا تو ضرور دیں گے'' اُن لوگوں کے جواب سے ہمیں اتنا اطمینان تو ہوا کہ باہر دھکے کھانے کے بجائے نجفی صاحب کے طفیل ان لوگوں سے براہِ راست گفتگو اور ملاقات کا موقع مل رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو کام بھی مل جائے گا۔ اسی طرح تیسرے روز بھی ہم جب تھک ہار کر بچّو سیٹھ کی باڑی پہنچے اور جھونپڑی میں بچھی اپنی چارپائی پر لیٹے تو تھوڑی دیر کے بعد سوڈے کی بوتل پھر کھانے کی ٹرے لے کر آ گیا۔ ہم نے پیار سے سوڈے کی بوتل کو اپنے پاس بٹھا کر کہا ''یار بات سنو! یہ روز روز کا تکلف ٹھیک نہیں ہے، ویسے بھی آج میں کھانا کھا کے آیا ہوں یہ تم واپس لے جاؤ اور اپنی میم صاحب کو بولو کہ کل سے یہ تکلف ختم ہونا چاہیے۔'' ہماری بات کا سوڈے کی بوتل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ قریب ہوتے ہوئے ''صاحب یہ رکھ لونا'' ایک دفعہ تو ہمیں اُس کے اوپر بہت پیار آیا خود کو مضبوط کرتے ہوئے غصے سے ''میں نے کہا نا لے جاؤ میں کھانا کھا کر آیا ہوں'' ہماری بات کو سنی اَن سنی کرتے ہوئے ''بولے تو سویرے کھانے کا، پلیز'' سوڈے کی بوتل کا انداز اس قدر عاجزانہ تھا کہ اُس کے ہاتھ سے ٹرے لیتے

ہوئے ہم نے سختی سے کہا''اگر آئندہ لے کر آئے تو میں کسی قیمت پر نہیں لوں گا''

چوتھے دن بھی کئی فلمی دفاتر اور پرانے وقتوں کی ہیروئن''شاردا'' سے ملاقات رہی۔شاردا سے نجفی صاحب کی بے تکلفی اور بار بار ہاتھ پہ ہاتھ مارنے کے عمل نے ہمارے اعتماد کو بڑھا دیا تھا یہاں بھی وعدے وعید، محنت اور لگن کی تاکید سے رخصت کیا گیا۔ کچھ وقت باقی تھا جسے ہم نے سمندر کی سیر کے لیے وقف کر دیا اور جب شام کو تھک ہار کر اپنی چارپائی پر گئے تو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آج سوڈے کی بوتل نہیں آیا۔روزمرہ کی طرح آج بھی وہی مشہور فلمی گیت''میرا نام ہے چنبیلی میں ہوں مالن البیلی'' بھونڈی آوازوں اور بے سُرے گلوں میں چیخ چیخ کر گایا جا رہا تھا۔اس سے قبل،کوفت ہیجان میں بدلے ایک ڈھکا چھپا نسوانی سراپا وہی ٹرے ہاتھ میں لے کر ہماری طرف بڑھا تو ہماری زبان کو گنگ لگ گئی۔ یہ وہی محترمہ تھیں جنہوں نے ہمیں سوڈے کی بوتل کی جگہ لائن میں لگوایا تھا۔دل میں جو وسوسے اور کھوج تھی وہ دُور ہوگئی۔ہم نے کچھ کہنے کے لیے زبان کھولی ہی تھی کہ نسوانی پیکر نے شستہ زبان میں کہا''بیٹھنے کو نہیں کہیں گے؟'' ہڑبڑا کر''جی،جی،تشریف رکھیے،فرمایئے کیسے تکلیف کی؟'' ہماری جانب مخصوص ٹرے بڑھاتے ہوئے''یہ لے لیجیے'' تمام تر عاجزی اور انکسار کو کام میں لاتے ہوئے''میں نے کل سوڈے کی بوتل سے کہہ دیا تھا کہ اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں''''ہم جانتے ہیں'' پہلو بدل کر ہم کھڑے ہوگئے''نہ میں آپ کو جانتا ہوں،نہ آپ مجھے جانتی ہیں پھر اس تکلف کا سبب؟''نسوانی سراپے نے سر سے پلو سرکاتے ہوئے''انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے''نسوانی سراپے کے جملے میں اتنی حلاوت تھی کہ سب کچھ بھول کر ہماری زبان سے نکلا''آپ کی زبان،لہجہ اور انداز اس قدر مہذب،آپ یہاں کی تو نہیں لگتیں؟''نسوانی سراپے نے ٹرے ہماری جانب بڑھاتے ہوئے''یہ پکڑیے تو کچھ عرض کریں!''

''جی فرمایئے'' ٹرے کو ہماری گود میں رکھتے ہوئے''آپ کھانا کھایئے ،ہمارے لہجے پر نہ جایئے ہم جو ہیں اور جہاں ہیں اُسے جاننا ہی کافی ہے'' ہاتھ میں پکڑا ہوا نوالہ خود بخود منہ کی جانب بڑھنے سے رک گیا۔''انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد''کیا کیجیے گا جان کر؟'' بظاہر تو ہمیں لاجواب کر دیا گیا مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری۔''گزشتہ چار روز سے جو تکلف آپ فرما رہی ہیں اس کا آپ کے پاس کوئی جواز ہے؟'' دوسری جانب سے طویل خاموشی کے بعد دھیمے لہجے میں''انسانیت'' جواب سے ہمارا حوصلہ بڑھا''ہم بھی اسی انسانیت کے ناتے اپنے میزبان سے باخبر ہونا چاہتے ہیں'' لمبی سانس کے بعد''مشکل میں ڈال دیا آپ نے۔۔۔ ہمارا تعلق اُس شہر سے ہے جو زمانے میں علم و ادب کا گہوارہ جانا جاتا ہے،مختصر مگر خوشحال گھرانہ تھا،دو بہنیں،امّاں،ابّا،چند کبوتر،چند مرغیاں اور ایک طوطا۔گریجویشن کے بعد پھوپھو کے گھر سے بڑی بہن کا رشتہ آیا تو امّاں ابّا نے خوشی خوشی''ہاں'' کر دی اور مہینہ بھر کے بعد بہن کو رخصت کرتے وقت جو خوشی اور سرشاری ہم پر طاری تھی وہ بیان سے باہر ہے۔اب گھر کی ذمہ داری ہم پر آن پڑی تھی۔ ہر روز صبح ابّا دکان پر جاتے تو ہم اُنہیں ناشتہ بنا کر دیتے اور جاتے وقت گھر کے ضروری سامان کی فہرست ابّا کو تھمانا نہ بھولتے۔کبھی کبھی ابّا ہماری دی ہوئی فہرست جوں کی توں یہ کہہ کر لوٹا دیتے کہ بٹیا معاف کرنا بھول گئے اور کبھی ہماری بتلائی ہوئی چیزوں سے زیادہ اپنی یا ہماری پسند کی چیزیں بھی لے آتے۔''

کئی دنوں سے شہر میں کشیدگی چل رہی تھی۔مخالف فرقے کا مذہبی جلوس مسجد کے آگے سے گزرا تو اذان ہو رہی تھی،نمازیوں نے بینڈ باجا بند کرنے کا کہا تو دونوں گروپوں کے درمیان ہاں اور ناں کی تکرار ہاتھا پائی تک بڑھ گئی مگر دونوں طرف کے سیانوں نے بیچ بچاؤ کرا کر بات رفع دفع کر دی۔ یہ صلح عارضی ثابت ہوئی۔ کبھی مسجد سے خنزیر کا سر برآمد ہوتا تو کبھی مندر سے گائے کا۔ بڑھتے بڑھتے نوبت یہاں تک آ گئی کہ کبھی ایک فرقے کے گھر کو آگ لگ جاتی تو کبھی دوسرے فرقے کے گھر کو۔ مگر یہ کسی کو نہ پتہ تھا کہ یہ آگ ایک دن پورے شہر کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ابّا پر کیا بیتی یہ ہم نہیں جانتے،امّی کس حال میں ہیں ہمیں یہ بھی نہیں پتہ۔جس وقت ہوش آیا بدرو ماموں کے ساتھ ٹرین میں تھے۔

دریافت کرنے پر بدرو ماموں نے بتلایا کہ تمہارے ابّا،امّاں جل کر فوت ہوگئے ہیں۔ پورا شہر آگ کی لپیٹ میں ہے۔ہمارے گھر والے بھی جل کر راکھ ہوگئے ہیں۔ بدرو ماموں کی زبان سے اس قدر ہولناک انکشافات سُن کر ہم پر پھر سے غشی کا دورہ پڑ گیا۔ نامعلوم کتنی دیر تک بے ہوش رہے جب ہوش آیا تو پانی مانگا۔سامنے والی سیٹ پر بیٹھی خاتون نے جلدی سے تھرموس سے پانی نکال کر ہماری طرف بڑھایا مشکل سے دو گھونٹ گلے سے اُترے۔نقاہت کے مارے سر گھوم رہا تھا اور جسم بے جان ہو چکا تھا۔ہم نے خود کو یکجا کرتے ہوئے بدرو ماموں سے پوچھا''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' بدرو ماموں نے خلاء میں ہاتھ گھما کر کہا ''جہاں اللہ لے جائے''

کئی دن کی جدوجہد کے بعد ایک کوٹھری سر چھپانے کو ملی جہاں تالا ڈال کر بدرو ماموں ہمیں بند کر کے دن بھر غائب رہتے،رات کو لوٹتے وقت کوئی ہلکا پھلکا کھانے پینے کا سامان لے آتے،کبھی دو نوالے تو کبھی چار نوالے زہر مار کر کے زندگی کی گاڑی چل رہی تھی۔ کچھ دنوں سے بدرو ماموں کے رویے میں تبدیلی نظر آ رہی تھی۔وہ بہانے بہانے سے کبھی ہمارے سر پر ہاتھ پھیرتے تو کبھی پیٹھ پر اور کبھی کھانا کھاتے وقت اپنے ہاتھ سے نوالے ہمارے منہ میں ڈالتے۔صورت حال ہمارے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی،برداشت کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

اُس روز کھانے کے ساتھ بدرو ماموں کوک کی بوتل بھی لے آئے۔ پہلے تو اُنہوں نے خود کھانے کے دوران بوتل سے چند گھونٹ لیے اور پھر بوتل ہماری طرف بڑھاتے ہوئے بولے''لے لو۔۔۔ہاضمہ ہو جائے گا'' انکار پر زبردستی اپنے ہاتھ سے ہمیں چند گھونٹ پلائے،کوک کا ذائقہ عجیب تھا جس کے باعث ہمیں ابکائی آنے لگی۔دریافت کرنے پر بولے''ہر علاقے کا اپنا ذائقہ ہوتا ہے، مجھے تو زیادہ فرق محسوس نہیں ہو رہا'' یہ کہہ کر پھر چند گھونٹ ہمارے حلق میں اتارے۔ یہ چند گھونٹ ہماری زندگی برباد کر گئے۔ بے شک امّی کے سوتیلے بھائی تھے پر ہم نے تو کبھی سگے سوتیلے کی تمیز ہی نہ رکھی۔ چوبیس گھنٹے اپنی بدنصیبی پر رونے میں گزر جاتے،بار بار دل میں یہی خیال آتا کہ امّاں ابّا کے ساتھ ہم کیوں نہ جل

کررا کھ ہو گئے۔ بدرو ماموں کے حوصلوں کے ساتھ زبان اور ہاتھ بھی بے باک ہو گئے تھے۔ ہم خدا سے دعا مانگتے کہ اس زندگی سے موت بہتر ہے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آنے والے دنوں میں ہمیں روز مرنا، روز جینا پڑے گا۔ اُس روز بھی بدرو ماموں نے ہمیں کوک کی بوتل کے چند گھونٹ پلائے تھے اور جب آنکھ کھلی تو ہم بچّو سیٹھ کی باڑی کے ایک کوٹھے کی زینت بن چکے تھے۔

اگلے کئی روز گھومنے، پھرنے اور اسٹوڈیوز کے چکر لگانے میں گزرا مگر جب نجفی صاحب کام پر لگ گئے تو ہمارے لیے وقت کاٹنا مسئلہ بن گیا۔ رات کو چنبیلی سونے نہ دیتی اور دن میں تنہائی کاٹنے کو آتی۔ اس کیفیت کا ذکر ہم نے نجفی صاحب سے کیا تو بولے ''اگلے مہینے کی کس تاریخ کو مہدی حسن صاحب نے کو بلایا ہے؟'' جواب میں ہم نے نجفی صاحب کو بتلایا ''بیس تاریخ کو'' نجفی صاحب بولے ''یعنی پچیس دن آپ کے پاس ابھی اور ہیں، آپ ایسا کریں واپس گھر چلے جائیں۔ ان دنوں میں کوشش کر کے میں آپ کی رہائش کا بندوبست کرتا ہوں پھر آپ آ جایئے گا۔'' نجفی صاحب کی بات سن کر منوں بوجھ سر سے اُتر گیا اور گھر کی یاد بھی شدت سے آنے لگی۔

حسب معمول شام کو عزیزہ محترمہ کھانا لے کر آئیں تو ہم نے اُن کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ کچھ دیر تو وہ سر نیچے کیے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے چارپائی کے بان آگے پیچھے کرتی رہیں پھر سر اوپر کر کے بولیں ''اچھا ہے اس گندگی سے جس قدر جلد آپ کی جان چھوٹ جائے بہتر ہے۔ ہمارا کیا ہے (ٹھنڈی آہ بھر کر) ہم تو گندے تالاب کی مچھلی ہیں، ہم نے تو یہیں جینا اور یہیں مرنا ہے'' نامعلوم کس جذبے کے تحت ہم نے جیسے ہی عزیزہ کا ہاتھ پکڑ کے اُنہیں تسلی دینے کی کوشش کی وہ سالم کی سالم ہمارے سینے میں سما گئیں۔ اُن کے آنسوؤں نے ہمارا شانہ تر کر دیا۔ ہم نے اُن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تسلی دی ''آپ کا کیا خیال ہے، ہم آپ کو تنہا چھوڑے جا رہے ہیں؟ نہیں جناب ہرگز نہیں، بس ذرا ہمارے پیر جمنے دیجیے پھر دیکھئے ہم آپ کو اس دلدل سے کیسے نکالتے ہیں'' ہمارے دلاسے پر دوپٹے سے آنسو صاف کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں عزیزہ نے ہماری طرف دیکھا تو اس بار ہم نے اُنہیں بھینچ کر گلے لگا لیا اور بے دریغ ہونٹوں کا استعمال کرتے ہوئے ٹھوڑی پکڑ کر اُن کا چہرہ اوپر اٹھا کر بولے ''آپ ہماری زندگی ہیں، کوئی اپنی زندگی کو چھوڑ کر جا سکتا ہے''

اگلا دن ہمارا اس شہر میں آخری دن تھا کیونکہ اس سے اگلی صبح پانچ بجے ہماری ٹرین نے روانہ ہونا تھا۔ صبح ہی صبح نجفی صاحب سے ملاقات کرنے اور مہدی حسن صاحب سے رابطے کے بعد ہم بچّو سیٹھ کی باڑی لوٹ آئے اور دن بھر سونے میں گزار دیا کہ نامعلوم ٹرین میں برتھ ملتی ہے کہ نہیں۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ دن کی نیند کا اجر اس قدر خوبصورت بھی مل سکتا ہے۔ وہ کوئی معمولی رات نہ تھی بلکہ سہاگ رات تھی، ہماری اور ثمینہ کی، ثمینہ لائق علی خان جواب ثمینہ اخلاق احمد بننے پر بہت نازاں تھیں۔ بس اُنہیں خدشہ تھا تو صرف اتنا کہ ہم وعدہ وفا کر پائیں گے کہ نہیں، ہمارے گھر والے ہمیں آنے کی اجازت دیں گے کہ نہیں۔ جب ہم نے اُنہیں اُن کی خواہش کے مطابق قسم اٹھا کر یقین دلایا کہ پہلے اس شہر میں ہمارے خواب بستے تھے اب خوابوں کی تعبیر بستی ہے ہم کیونکر ہر دو نعمتوں سے منہ موڑ سکتے ہیں۔

کہتے ہیں خدا جب دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ والد صاحب نے ہمارے تایا مقیم امریکہ سے ہمارے ویزے کی تاکید کر رکھی ہے مگر جب والد صاحب نے پاسپورٹ اور ویزہ ہمارے ہاتھ پر رکھے تو خوشی سے ہماری گھگی بندھ گئی۔ ہماری خاموشی پر والد صاحب نے تحکمانہ لہجے میں دریافت کیا ''کیوں خوشی نہیں ہوئی؟'' خیالات سے لوٹنے میں کچھ تاخیر ہوئی تو والد صاحب نے اپنا سوال غصے سے پھر دہرایا ''نہیں نہیں بہت خوشی ہوئی ہے، میں تو خوابوں میں امریکہ پہنچ گیا تھا۔'' بظاہر والد صاحب سے جھوٹ بولنا مصلحت کا تقاضا تھا مگر ہمیں شدت سے ثمینہ اور اُن سے کیے ہوئے وعدے کی پاسداری کی فکر ہو رہی تھی۔ والد صاحب نے تیاری کے لیے موٹی رقم تھما دی تھی جسے ہم نے ''جی اچھا'' کہہ کر جیب میں رکھ لیا۔

شاپنگ کے دوران دوستوں سے یہی مسئلہ زیر بحث رہتا۔ احمد کہتا کہ تُو امریکہ کا کہہ کر اپنی منزل کو نکل جا بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اصغر کو اختلاف تھا اور دلشاد کا کہنا یہ تھا ''آدمی کو اپنی خواہش کے مطابق چلنا چاہیے، اب تُو دیکھ لے تجھے اپنی بُلبل چاہیے یا کامیاب زندگی۔'' جب ہم نے اداکار بننے کی بابت بتلایا تو اصغر بولا ''بیٹا! یہ ہے جُوا، جو کسی کا نہ ہوا، پہلی بات تو یہ کہ اس کی کیا گارنٹی ہے کہ مہدی حسن لازمی تجھے اپنی فلم میں لیں گے دوسری بات یہ کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ فلم کامیاب بھی ہوگی، تیسری اور اہم بات یہ کہ تُو لازمی طور پر اس فلم کے بعد کامیاب اداکار بن جائے گا۔ بہتر یہ نہیں کہ تُو امریکہ چلا جا وہاں سے اپنی دوست کو خط لکھ دے اور بتلا دے کہ تُو بجائے ایک ماہ کے ایک سال بعد آ رہا ہے۔''

نیویارک پہنچ کر نئی دنیا، نئے لوگ اور سب سے بڑھ کر چچا جان کی الٹرا ماڈرن بیٹی نوشی جسے سب پیار میں ''شی'' کہہ کر بلاتے تھے کی جانب ایسی توجہ مرکوز ہوئی کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کر سکا۔ ایک دن، ایک ہفتہ، مہینہ، سال اور نوشی سے شادی کے بعد سالہا سال امریکہ میں گزارنے کے بعد جب بھی وطن لوٹتے تو اچھا بھلا وقت پاس ہو جاتا۔ کبھی کبھی دل کی خلش کے ہاتھوں ندامت کا سامنا ہوتا تو خود ساختہ تسلیاں دے کر اُسے بہکا لیتے۔ مگر آج اتنی مدت بعد وقت نے جس شدت سے ہمیں دبوچا ہے اُسے سوچ کر ہی پسینے آ رہے ہیں۔

کوئی کہہ سکتا تھا، کسی کے کہنے کو چھوڑیے، ہمارے اپنے وہم و گمان میں بھی نہ تھا، اُس رات کی کہانی، ایک دن زوردار تماچا بن کر ہمارے منہ کو ایسا مزہ چکھائے گی کہ ہم تو کیا ہماری سات نسلیں یاد رکھیں گی۔

سیانے کہہ گئے ہیں کہ اندھے کی ناک پر بیٹھی مکھی کو اللہ تعالیٰ اُڑاتا ہے یعنی مجبور کی دادرسی ہر حال میں کرتا ہے۔ بے شک! ہم گناہ گار ہیں، خطا کار ہیں، سزاوار ہیں، اس سب کے باوجود۔۔۔ اپنے رب کے بندے بھی تو ہیں!!!

''رقصِ آزردگاں''

واصف حسین واصف

(امریکہ)

ہر یقیں اک گماں بھی ہوتا ہے — تا حدِ لامکاں بھی ہوتا ہے
رزقِ حالات ہے مگر انساں — صرفِ کون و مکاں بھی ہوتا ہے
ہے گماں زاد قبر میں زندہ — وہ کرامت نشاں بھی ہوتا ہے
ہجر میں بھی چراغ جلتے ہیں — عشق معجز نشاں بھی ہوتا ہے
جشنِ تفسیر خواہشِ ناکام — خواب شرح زیاں بھی ہوتا ہے
میکدے میں نشاطِ رنگ کے بعد — رقصِ آزردگاں بھی ہوتا ہے
رسم ہے جھانکنے کی جس کے سبب — شورِ آوارگاں بھی ہوتا ہے

○

مادھو کوشک

(زیرک پور)

کیا بتاؤں درمیاں اب فاصلہ کوئی نہیں — سامنے منزل ہے لیکن راستہ کوئی نہیں
پھر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی مجھے — گھر میں پر میرے علاوہ دوسرا کوئی نہیں
جائزہ صورت کی اپنی لیں تو آخر کس طرح — شہر شیشے کا ہے لیکن آئینہ کوئی نہیں
اس سے کیا امید رکھیں اب کوئی بندہ نواز — آدمی جتنا ہے اتنا کھوکھلا کوئی نہیں
ذہن میں پسرا ہوا ہے ایک ریگستان سا — آج کل برسات میں بھی بھیگتا کوئی نہیں
ہنستے ہنستے ہی ہٹادے سب کے چہروں سے نقاب — ایسا لگتا ہے شہر میں سر پھرا کوئی نہیں
میری بستی کے سبھی لوگوں کو جانے کیا ہوا — دیکھتے رہتے ہیں سارے بولتا کوئی نہیں

○

انیس الرحمٰن

(سکھر)

اب ترے غم کو ترا غم نہ کہا جائے کیا! — چشم پُرنَم ہو تو پُرنَم نہ کہا جائے کیا!
رونقِ بزمِ طرَب دیکھ کے کیا لازم ہے؟ — زُلف برہم ہو تو برہم نہ کہا جائے کیا!
یہ الگ بات ترے زخم نہ بھولے لیکن — اب تجھے مونس و ہمدم نہ کہا جائے کیا!
یہ جو ہنستے ہوئے بھر آتی ہیں آنکھیں سب کی — ایسے انداز کو ماتم نہ کہا جائے کیا!
ہے جو تاثیرِ مسیحائی ترے لہجے میں — تیرے الفاظ کو مرہم نہ کہا جائے کیا!

○

نوید سروش
(میرپورخاص)

یہ کون مست قلندر مری تلاش میں ہے
کہ رنگ و نور کا منظر مری تلاش میں ہے

مرے قدم کے نشانات ایسے پختہ تھے
جو قافلے کا تھا رہبر مری تلاش میں ہے

کوئی بتائے مجھے اس کو کیا کہوں آخر
وہ مجھ میں رہ کر بھی اکثر میری تلاش میں ہے

تلاشِ منزلِ مقصود میں نہیں کرتا
ہر ایک مرکز و محور مری تلاش میں ہے

مرے ایک اشک کی قیمت کھلی ہے جس پر بھی
وہ آب جو، وہ سمندر مری تلاش میں ہے

تلاشِ رزق میں گھر سے نکل تو جاتا ہوں
مگر نصیب و مقدر مری تلاش میں ہے

○

ڈاکٹر عمر قیاز قائل
(بنوں)

وطن سے دُور کوئی تو وطن کی بات کرو
اُداس دِل ہے کسی انجمن کی بات کرو

عجب نہیں ہے کہ دھڑکن بحال ہو جائے
جو ہو سکے تو کسی گُل بدن کی بات کرو

بہت اُداس ہے پہلے ہی میرے دِل کی فضا
کوئی مزید نہ رُعمِ شِکن کی بات کرو

وہ کم نِگاہ تغافل شعار ہے لیکن
وہ مِل بھی سکتا ہے اُس کے جتن کی بات کرو

وطن کے لوگ تو عُنوانِ گفتگو ہیں سدا
مگر جو دُور ہے اُس بے وطن کی بات کرو

جو زخم زخم سا ہے گفتگو کرو اُس کی
جو تار تار ہے اُس پیرہن کی بات کرو

شباب میں لیے پھرتا ہُوں درد پیری یہاں
ادا و غمزہ کسی بانکپن کی بات کرو

حصار ٹُوٹ بھی سکتا ہے ظُلم کا قائل
فراز و فیض کے طرزِ سُخن کی بات کرو

○

مقسط ندیم
(لاہور)

شہرِ مستقل میں جایا جا سکتا ہے
وقت کو آگے پیچھے لایا جا سکتا ہے

پانی پر بنیادیں رکھی جا سکتی ہیں
بیچ سمندر شہر بسایا جا سکتا ہے

اُس فہرست میں اَب خوشبو بھی شامل ہے
جن چیزوں کو ہاتھ لگایا جا سکتا ہے

میرا کوئی جگہ پر ہونا ممکن ہے
اُس کو ملنے میرا سایہ جا سکتا ہے

جن باتوں پر خون بہا دیتے ہو تم
اُن باتوں پر ہاتھ ملایا جا سکتا ہے

کچھ لوگوں میں بات ہی ایسی ہوتی ہے
کچھ لوگوں سے دھوکہ کھایا جا سکتا ہے

مقسط غصّہ آیا تو معلوم ہوا
پینے والی چیز کو کھایا جا سکتا ہے

○

تصور اقبال
(الک)

میں نے یہ کب کہا گھر میں کوئی نہیں — میری ماں رات بھر آج سوئی نہیں
فصل کاٹی ہے اُس نے بھلا آج کیوں — اپنے ہاتھوں سے کل جس نے بوئی نہیں
جسم سے کیا تعلق ہے اُس کا بتا — یادِ اللہ میں جو روح کھوئی نہیں
اُن کی خاطر جلایا تھا ہم نے دیا — اُن کے گھر روشنی پھر بھی کوئی نہیں
اپنے منہ سے اُسے ہاتھ کیونکر کہوں؟ — پیار کی جس نے مالا پروئی نہیں
یوں تو لپٹی رہی یاد اُن کی مگر — میں بھی سویا نہیں یہ بھی سوئی نہیں
جس کو کہتے ہیں وہ آنکھ ہی آج بھی — میری خاطر وہ اک اشک روئی نہیں
پھر تصور جی کیسے لگی ہے تری — گھی میں اُنگلی تو میں نے ڈبوئی نہیں

خورشید طلب
(جمشید پور)

جب بھی کرتے ہو کچھ تماشا تم — اوڑھ لیتے ہو میرا چہرہ تم
ہم وہاں سے نظر نہ آئینگے — دیکھتے ہو جہاں سے دنیا تم
دوسرا کوئی ہو نہیں سکتا — مجھ سا ''میں'' اور تمہارے جیسا ''تم''
جتنی آنکھیں عقاب کی آنکھیں — اور ننھی سی ایک چڑیا تم
ایک دن میں نہیں رہوں گا یہاں — اور ڈھونڈھو گے میرے جیسا تم
صرف کہنے کو رہ گیا ہوں میں — مجھ میں ہو اسقدر زیادہ تم
صورتِ حال مختلف ہوتی — مجھ پہ کرتے اگر بھروسہ تم
جب کوئی اچھا شعر ہوتا ہے — یاد آتے ہو بے تحاشہ تم
تم تو نکلوگی میری روح کے ساتھ — ہو مری آخری تمنّا تم

شکیل اعظمی
(ممبئی)

بستروں پر دھرے دھرے سے ہیں — لوگ گھر میں مرے مرے سے ہیں
دیکھتے کچھ، دکھا رہے ہیں کچھ — آئنے بھی ڈرے ڈرے سے ہیں
کھوکھلی ہو گئیں جڑیں ساری — پیڑ پھر بھی ہرے ہرے سے ہیں
زندگی سانس کو ترستی ہے — اور موسم پرے پرے سے ہیں
سب دکانوں پہ پڑ گئے تالے — نوٹ رکھے کھرے کھرے سے ہیں
شہر سے گاؤں تک ہے لاش ہی لاش — جو بچے ہیں وہ مقبرے سے ہیں
جتنے دل ہیں دکھے ہوئے ہیں شکیل — سارے دیدے بھرے بھرے سے ہیں

احمد سوز
(ممبئی)

اک طرف وہ تھے اک طرف میں تھا　　سب شکاری تھے اور ہدف میں تھا
لمسِ اجسام کچھ نہ کر پایا　　کندھے سے کندھا صف بہ صف میں تھا
ہمنوا سب کے سب فرار ہوے　　آگے باطل کے سر بہ کف میں تھا
میرے بھائی تھے بھائی یوسف کے　　سب کے سب ناخلف خلف میں تھا
اپنے ہی ہاتھوں پٹ رہا تھا میں　　ہاتھ میرے تھے اور دف میں تھا
میری حق گوئی تھی مری دشمن　　صرف اک شخص بر طرف میں تھا
مجھے صدیوں کا تجربہ حاصل　　سوز جی ایک میں الف میں تھا

○

تسنیم کوثر
(لاہور)

جس کو دیکھو مبتلا ہے کرب میں آزار میں　　موت بھاگی پھر رہی ہے کوچہ و بازار میں
اس وبا نے قریہ قریہ بخش دیں ویرانیاں　　خوف کی گھنٹی بجی ہر ایک دل کے تار میں
رونقیں بھی ختم ساری محفلیں بے رنگ ہیں　　دن گزرتے جا رہے ہیں اب اسی آزار میں
آج کل سہمے ہوئے ہیں خوشبوؤں کے قافلے　　دھول اڑتی پھر رہی ہے دل کے لالہ زار میں
آزمائش کی گھڑی ہے یا گناہوں کی سزا　　سب الجھ کے رہ گئے ہیں اب اسی تکرار میں
کم فہم کب ڈر رہے ہیں صورت حالات سے　　بے خطر یہ گھومتے ہیں ہر گلی بازار میں
اس وبا کو، اس بلا کو ٹال دے تو اے خدا　　کر رہے ہیں التجا ہم سب ترے دربار میں

○

ارشد سعید
(سڈنی)

راہِ حیات یوں جو فروزاں ہے اِن دنوں　　دل میں چراغِ منزلِ جاناں ہے اِن دنوں
کیا جانے اب کے ہجر میں کیا دل کا حال ہو　　ہر موجِ درد خیز سے طوفاں ہے اِن دنوں
مہکی نہیں ہے یوں ہی تری یاد کی بہار　　پھولوں میں تیرا حُسن بھی پنہاں ہے اِن دنوں
تم کیا گئے کہ کھلنے لگے زخم کے گلاب　　سوداغِ دل بھی رنگِ بہاراں ہے اِن دنوں
یہ ہجر دل سے وقت کا احساس لے گیا　　لمحے تمہاری یاد کے صدیاں ہیں اِن دنوں
ارشدؔ میں آئنے میں اُسے دیکھتا رہا　　اُس پر عجیب رنگِ گریزاں ہے اِن دنوں

○

خطرناک کھلونے

تابش خانزادہ
(نیویارک)

میرے ایک دوست کا سترہ سالہ بیٹا اوکسی کا ٹن (Ocxycodone) کی اوڑدوز (Overdose) کی وجہ سے دوسال تک مسلسل کومے میں رہنے کی بعد فوت ہوا ہے۔ایک دوسرے جانکار کی بیس سالہ بیٹی پچھلے تین سال سے کرسٹل یا برف نامی نشے کے مسلسل استعمال کے بعد مستقل طور پر پاگل خانے میں ہے۔جب میں نے والدین سے پوچھا کہ انہوں نے اپنے بچوں میں نشہ کے استعمال کے آثار کیوں نہیں دیکھے تھے تو ایک والد نے جواب دیا، یار میں نے سوچا کہ بچہ ہے ٹھوکر کھا کر خود ہی سنبھل جائے گا۔یہ کوئی پتنگ بازی کی عادت نہیں ہے کہ چھت سے گر کر پاؤں میں موچ آنے پر بچہ سنبھل جائے گا۔ایک ماں نے میرے اسی سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا، بھائی صاحب کیا کریں ہم عزت دار لوگ ہیں۔بدنامی کے ڈر سے مسئلہ دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔میں نے کہا بھابھی اگر آپ کے کپڑوں میں آگ لگی ہو تو کیا آپ ننگے ہونے کے خوف سے جل کر مرنا پسند کریں گی؟ تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔نشے کا استعمال کوئی مذاق نہیں ہے کہ انسان ٹھوکر کھا کر سنبھل جاتا ہے اور جھوٹا بھرم قائم رکھنے سے مسئلہ خود بخود ٹل جاتا ہے۔یہ تو ایسی بلا ہے جو ایک بار چمٹ جانے کے بعد نہیں چھوٹتی۔

اس مقالے کا مقصد ہماری نئی نسل میں استعمال ہونے والے نشہ آور کیمیائی مادوں اور ان کے استعمال کی بچوں میں نشانیاں بتانا مقصود ہے تاکہ پڑھنے والے انہیں پہچان کر بروقت مداخلت کر سکیں۔سگریٹ پینے کی عادت تمام منشیات کی جڑ ہے اس لیے اگر بچے کچی عمر میں سگریٹ پینے لگیں تو آپ کو اور زیادہ محتاط ہونا چاہیے کیونکہ منشیات کی عادت سگریٹ کی عادت کے بعد شروع ہوتی ہیں۔یہاں بچوں سے میری مراد زیادہ تر ہائی سکول اور ابتدائی کالج کے بچوں سے ہے۔

پی سی پی (Phencyclidine or PCP) کو سب سے پہلے پارک اینڈ ڈیوس کمپنی نے ۱۹۲۹ء میں دواؤں کی دنیا سے متعارف کرایا۔ابتدا میں اسے آپریشن کے دوران نشہ دینے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا جو بعد میں نشہ کے طور پر استعمال کی جانے لگی۔۱۹۶۵ء میں PCP کو ہپیوں نے چرس، بھنگ اور افیون کے متبادل استعمال کرنا شروع کیا تو امریکہ میں اس پر پابندی لگادی گئی لیکن اس کا غیر قانونی استعمال اب تک برقرار ہے۔PCP سیال (Liquid) کی صورت میں ملتی ہے اور اس کو استعمال کرنے کے لیے سگریٹ پر ڈال کر پیا جاتا ہے۔امریکہ کی نئی نسل میں اس کا استعمال اگرچہ عام نہیں اس کے باوجود PCP اب بھی ہائی سکولوں کے کچھ بچوں کا شوق ہے۔اس کے استعمال سے ہاتھ اور پاؤں بے جان محسوس ہوتے ہیں، انسان خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے ہوا میں اُڑان کی کوشش میں بے توازن ہو جاتا ہے۔زبان میں لکنت آجاتی ہے اور آنکھوں میں خون کی سرخی آجاتی ہے۔

PCP کی بُو سرکے (Vinegar) جیسی ہوتی ہے۔اگر آپ کے بچوں کے منہ سے، سانسوں سے یا کپڑوں سے سرکے کی بو آتی ہے تو PCP کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔خصوصاً اگر آپ کے بچے سگریٹ پیتے ہیں اور ان میں مندرجہ بالا علامات پائی جاتی ہیں تو آپ کو اور زیادہ محتاط اور ہشیار رہنا چاہیے۔

ایسٹسی (Ecstacy) آج کل کے بچوں میں خاصی مقبول ہے۔یہ نشہ آور مادہ چند کیمیائی تبدیلیوں کے ساتھ کئی اقسام میں پایا جاتا ہے۔اس کا تعلق Phenethylamine کے نشہ آور کیمیائی خاندان سے ہے۔ان کے کئی نام ہیں، ان کو برف یا کرسٹل کا نام بھی دیا جاتا ہے۔یہ سفید رنگدار پاؤڈر یا گولیوں کی شکل کے علاوہ سیال کی صورت میں بھی دستیاب ہوتی ہیں۔ان کا جائز استعمال دمہ اور کئی دوسری بیماریوں کے لیے ہوتا ہے لیکن ناجائز استعمال کے کئی طریقے ہیں۔ان کو سونگھا جاتا ہے، پیا جاتا ہے یا انجیکٹ لگایا جاتا ہے۔اس کے استعمال سے انسان اپنے آپ میں نہیں رہتا اور اسے نیند نہیں آتی۔پاکستان میں پڑھائی کے شوقین طالبعلم نیند کو بھگانے کے لیے اس کا عام استعمال کرتے ہیں۔اس کے زیر اثر انسان بات بے بات لڑنے مرنے پر تل جاتا ہے اور اسے اپنے پرائے کا خوف نہیں رہتا۔یہ بھی بے بُو اور بے ذائقہ ہیں اس لیے مندرجہ بالا کیفیات سے ہی پتہ چلتا ہے کہ آیا بچہ یہ نشہ استعمال کر رہا ہے یا نہیں۔اگر آپ کے گھر میں کسی کو دمہ کی شکایت ہے اور آپ کے بچے دمہ کی دوا کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں تو آپ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔اگر آپ کا بچہ نیند سے بے پرواہ دن رات پڑھائی میں مصروف رہتا ہے تو بھی آپ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔

اوکسی (Oxy, Oxycodone or oxycotton) آج کل ہائی سکول کے بچوں کا سب سے زیادہ مقبول عام نشہ ہے۔امریکہ کے بچے اسکو اور بیچ کاٹن یا OC, Cotton Candy کے نام سے ایک دوسرے کو ٹیکسٹ کرتے ہیں۔اس کے مقبول عام ہونے کی دلچسپ کئی وجوہات ہیں۔یہ عام طور پر ہر گھر میں موجود رہتی ہے کیونکہ سونے کے لیے یا درد کے لیے ڈاکٹر عموماً یہ دوا لکھ کر دیتے ہیں اس لیے ہر گھر میں والدین یا بزرگ کسی نہ کسی صورت میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔لوگ گولیاں نہیں گنتے اس لیے بچوں کو آسانی سے اور بغیر جیب سے کوئی رقم لگائے یہ نشہ دستیاب ہوتا رہتا ہے۔اگر یہ دوا کھانے کے لیے گولیوں کی صورت میں دستیاب ہوتی ہے لیکن بچے اسے سونگھتے ہیں۔اس کے سونگھنے کا طریقہ کچھ عجیب سا ہے۔بچے اوکسی کی گولیاں قلعی (Aluminum Foil) پر رکھ کر قلعی کو نیچے سے موم بتی کو لو کی آگ دکھاتے ہیں گولی پگھل کر دھواں دیتی ہے اور بچے اس دھوئیں کو Straws کے ذریعے منہ یا ناک سے اپنے جسم

میں ڈال کر نشے کی کیفیت حاصل کرتے ہیں۔

زیادہ تر اچھے اور پڑھے لکھے گھرانوں کے بچے اس نشے میں مبتلا دیکھے گئے ہیں۔ اگر آپ کے بچے ماچس، موم بتی اور قلعی کی جستجو میں رہتے ہیں یا یہ چیزیں ان کی گاڑی یا ان کمرے میں پائی جاتی ہیں اور بچے آپ کی ادویات کی الماری کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں تو آپ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس نشے میں کسی حد تک مبتلا ہیں۔ اگر گھر کا کوئی فرد اوکسی استعمال کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنی گولیاں بھی گننا شروع کر دے۔ آپ اپنی دواؤں کی الماریوں کو ہمیشہ تالا لگا کر رکھیں۔ بلیک مارکیٹ میں اوکسی کی ایک گولی دس ڈالر کی ملتی ہے۔

۲۰۲۰ء میں شائع ہونے والی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق امریکہ میں نشے کا استعمال ۱۹۹۲ء سے اب تک تکنا ہوا ہے۔ ہماری نئی نسل خطرناک کھلونوں سے کھیل رہی ہے اور ہماری اولاد اسی نسل کے ساتھ پروان چڑھ رہی ہے۔ والدین کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ اس زہریلی بلا کے چمٹنے سے پہلے مرحلے میں دخل اندازی کریں۔ ہم جتنی جلدی اس میں مداخلت کریں گے، ہمارے بچوں کے سنبھلنے کا اتنا زیادہ چانس ہے۔ اگر والدین کو ذرا برابر بھی شک ہو کہ اولاد کسی طور پر نشہ آور اشیا کی جانب مائل ہونے لگی ہے تو فوراً کسی ماہر سے رابطہ کریں اور فوراً سے بیشتر بچے کے ہائی سکول کونسلر کے پاس جا کر مزید معلومات حاصل کریں۔ سکول کونسلرز آپ کو نشے کے خلاف مدد حاصل کرنے کے تمام راستے بتائیں گے۔ جتنے لوگوں کو اس میں شامل کر سکتے ہیں کریں۔ بچوں سے اس سلسلے میں بات کرتے ہوئے نہ گھبرائیں۔ بچے زیادہ تر اپنے دوستوں کے کہنے یا دوستی کے دباؤ میں آ کر نشے کی جانب جھکتے ہیں۔ عادت ایک دو دن میں نہیں پڑتی، کثرتِ استعمال سے پڑتی ہے۔ اگر والدین بروقت مداخلت کر کے بچوں کو نہیں سنبھالیں گے تو وہ نشے میں ڈوب کر عادت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ نشے کی عادی بچے اگر زندہ بھی رہیں تو اپنی لیاقت اور ذہانت کھو کر ہمیشہ کے لیے ذہنی طور پر معذور ہو جاتے ہیں یعنی زندہ برابر مردہ ہو جاتے ہیں۔

جب عادت پڑ جائے تو اس کا چھوٹنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل اور مہنگا ہے۔ نشہ چھڑانے والے پرائیویٹ سینٹر Drug Rehab Programs کافی مہنگے ہیں جن کا خرچ تقریباً پانچ ہزار ڈالر روزانہ ہے۔ اس کے لیے امریکی حکومت کی جانب سے علاج کی مفت سہولتیں موجود ہیں جس کے لیے آپ www.DEA.gov پر جا کر مزید معلومات آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔

معزز قارئین! ہمارے بچے اس ملک میں ہمارا مستقبل اور ہمارا سرمایہ ہیں۔ اگر ہم ان کے لیے کچھ نہیں کریں گے تو ہمارا مستقبل اور ہمارے بچوں کا مستقبل نشے میں ڈوب کر ہمیشہ کے لیے غرق ہو جائے گا۔ اپنے بچوں کو ہم سب نے مل کر بُری عادات سے بچا کر بنی نوع انسان کے لیے باعثِ رحمت بنانا ہے۔ اگر ہم اجتماعی طور پر ایک بچے کو بھی نشے کی دلدل سے بچا سکے تو مجھے یقین ہے ہماری زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ میری آپ سے ایک اور درخواست ہے کہ آپ دوسروں کے مسائل پر ہنسنے کی بجائے اور دوسروں کی پگڑی اُچھالنے کی بجائے دوسروں کی سچے دل سے مدد کیجیے اور ان کی بات اپنے تک محدود رکھیے۔ اگر آج نشے کی یہ آگ ہمارے دوست یا ہمارے ہمسائے کے گھر تک پہنچی ہے تو کوئی بعید نہیں کہ کل کلاں یہ آگ ہمارا گھر بھی مسمار کر دے۔ پڑوسی کے گھر سے آگ بجھانے کا اصل مقصد اسے اپنے گھر تک پھیلنے سے روکنا ہوتا ہے۔ میں نے پڑوسیوں کے جلتے ہوئے گھروں پر کھڑے ہو کر ہنسنے والوں کے اپنے گھر بھی جل کر راکھ ہوتے دیکھے ہیں۔

Brown Fox

نامور شاعرہ اور ادیبہ آمنہ عالم کا بنایا گیا جملہ، جس میں اُردو کے تمام حروف تہجی موجود ہیں:

''صاحب! ذرا ژولیدہ سر سفید ڈاڑھی والے ضعیف شخص کا ظرف دیکھیے۔ جج کے غلط فیصلے کے باعث قید کاٹ کر نکلا تو بگڑنے کے بجائے زمین چوم کر بولا:

پاکستان زندہ باد۔''

☆

ممتاز مزاح نگار علی رضا احمد کا تحریر کردہ ایک جملہ، اس جملے میں بھی اُردو کے تمام حروف تہجی موجود ہیں:

''ایک ٹیلے پر واقع مزار خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کے احاطہ صحن میں ذرا سی ژالہ باری چاندی کے ڈھیروں کی مثل بڑے غضب کا نظارہ دیتی ہے''

اس جملے کی تخلیق کے بارے علی رضا احمد لکھتے ہیں کہ ''جب میں نے انگریزی کے لکھاری کا لکھا ہوا ایک چھوٹا مگر عظیم جملہ:

The quick brown fox jumps over the lazy dog

دیکھا تھا تو خواہش تھی کہ ایک ایسا جملہ اُردو کا بھی ہونا چاہیے جس میں اُردو کے تمام حروفِ تہجی سما سکیں، چنانچہ تھوڑی محنت کے بعد میں نے اس منزل کو پالیا۔''

☆

اُردو کے صاحبِ اسلوب شاعر سید عرفان عرفی کا ایسا قطعہ جس میں اُردُو کے تمام حروفِ تہجی شامل ہیں:

نہ ژالہ باری نہ دھوپ پڑتی نہ ٹمٹماتی ہے چاندنی اب
نہ کوئی ساغر نہ آگ برکھا، عجیب طرز فنا چلی اب
جدا حلاوت، خفا ظرافت، ضعیف ہر شوق، ڈر نہ صدمہ
ثمر جو ذکرِ حبیب کا ہے، یہ تجھ کو عرفی ملا سبھی اب

☆

برطانیہ سے جاپان

(سفر.....مشرق بعید کے)

یعقوب نظامی

قسط..... ۵

ویت نامی.....شب وروز

خرم نے ایک دن ہمارے لئے ہوچی منہ سٹی کے مضافات کی سیر بک کروائی۔اُسے علم تھا کہ ابوشہر کی بجائے گاؤں کی زندگی میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مجھے شہر کی نسبت دیہی زندگی میں زیادہ دلچسپی ہے۔میں جب بھی کسی اجنبی ملک میں جاتا ہوں تو اُس کے مضافات کے لئے ضرور وقت نکالتا ہوں اُس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی ملک کی تہذیب وتمدن کو قریب سے دیکھنا ہو تو پھر شہروں کی بجائے گاؤں کا رخ کریں جہاں کی سیدھی سادی زندگی اُس ملک کے کلچر کی صحیح عکاس ہوتی ہے۔شہری زندگی تو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دنیا میں ہر جگہ یکساں ہے لیکن دیہاتی پس منظر کے لوگ اس گئے گزرے دور میں بھی اپنی روایات کے مطابق زندگی گزارنے کی جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔

ہم صبح سویرے اٹھے۔نماز فجر ادا کی ناشتے کے بعد ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اُس مقام پر جا پہنچے جہاں سے سیاحوں کو مختلف مقامات کی سیر کے لئے کوچیں لے جاتی ہیں۔یہ جگہ ہمارے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھی۔پھر بھی آرام اور راستہ بھول نہ جانے کی خاطر ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں گئے۔بسوں کے اڈے پر ایک ہا کر جو انگریزی میں بات چیت کرسکتا تھا نے ہماری بکنگ والے کاغذات دیکھے اور ایک نوجوان کے حوالے کردیا۔یہی ہمارا گائیڈ تھا جس کے ساتھ ہمیں پورے دن سیر کرنی تھی۔

ہماری گاڑی صبح آٹھ بجے چلی تو گائیڈ نے ہمیں خوش آمدید کہتے ہوئے اپنا تعارف کروایا کہ میرا نام من بوئی Min Bui ہے۔میں آج آپ کو مختلف جگہوں کی سیر کرواتے ہوئے سب سے پہلے دریا میکانگ Mekong لے جاؤں گا جہاں کشتیوں پر دریا کی سیر کے بعد دوپہر کا کھانا دریا کنارے ایک باغ میں کھائیں گے۔کھانے کے بعد ہم ایک گاؤں میں جائیں گے تاکہ آپ ویت نام کی دیہی زندگی کو بھی قریب سے دیکھ سکیں۔

گاڑی جب بڑی شاہراہ پر پہنچی تو گائیڈ نے بتایا کہ ہم اس وقت ہوچی منہ سٹی کے دل میں ہیں۔یہ وہی شہر ہے جو جنگ ویت نام سے پہلے سائیگون کے نام سے دنیا بھر میں مشہور اور جنوبی ویت نام کا صدر مقام تھا۔جنگ میں امریکی فوجیں اسی شہر میں اُتریں تھیں۔بظاہر ویت نام کی جنگ ملک کے جنوبی اور شمالی کے درمیان تھی لیکن عملی لحاظ سے شمال کی پشت پر چین اور روس جبکہ جنوب میں امریکہ تھا۔شمالی علاقہ کی قیادت ہوچی منہ کے ہاتھ تھی۔جس نے جنگ میں فتح حاصل کی اور امریکہ کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔فتح کے بعد سائیگون کا نام عوام نے اپنے محبوب لیڈر ہوچی منہ کے نام پر رکھا اور آج دنیا میں اسی نام سے مشہور ہے۔

ہوچی منہ سٹی کی آبادی اسّی لاکھ ہے۔شہر 19 ڈسٹرکٹ میں تقسیم ہے۔لیکن شہر سے ملحقہ پانچ قصبات کو بھی شہر کے ساتھ شامل کرکے کل 24 ڈسٹرکٹ بنا دیئے گئے ہیں۔آپ کو یہ جان کر حیرانگی ہوگی کہ اسّی لاکھ کی آبادی والے شہر میں 75 لاکھ موٹر سائیکل ہیں۔اس بات میں مجھے کوئی صداقت نظر نہیں آئی چونکہ اسی لاکھ کی آبادی میں بچے بھی شامل ہیں۔ایسے میں گائیڈ نے وضاحت کی کہ ہوچی منہ سٹی کے گردونواح کے قصبات اور ٹاؤن سے بھی لوگ تلاش روزگار اور محنت مزدوری کے لئے صبح سویر موٹر سائیکل پر اس شہر میں آجاتے ہیں۔ایسے میں سرکاری ریکارڈ کے مطابق 75 لاکھ موٹر سائیکل والی بات درست ہے۔بس یہی سمجھئے کہ یہ ہماری قومی سواری ہے۔آپ کو سڑکوں پر گاڑیوں کی بجائے سکوٹر فرّاٹے بھرتے نظر آتے ہیں۔

ہوچی منہ سٹی سے جوں ہی باہر نکلے تو سرسبز کھیت جن میں کام کرتے دہقان نظر آنا شروع ہوئے۔کوئی ہل چلا رہا تھا تو کوئی زور بازو سے زمین کھودنے میں مصروف تھا۔مردوں کے شانہ بشانہ عورتیں بھی کام میں مصروف تھیں۔کھیتوں میں چاول کی فصل لہلہا رہی تھی۔علاقہ میدانی کھیتوں سے تھوڑا ہٹ کر ان کے گاؤں بھی تھے۔اس ملک میں بارشیں بہت زیادہ ہوتی ہیں جس کی وجہ سے مکانوں کے چھت ہموار کی بجائے ڈھلوان ہوتے ہیں تاکہ بارش کا پانی چھت پر کھڑا ہونے کی بجائے نیچے بہہ جائے۔بارش کی بدولت پانی کی بہتات ہے۔چاول اُگانے کے لئے پانی کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس ملک میں چاول بہت زیادہ پیدا ہوتے ہیں۔میں نے ہر طرف چاولوں کے کھیت دیکھے۔

دریائے میکانگ

اہل ویت نام دریائے میکانگ کو پانی کی ماں کہتے ہیں۔مختلف شاہراہوں، دیہاتوں اور قصبات میں سے سفر کرتے ہوئے ہماری گاڑی دریا میکانگ Mekong کے کنارے جا کھڑی ہوئی۔پہلی نظر میں یہ دریا کی بجائے سمندر نظر آیا۔

دریا کا پانی سرخ اور گھاٹ انتہائی بڑا جسے دیکھ کر انسان پر ایک دہشت طاری ہوجاتی ہے۔دریا کنارے ہمیں ایک قہوہ خانہ میں چائے پلائی گئی۔اور پھر ایک جہاز نما بہت بڑی کشتی میں سوار کرکے دریا کی سیر کا آغاز ہوا۔کشتی جس طرف سے دریا بہہ کر آرہا تھا اُس رخ گئی۔یہ ایک خوفناک منظر تھا۔سیاح سہمے ہوئے تھے۔چونکہ کسی قسم کے حادثے کی صورت میں حفاظتی انتظامات نہ ہونے کے برابر تھے۔سیاحوں کا خوف کم کرنے کے لئے گائیڈ نے ہمیں اس دریا کے بارے میں بتانا شروع کردیا کہ یہ اس خطے کا سب سے بڑا دریا ہے۔جو تبت کے پہاڑوں سے بہتا ہوا چین کے صوبہ یونان Yunan سے گزرتا ہوا، میانمار، لاؤس اور تھائی لینڈ کی پیاسی زمین کو سینچتا کمبوڈیا میں داخل ہوتا ہے۔جہاں کی

مقامی ضروریات پوری کرتے ہوئے آخر میں یہ ویت نام میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں سمندر میں شامل ہونے سے پہلے اس کا پاٹ بہت ہی چوڑا ہو جاتا ہے۔اس طرح یہ ڈیلٹا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یوں ہی سفر کرتے ہوئے یہ دریا سمندر میں مل کر اپنی ہستی کو ختم کر دیتا ہے۔

تبت کے پہاڑوں سے جب یہ دریا جنم لیتا ہے تب اس کا پانی شفاف ہوتا ہے۔لیکن جوں جوں یہ پہاڑوں سے اُتر کر میدانی علاقہ میں داخل ہوتا ہے تو مقامی مٹی اس میں ملنا شروع ہو جاتی ہے جس سے دریا کی رنگت مٹی کی مانند ہو جاتی ہے۔ پانی سے زندگی وابستہ ہے اور یہ دریا اس خطہ کے لوگوں کو زندگی بخشتا ہے۔دریائے میکانگ کی بدولت ویت نام کے کھیت ہرے بھرے ہیں۔

کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ اس میں انسانی غذا کے لئے کئی اقسام کی مچھلیاں ہیں ۔ چنانچہ اپنی جنم نگری تبت سے لے کر سمندر تک پہنچتے پہنچتے یہ دریا ساڑھے تین ہزار میل کا سفر طے کرتا ہے۔ راستے میں جو بستیاں، قصبے اور شہر آباد ہیں اُن کی غذائی قلت بھی یہ دریا پوری کرتا ہے۔اس طرح سفر کرتے کرتے سمندر میں مل جاتا ہے۔جس طرح ماں بچوں کو کھانا دیتی ہے بالکل یہی کام یہ دریا انجام دیتا ہے۔اسی لئے اہل دانش نے اسے میکانگ یعنی ''پانی کی ماں'' کا نام دیا ہے۔

ہم ایک گھنٹہ تک سمندر نما اس دریا میں کشتی پر سیر کرتے اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔بعض جگہوں پر دریا میں مچھلیاں اچھل اچھل کر دریا سے باہر کے نظارے کر رہی تھیں ۔انھیں دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے مچھلیاں سیّاحوں کا دیدار اور انھیں خوش آمدید کہہ رہی ہیں۔

ہم کشتی سے اُتر کر دریا کنارے ایک باغ میں داخل ہوئے جہاں رنگ برنگے پھولوں بھرے باغات اور رس بھرے پھلوں سے لدے درختوں نے سیّاحوں کا استقبال کیا تو ہنستے مسکراتے چہرے دیکھ کر دریا کی دہشت غائب اور اُس کی جگہ ایک مسرور کن ماحول پا کر سیّاح چہکنے لگے۔

ہمارے گروپ کی اکثریت چینی سیّاحوں پر مشتمل تھی۔ ایک دو امریکی بھی تھے جو خوف کی وجہ سے اپنی شناخت کروانے سے گھبراتے تھے.....اُس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ان کے بزرگوں نے اس قوم کے بچوں کو قتل کیا تھا۔

گھومتے پھرتے ہم باغ کے درمیان پہنچے جہاں کھلی فضاؤں میں ایک ریسٹورنٹ تھا۔ جہاں ہمیں دوپہر کا کھانا کھلایا گیا۔ہم ریسٹورنٹ میں ایک میز کے کنارے بیٹھے تو دریائے میکانگ سے پکڑی ہوئی تازہ مچھلیوں کو پکا کر ہمارے سامنے سجا دیا گیا۔مچھلی کے ساتھ ساتھ مقامی سبزیوں پر مشتمل سلاد اور اسی باغ سے توڑے گئے تازہ پھل بھی پیش کیے گئے۔سیّاح غالباً صبح سے بھوکے تھے سب ہی کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ ہم بھی کھاتے اور ساتھ ساتھ ماحول سے لطف اٹھاتے رہے۔کھانا کھایا تو مزہ آ گیا۔

کھانے کے بعد ہمیں چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر بیٹھایا گیا جن پر تین آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ان کشتیوں کو کشتی بان اپنے روایتی انداز میں لمبے بانس کو پانی میں ٹیک لگا کر زور لگاتا تو کشتی چل پڑتی۔

یہ کشتیاں دریا میں نہیں بلکہ دریا سے نکالی گئی چھوٹی چھوٹی نہروں میں چلتی تھیں۔ان نہروں کے دونوں کناروں پر گھنے درخت جن کی شاخیں ایک دوسرے سے مل کر ایک قوس نما سائے دار چھت بنا رہی تھیں۔ ہم اس دل کش ماحول کے درمیان کشتی پر سوار تھے۔اس ملک میں بارشیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ بارش سے بچنے کی خاطر لوگ بڑے بڑے کناروں والے ہیٹ پہنتے ہیں۔ جو اس ملک کے روایتی ہیٹ کہلاتے ہیں۔ہمیں بھی ہیٹ دیئے گئے تا کہ ہم مقامی تہذیب و تمدن کا حصہ بن کر جہاں لطف اٹھائیں وہاں انھیں پہن کر یادگاری تصاویر بھی بنوائیں۔

ویت نام کی دیہی زندگی

نہر میں کشتی رانی کے بعد ہمیں تانگوں میں سوار کر کے ایک گاؤں میں پہنچایا گیا۔گاؤں میں پہنچتے ہی مرغوں کی اذانوں نے ہمارا استقبال کیا۔میں نے غور سے دیکھا دیسی مرغ کلغیاں اور پر پھیلا کر بلند آواز میں بانگیں دے رہے تھے۔اردو گرد مرغیوں کی غٹرغوں بالکل اپنے دیس کے دیہاتوں کا منظر تھا۔ہم ایک گھر میں گئے جس کا صحن کچا تھا۔ جہاں کھلی فضاؤں میں مرغیاں اور مرغے چگتے نظر آئے تو قریب ہی ایک طرف بھینس اور تھوڑا آگے ایک بیل کلّے کے ساتھ باندھا تھا۔صحن کے ایک کونے میں مٹی کا چولہا تھا۔ چولہے پر ایک بڑھیا کھانا پکانے میں مصروف تھی۔

گھر کے آنگن میں موجود بچے سیّاحوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ایک تنور بھی تھا جہاں گھر کے صحن کی حد ختم ہوتی تھی وہاں کیلے کے درخت پھل سے لدے ہوئے تھے۔دوسری طرف کدو، کریلے اور اس طرح کی ترکاریوں کی بیلیں بڑھتے بڑھتے چھت تک پہنچ گئی تھیں۔ان کے ساتھ کدو، اور کریلے لٹک رہے تھے جنھیں امریکی سیّاح غور سے دیکھ اور اُن کی تصاویر اُتارنے میں مصروف ہو گئے۔مکانوں کے چھت ڈھلوان جن پر گھاس پھوس ڈال کر اوپر سے مٹی کا لیپ جبکہ قدرے آسودہ حال لوگوں نے ٹین کا استعمال کیا ہوا تھا۔پختہ گھروں کے صحن بھی پختہ اور کچن علیحدہ تھے۔

دیہاتی لوگ چاول اور سبزیوں پر مشتمل کھانا کھاتے ہیں۔مچھلی کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ ویت نام کے دیہاتوں اور شہروں میں پھیری والے بھی جگہ جگہ نظر آتے رہے۔ یہ لوگ ترازو کی مانند دو بڑی بڑی ٹوکریوں میں اشیاء ڈال کر ایک ڈنڈے سے اُنھیں باندھ کر کندھے پر اٹھا لیتے ہیں اور پھر گلی گلی گھوم کر چیزیں فروخت کرتے ہیں۔انھوں نے سروں پر روایتی بڑے بڑے ہیٹ نما کیپ بھی پہنے ہوئے تھے۔اس طرح کی ٹوپیاں کسان بھی پہن کر زمینوں میں کام کرتے نظر آتے رہے۔

خاندانی نظام

گائیڈ نے بتایا کہ ویت نام میں خاندانی نظام کافی مضبوط ہے۔ یہ اپنے بزرگوں کا بہت خیال اور اُن کا احترام کرتے ہیں۔ ویت نام میں ایک ہی چھت تلے دو تین نسلیں آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہیں۔ایک دوسرے سے

ہمدردی کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔

عربوں کی طرح خاندان اور قبائل ہی ان کی پہچان ہے۔ یہ لوگ اپنے ناموں کے ساتھ خاندانی نام کا اضافہ کرتے ہیں تا کہ یہ معلوم ہوجائے کہ اس کا تعلق کس قبیلہ سے ہے۔ مثال کے طور پر ڈانگ Dang، چیو Chau، لی Le یہ سب مختلف قبائل کے نام ہیں۔ اور ویتنام کی اکثریت کا تعلق ان ہی قبائل سے ہے لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود ان کے ہاں قبائلی نظام نہیں ہے۔ دوسرے ایشیائی ممالک کی طرح ویت نام میں بھی نامور لوگوں کی مناسبت سے شہروں، ٹاون، قصبات اور گاؤں کے نام رکھے جاتے ہیں۔

ہوچی منہ شہر ہے جس کا قدیمی نام سائیگون تھا لیکن جب اہل ویت نام نے جنگ جیتی تو پھر انھوں نے شہر کا نام تبدیل کر کے اپنے قومی ہیرو ہوچی منہ کے نام پر اس شہر کا نام ہوچی منہ رکھ دیا۔ جس طرح ہمارے ہاں:

قادر آباد/مظفر آباد/فیصل آباد

یعنی وہ گاؤں یا قصبہ جسے قادر یا مظفر نامی کسی صاحب نے آباد کیا تھا یا پھر کسی نامور مسلمان کے نام پر شہروں کے نام رکھے ہوئے بالکل اسی طرح ویت نام میں بھی ڈنگ سا Dang Xa نام کے گاؤں ہیں یعنی وہ گاؤں جسے ڈنگ نے آباد کیا تھا۔

قبرستان اور ماتمی رسومات

ہم گاؤں میں گھومتے گھومتے آخری کنارے پہنچے تو دیکھا وہاں قبرستان تھا۔ مجھے تجسس ہوا تو اندر جا کر دیکھا اہل ویت نام بھی ہماری طرح اپنے پیاروں کو قبروں میں دفن کرتے ہیں۔ کچھ قبریں کچی اور کچھ پختہ تھیں۔ جن سے اہل قبور کی سماجی حیثیت کا پتہ چلتا تھا۔ قبرستان کے درمیان میں ایک چبوترے پر ایک مقبرہ نما قبر تھی۔ ممکن ہے کہ گاؤں کے کسی بڑے صاحب حیثیت آدمی کی ہو یا پھر کسی مذہبی رہنما کی۔ لیکن ان لوگوں کی ستر فیصد سے زیادہ آبادی کسی بھی مذہب کو تسلیم نہیں کرتی..... یعنی یہ بے دین لوگ ہیں۔ جو کسی مذہب کو مانتے ہیں اُن میں بدھ مت کے پیروکار سب سے زیادہ ہیں۔ اس کے بعد عیسائی ہیں۔ کچھ جین مت کے ماننے والے بھی ہیں۔

ویت نام میں مسلمان ہیں لیکن اُن کا تناسب بہت کم ہے۔ قبریں دیکھ کر مجھے مزید تجسس ہوا ورنہ میں سمجھتا تھا کہ ہندوازم کو ماننے والوں کی طرح یہ بھی اپنے مُردوں کو جلاتے ہونگے۔ یہی سوچتے ہوئے میں قبرستان میں گھوم رہا تھا کہ ایک مقامی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ جو انگریزی میں اچھی طرح بات چیت کر سکتا تھا۔ میں نے اُس کے سامنے اپنے دل میں اٹھنے والے سوال رکھ دیئے کہ اگر ممکن ہو تو مجھے کچھ معلومات دیجئے کہ آپ اپنے مُردوں کی آخری رسومات کس طرح ادا کرتے ہوں۔ میرے سوالوں کے جواب اُس نے جو دیئے اُس کے مطابق ان کی بہت سی رسومات ہم سے ملتی جلتی ہیں۔ اہل ویت نام کی خواہش ہوتی ہے کہ اُن کی زندگی کی آخری سانسیں اپنے گھر کے آنگن میں نکلیں۔ اگر کوئی گھر سے باہر فوت ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ مرنے والا بدقسمت تھا جسے اپنا گھر بھی نصیب نہیں ہوا۔

ہسپتالوں میں زیر علاج ایسے مریض جن کی زندگی کے بارے میں ڈاکٹر مایوس ہوجاتے ہیں اُن کے وارث انھیں فوری ہسپتال سے گھر پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں تا کہ اس کی موت گھر میں ہو۔ جب روح جسم سے پرواز کر جاتی ہے تو پھر میت کا منہ رومال سے ڈھانپ دیا جاتا ہے جس کا مطلب ہے کہ اب یہ زندہ نہیں۔ مرنے کے بعد میت کو غسل اور نئے کپڑے پہنا کر ایک بکس میں ڈال کر زمین پر رکھ دیا جاتا ہے جس کا مطلب ہے کہ انسان نے آخر خاک در خاک ہونا ہے۔ پھر ماتم کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ رشتہ دار دوست و احباب آتے ہیں۔ جن کی خاطر مدارت کے لئے اچھے اچھے کھانے تیار کیے جاتے ہیں۔

زمانہ قدیم میں تو یہ سلسلہ ہفتوں جاری رہتا تھا لیکن اب وقت بدلا تو حالات بھی بدلے ایسے میں میت کو ایک جلوس کی شکل میں قبرستان پہنچایا جاتا ہے۔ کچھ قبائل ڈھول باجے کے ساتھ میت کو قبرستان پہنچاتے ہیں۔ جب میت کو دفن کیا جاتا ہے تب ڈرامائی انداز میں اس کا بڑا بیٹا یا بیٹی یا کوئی اور عزیز رشتہ دار روتے ہوئے انھیں ایسا کرنے سے روکتے ہیں۔ لیکن وہاں موجود لوگ اُسے تسلی دیکر خاموش کر کے میت دفن کر دیتے ہیں۔ میت کو دفن کرنے کے تین دن بعد قبر پر جا کر نیاز دی جاتی ہے۔ قبر پر جانے کا سلسلہ 49 دن تک جاری رہتا ہے اور ساتھ ساتھ غریبوں کو کھانا کھلانے کا سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس میں وقفہ کیا جاتا ہے اور آخری رسم سودن کے بعد کر کے ماتم ختم کر دیا جاتا ہے۔

زمانہ قدیم میں امیر لوگوں کے ساتھ قیمتی اشیاء بھی دفن کی جاتی تھی۔ ایسے میں انھیں قبرستان کی بجائے گھر کے باغ میں دفن کیا جاتا تھا تا کہ قیمتی اشیاء چوروں کی دسترس سے محفوظ رہیں۔ ویت نام میں ماتم کی رسم سب سے مہنگی ہوتی ہے۔ ماتم کی وجہ سے بہت سے لوگ مقروض ہوجاتے ہیں۔ پھر اپنی توفیق کے مطابق قبر کو پختہ بھی کرتے ہیں اور جو صاحب حیثیت نہیں اُن کی قبریں کچی ہوتی ہیں۔

بالکل ملکہ نور جہاں کے مزار پر کندہ اس شعر کی مانند:

بر مزار ما غریباں نی چراغے نی گلے
نی پر پروانہ سوزد، نی صدائے بلبلے

(مجھ غریب کے مزار پر نہ تو چراغاں جلتا ہے اور نہ پھول کھلتے ہیں۔ چراغ نہ جلنے کی وجہ سے پروانوں کے پر بھی نہیں جلتے اور نہ بلبل کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔)

''دوسری شادی''

فیروز خان نون کی پہلی بیوی بیگم نون کے نام سے موسوم تھیں۔ جب فیروز خان نون نے دوسری شادی کر لی تو ان کی ایک شناسا نے مولانا سالک سے بطور مشورہ پوچھا:

''اب دوسری بیوی کو کیا کہا جائے گا؟''

مولانا نے بے ساختہ جواب دیا

''آفٹر نون''

ڈیوڈ میتھیوز

اشفاق حسین
(کینیڈا)

لندن جسے برصغیر پاک و ہند سے باہر اردو کا دوسرا بڑا مرکز کہا جاتا ہے، اس کی رونق میں پروفیسر رالف رسل کے بعد بلاشبہ پروفیسر ڈیوڈ میتھوز کا نام آتا ہے۔ اردو زبان کے حوالے سے ان کے کام کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ان کی غیر موجودگی سے اس شہر میں اردو کی ایک بڑی شان دار روایت کا چراغ گل ہو گیا ہے۔

ہمارے یہاں مستشرقین کے بارے میں ہمیشہ سے ایک کشش سی رہی ہے۔ جس قدر انہیں ہمارے بارے میں جاننے کی جستجو ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ ہمیں ان غیر زبان کے لوگوں کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ پروفیسر ڈیوڈ میتھوز کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔

آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کی بات ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور و معروف ڈاوننگ کالج کے باہر ایک نوجوان انگریز طالب علم نے اپنی سگریٹ سلگائی اور انگلستان کی مسلسل اور تھکا دینے والی بارش سے بچنے کے لیے خود کو ذرا سا سائبان کے نیچے کر لیا۔ اسی اثنا میں ایک اور طالب علم، جو اپنی شکل اور وضع قطع سے جنوبی ایشیا کا رہنے والا معلوم ہوتا تھا، اس کے نزدیک آ کر کھڑا ہو گیا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب دو سگریٹ پینے والے کھلی فضاء میں سگریٹ کے کش لگاتے ہیں تو بل کھاتے ہوئے دھوئیں کے درمیان نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔

عموماً موسم کے بارے میں ایک آدھ جملے یا سیاست کے بارے میں ایک آدھ فقرے کا تبادلہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ان دونوں طالب علموں نے بھی ایک دوسرے کو دیکھا لیکن موسم یا سیاست کے موضوع پر بات کرنے کے بجائے انگریز طالب علم نے پہل کرتے ہوئے دوسرے طالب علم سے پوچھا کہ جناب کیا آپ کو عربی زبان آتی ہے؟ ''جی ہاں تھوڑی بہت آتی تو ہے'' یہ تھا اس طالب علم کا مختصر سا جواب جو ان دنوں حصول تعلیم کی غرض سے، ڈاوننگ کالج کے عربی کے شعبہ سے وابستہ تھا۔ سوال کرنے والے اس انگریز طالب علم ڈیوڈ میتھوز کو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شخص کسی عرب ملک کا نہیں بلکہ پاکستان کے صوبہ سندھ کا رہنے والا تھا اور جو عربی اور فارسی اسے آتی تھی، اس کا تعلق جدید عربی اور فارسی سے نہیں بلکہ پاک و ہند کے مدارس میں پڑھائی جانے والی قدیم عربی اور فارسی سے تھا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض چھوٹے چھوٹے واقعات انسان کی زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں، اسی طرح اس چھوٹی سی ملاقات نے بھی ڈیوڈ کی بقیہ زندگی کا رخ بدل دیا اور انہیں ایک نئے راستے پر گام زن کر دیا۔ ڈیوڈ کی زندگی میں اس اولین مکالمے کی بڑی اہمیت ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے ڈیوڈ کے لیے مختلف زبانوں کے ہرے بھرے گلستاں میں ایک ایسی کھڑکی کھلنے جا رہی تھی، جہاں سے اردو زبان و ادب کی تازہ اور معطر فضاء کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔

اس واقعے کا پس منظر یہ ہے کہ اس سے قبل اردو ہی کیا بلکہ ڈیوڈ کا جنوبی ایشیا کی کسی بھی زبان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے اسکول کے زمانے میں فرانسیسی، یونانی اور لاطینی زبانوں کو بنیادی مضمون کے طور پر پڑھا تھا۔ لندن یونیورسٹی سے انہوں نے قدیم اور جدید زبانوں کے تقابلی مطالعے میں امتیازی نمبروں سے آنرز کی ڈگری لی اور پھر کیمبرج یونیورسٹی میں کلاسیکل یونانی اور قدیم مشرقی زبانوں کے باہمی تعلق کے بارے میں مزید تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

اس علمی سفر میں انہیں بہت سے قدیم مخطوطات کا مطالعہ بھی کرنا تھا اور اس کے لیے سامی زبانوں میں سے کسی ایک زبان سے واقفیت بہت ضروری تھی۔ چنانچہ اس حوالے سے وہ عربی زبان کے مطالعے کی طرف آئے اور اسی ضرورت نے انہیں اس پاکستانی طالب علم کے قریب کر دیا جس کی عربی اور فارسی سے وہ کم از کم اس وقت تک بے حد مرعوب اور متاثر تھے۔

ان ہی دنوں اسکول آف اورنٹیل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے لسانیات اور صوتیات کے شعبے میں لیکچرر کی ایک اسامی خالی ہوئی جس کے لیے جنوبی ایشیا کی کسی ایک زبان سے واقفیت اضافی قابلیت کے ذیل میں آتی تھی۔ ہر چند کہ ڈیوڈ کسی جنوبی ایشیائی زبان سے واقف نہیں تھے لیکن اخبار میں یہ اشتہار دیکھ کر انہیں ایک لمحے کو خیال آیا کہ کیوں نہ وہ بھی اس ملازمت کے لیے قسمت آزمائی کریں۔ علم لسانیات اور صوتیات کے حوالے سے تو وہ اس عہدے کے پوری طرح حق دار تھے ہی مگر اضافی قابلیت والا مسئلہ کیسے حل کیا جائے؟

یہ ایک بہت بڑا سوال تھا۔ یہاں پر انہوں نے اپنے اسی دوست سے برصغیر کی زبانوں کے بارے میں کچھ ابتدائی معلومات حاصل کیں اور انٹرویو دینے چلے گئے۔ وہاں ان کے موضوع پر سوالات کے بعد انٹرویو لینے والی پروفیسر نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کسی جنوبی ایشیائی زبان سے بھی واقف ہیں تو ڈیوڈ نے ایک رباعی جو انہوں نے اپنے پاکستانی دوست سے سیکھی تھی، اسے مکمل اعتماد کے ساتھ پڑھ کر سنا دی۔ خاتون نے کہا آپ کو تو بہت اچھی اردو آتی ہے۔

ڈیوڈ کی قسمت نے ان کا ساتھ دیا چونکہ وہاں اور کوئی ان سے بہتر امیدوار موجود نہ تھا لہٰذا ان کی ڈگریوں اور بنیادی قابلیت کی بناء پر لندن یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات میں ان کا تقرر ہو گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈیوڈ نے جو رباعی اپنے انٹرویو کے دوران سنائی تھی اس کا دور دور تک اردو زبان سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ رباعی عمر خیام کی تھی۔ بس یہی سمجھئے کہ

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار لکھنؤ میں مجاز سیمینار اور مشاعرے کا انعقاد ہوا تھا۔ باہر سے آنے والے تمام لوگ جن میں برطانیہ سے پروفیسر ڈیوڈ میتھیوز،

افتخار عارف صاحب اور کینیڈا سے میں بھی شامل تھا۔ ہم سب لوگوں کو دہلی سے لکھنؤ بذریعہ ریل سفر کرنا تھا۔ دہلی سے ہمارے ساتھ سفر کرنے والوں میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر شارب ردولوی بھی تھے۔ یہ سفر رات بھر کا تھا اور اس سارے راستے جہاں اور بہت سی باتیں ہوئیں وہیں افتخار عارف صاحب کی فرمائش پر خاص طور سے ڈیوڈ سے عمر خیام کی یہ رباعی بھی سنی گئی۔

درس و تدریس کی پیغمبری ملنے کا یہ واقعہ 1965ء کا ہے لیکن اس کے صرف ایک سال کے بعد ڈیوڈ کا تبادلہ لندن یونیورسٹی کے پاکستان، ہندوستان اور سیلون کے شعبے میں ہوگیا۔ اور یہاں سے ڈیوڈ کے اس سفر عشق کا باقاعدہ آغاز ہوا جسے دنیا اردو زبان کے نام سے جانتی ہے۔ انہوں نے نہایت سنجیدگی اور مسلسل محنت سے اردو زبان وادب اور اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا اور اس زبان کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں اپنی بھرپور صلاحیتوں کا استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی اردو کے حوالے سے کوئی عالمی اجتماع ہوتا تھا، وہاں پروفیسر ڈیوڈ میتھوز کے افکار و خیالات جاننے کے لیے انہیں ضرور مدعو کیا جاتا تھا۔

کہتے ہیں کسی زبان کا مطالعہ صرف کتابوں کے ذریعے بھی کیا جاسکتا ہے لیکن اس زبان کے بولنے والوں کے درمیان گھل مل کر جو زبان و بیان کی باریکیاں سمجھ میں آسکتی ہیں وہ خالی مطالعے سے نہیں آسکتیں۔ ڈیوڈ نے بھی لندن کی تعلیمی فضاء کو ایک سال کے لیے خیر باد کہا اور 1968ء اور 1969ء کے دوران پاکستان اور ہندوستان کے سفر پر چل پڑے۔ کراچی، لاہور، دہلی، لکھنؤ اور بمبئی کے گلی کوچوں سے آشنائی حاصل کی۔ دوسری بار 1973ء میں جب وہ کراچی آئے تو میں ان دنوں کراچی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا اور وہیں پروفیسر جمیل اختر خان صاحب کی معرفت میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔

بہت عرصے کے بعد جب میں نے لندن میں ان سے اس ملاقات کا ذکر کیا تو انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ جی ہاں پروفیسر جمیل اختر خان صاحب سے میرے بہت ہی قریبی تعلقات تھے۔ ڈیوڈ نے بتایا کہ جب وہ کراچی یونیورسٹی پہنچے تو صدر شعبۂ اردو نے اپنے شعبہ کے ایک نوجوان استاد سے ان کا تعارف کروایا اور کہا کہ جب تک تم کراچی یونیورسٹی میں ہو یہ تمہاری مکمل رہنمائی کریں گے۔ ڈیوڈ دوسری صبح، خوش خوش، ان سے ملنے کے لیے شعبہ اردو میں پہنچ گئے تاکہ وہ پروفیسر صاحب سے ملاقات کرکے اپنا آئندہ لائحہ عمل طے کرلیں۔

وہاں کئی گھنٹے انتظار کرنے کے بعد جب ان کے استاد آئے تو کہنے لگے کہ آج وہ کسی کو نہیں پڑھائیں گے۔ دوسرے دن تو وہ شعبے میں بالکل ہی نہیں آئے۔ تیسرے دن ڈیوڈ نے نہایت سعادت مندی سے کہا کہ جناب میں آپ کا بہت دیر سے انتظار کر رہا ہوں۔ جمیل صاحب نے بغیر کسی جھجک کے جواب دیا کہ وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر مجھے افسوس ہے کہ میں آج بھی آپ کو نہیں پڑھا سکوں گا کیوں کہ مجھے کہیں اور جانا ہے۔ بے چارے ڈیوڈ جو انگلستان کے نظم وضبط کے ماحول میں پلے بڑھے تھے اس مشرقی طرز ادا پر خاصے حیران ہوئے اور ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

ان کی حیرانی کو دیکھتے ہوئے پروفیسر موصوف نے کہا کہ آخر آپ اتنے پریشان کیوں ہوگئے ہیں؟ انہوں نے نہایت معصومیت سے جواب دیا ''میں چاہتا ہوں کہ مجھے اردو زبان اچھی طرح سے آجائے اور اس سلسلے میں مجھے آپ کی مدد چاہیے''۔ انہوں نے ڈیوڈ سے مسکراتے ہوئے کہا کہ میاں اگر زبان ہی سیکھنی ہے تو چلو تم بھی میرے ساتھ جیمز ہوٹل چلو، وہاں بہت سے دوستوں سے ملاقات ہوجائے گی اور وہیں گپ شپ کے دوران تمہیں زبان بھی اچھی طرح سے آجائے گی۔

نوجوان ڈیوڈ کو اس بات پر حیرانی تو بہت ہوئی لیکن ان کے لیے اس دوستانہ آفر میں دل کشی کا بہت سا سامان بھی پوشیدہ تھا سو انہوں نے دل ہی دل میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس سے اچھی اور کیا بات ہوسکتی تھی کہ چائے خانوں میں وقت بھی گزارا جائے، لوگوں سے گپ شپ بھی کی جائے اور یونیورسٹی کے ریکارڈ میں حاضری بھی لگتی رہے، یعنی رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی والا معاملہ تھا۔ ویسے کچھ ہی دنوں بعد ڈیوڈ اور جمیل صاحب کے آپس میں دوستانہ مراسم ہوگئے اور پھر ڈیوڈ نے ان کے گھر ہی بسیرا کرلیا اور زبان کے رموز سے گھریلو ماحول میں آشنائی حاصل کی۔

آج میں یہ سوچتا ہوں کہ وہ بیسویں صدی کا زمانہ تھا، اگر ڈیوڈ میتھوز جان عالم کے لکھنؤ میں پیدا ہوئے ہوتے تو یہ کام کسی امراؤ جان ادا کے کوٹھے پر اور زیادہ بہتر طور پر انجام دیا جاسکتا تھا۔ لیکن جب میں انہیں صاف شستہ اور بامحاورہ اردو بولتے، لکھتے اور پڑھتے ہوئے دیکھتا تھا تو مجھے یقین ہونے لگتا تھا کہ کسی زبان کا اصل علم صرف یونیورسٹی اور کالج کے بند کمروں ہی میں نہیں بلکہ اس کو حاصل کرنے کے لیے در در کی خاک بھی چھاننی پڑتی ہے اور پھر بقول ڈیوڈ انہوں نے تو اردو زبان سے محبت کی خاطر در در کی خاک ہی نہیں چھانی ہے بلکہ گھاٹ گھاٹ کا پانی بھی تو پیا ہے۔

در در کی خاک چھاننے کے حوالے سے مجھے ڈیوڈ کے سنائے ہوئے دو دلچسپ واقعات بھی یاد آرہے ہیں۔ ایک بار وہ لندن میں اپنے ایک انگریز دوست کے ساتھ سینما ہال کے باہر کھڑے ہوئے تھے اور پان کی گلوری ان کے منہ میں تھی۔ قریب کھڑے ہوئے دو ایشیائی لڑکوں نے کہا ''ابے یار! یہ گورا تو سالا پان بھی کھا رہا ہے'' کوئی اور ہوتا تو شاید طیش میں آجاتا مگر ڈیوڈ نے بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا کہ ''ابے یہ گورا صرف پان ہی نہیں کھاتا بلکہ زبان بھی تمہاری ہی طرح بولتا ہے''۔

یہ سن کر ان لڑکوں پر تو جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ صاف اور شستہ اردو بولنے کا ایک اور دلچسپ واقعہ لاہور میں بادشاہی مسجد کے سامنے پیش آیا۔ ڈیوڈ ایک اردو کانفرنس میں لاہور گئے ہوئے تھے جہاں جاپان سے آئے ہوئے ایک اور مہمان کے ساتھ شہر کی سیر میں مصروف تھے۔ ڈیوڈ کو جاپانی بالکل نہیں آتی تھی اور جاپانی پروفیسر کو انگریزی میں بہت زیادہ مہارت نہ تھی لہٰذا دونوں آپس میں اردو ہی میں بات کر رہے تھے۔ ایک سیدھے سادھے لاہوریے نے بڑی معصومیت کے ساتھ پوچھا کہ آپ ایک انگریز ہیں اور دوسرا جاپانی ہے تو پھر آپ لوگ آپس میں اردو میں کیوں بات کر رہے ہیں۔ ڈیوڈ نے اصل بات بتائی تو اس نے بڑے

فخر سے کہا ''اچھا اب میں سمجھا اردو واقعی ایک بین الاقوامی زبان ہے''۔

زبانوں کی بین الاقوامی برادری میں غیر اہل زبان کا ہمیشہ سے ایک خاص کردار رہا ہے اور اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے ڈیوڈ نے بھی اس کردار کو بہت خوبی، محنت اور جاں فشانی سے نبھایا، جس کا اندازہ ان کے علمی مضامین اور کتابوں کی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اردو کی کلاسیکی اور جدید تخلیقات کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھا اور ان پر اپنی مکمل رائے قائم کی ہے۔ یہ کام بغیر محنت، لگن اور انہماک کے ہرگز ممکن نہیں۔

پروفیسر میتھوز علامہ اقبال، میر انیس اور مرزا سودا کو اپنے پسندیدہ شاعروں میں شمار کرتے تھے۔ اقبال اور سودا کا نام تو خیر سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن میر انیس کے حوالے سے اس میں حیرانی کا پہلو نکلتا ہے۔ مرثیوں کا ایک خاص تہذیبی اور تاریخی پس منظر ہے۔ اس سے مکمل واقفیت کے بغیر نہ تو اس کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی تحسین شناسی ممکن ہے۔

اپنے ایک مضمون ''اردو ادب میں میر انیس کا مقام'' میں پروفیسر میتھوز لکھتے ہیں کہ میں پہلی بار 1969ء میں لکھنؤ گیا۔ میرا وہاں پہنچنا اتفاقاً نہیں بلکہ عمداً محرم الحرام کے پہلے دس دنوں میں ہوا۔ میں ہر صبح بلا ناغہ لکھنؤ کی چلچلاتی دھوپ میں اپنے میزبان کے ہمراہ پا پیادہ اس جگہ جاتا تھا، جہاں مرثیہ خوانی کی مجلس منعقد کی جاتی تھی۔

یہ جو ڈیوڈ نے عمداً اور پا پیادہ مجلس تک جانے کا ذکر کیا ہے اس کے پیچھے ایک خاص نفسیات، ایک خاص مقصد اور ایک خاص جہان معنی پوشیدہ ہے۔ یقیناً کسی زبان کے ادب کو اس کے تہذیبی پس منظر سے علاحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اگر انہوں نے صنف مرثیہ کو سمجھنے کی خاطر لکھنؤ کی مرثیہ خوانی کی مجلسوں میں شرکت نہ کی ہوتی اور اس ماحول کو خود اپنی آنکھوں بلکہ دل کی آنکھوں سے محسوس نہ کیا ہوتا تو وہ انیس کے مرثیے ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' کا انگریزی زبان میں اتنا خوب صورت ترجمہ نہ کر سکتے تھے۔

اس مرثیے کا ترجمہ کتابی شکل میں The Battle Of Karbala کے نام سے 1994ء میں دہلی سے، 2001ء میں اسلام آباد سے، 2002ء میں ٹورنٹو سے اور پھر 2003ء میں یہی مرثیہ کراچی سے شائع ہو چکا ہے، جس سے اس ترجمے کی مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مطالعہ انیس کے ضمن میں انہوں نے اردو مرثیے کے بارے میں چند بنیادی سوالات بھی اٹھائے ہیں۔ مثلاً ان کا کہنا ہے کہ بیسویں صدی میں اردو ادب پر لکھے جانے والے چند ایک تذکروں میں صنف مرثیہ اور اردو کے جلیل القدر مرثیہ گو شاعر میر انیس کو نہ صرف ایک معمولی سا مقام دیا گیا ہے بلکہ ان کے ساتھ کھلے طور پر معاندانہ برتاؤ کا بھی مظاہرہ کیا گیا ہے۔

اسی طرح انہوں نے اپنے دوسرے پسندیدہ شاعروں اور نثر نگاروں کے بھی خوب صورت تراجم کیے ہیں اور ان کے مطالعے کے بعد اپنی نپی تلی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ اقبال کے فکر و فن پر انہوں نے کئی کتابیں اور مقالے تصنیف کیے ہیں جن میں اقبال کی شاعرانہ عظمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے مگر انہوں نے قیام پاکستان کے پس منظر میں اقبال کے حوالے سے بحث کرتے ہوئے بڑی حیرت سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اقبال کے یہاں ہندوستان کے بنگالی مسلمانوں کا کوئی خاص ذکر نہیں ملتا ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر شاعر مشرق نے خود اپنے مشرق کی طرف تو دیکھا ہی نہیں۔

جس طرح انہوں نے میر انیس کے مرثیے کا منظوم ترجمہ کیا ہے اسی طرح اقبال کی شہرہ آفاق نظم ''اسرار خودی'' کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعری کا منظوم ترجمہ ہی زیادہ اثر انگیز ہوتا ہے۔ انہوں نے سودا کا بھی ترجمہ کیا ہے اور ان کے خیال میں سودا کی ہجویات میں غیر اہل زبان خصوصاً انگریزوں کو خاصی دلچسپی ہو سکتی ہے کیوں کہ اس میں طنز کی جو تیز لہریں ہیں، وہ انگریزی مزاج سے کافی قریب ہیں۔

پروفیسر ڈیوڈ میتھوز نے سولہویں اور سترہویں صدی کے درمیانی عرصے میں گول کنڈہ اور بیجاپور کے درباروں اور بازاروں میں تشکیل پانے والی قدیم دکنی زبان کا تحقیقی مطالعہ کیا جس پر 1975ء میں لندن یونیورسٹی سے انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔

وہ صحیح معنوں میں ایک محقق اور دانشور تھے۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا علمی دائرہ صرف اردو زبان تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ دنیا کی کئی قابل احترام زبانوں میں بھی ان کی مشغولیت بالکل اسی نوعیت کی تھی۔ وہ فرانسیسی، اطالوی، روسی، ہندی، نیپالی، اور اردو کے علاوہ قدیم یونانی، لاطینی، سنسکرت، عبرانی، ہسپانوی، عربی، ترکی، سویڈش اور دوسری بہت سی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔

ان کی موت سے برطانیہ میں اردو زبان کے ایک درخشندہ دور کا اختتام ہو گیا۔

''رمضان کا مہینہ''

علی گڑھ کے معروف شاعر شمیم بستوی رمضان کے مہینہ میں بازار سے لوٹ رہے تھے۔ ہاتھ میں تھیلی تھی۔ تھیلی میں کوئی سامان تھا۔ راستے میں ایک پہچان والے مل گئے۔ پوچھا: "مولانا کیا لے کر جا رہے ہیں؟"

انہوں نے کہا: "ایسی چیز جس کے کھانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا"

ان صاحب نے کہا:

"ایسی چیزوں کا علم مولانا لوگ اپنے پاس چھپا کر رکھتے ہیں اور ہمیں بتایا جاتا ہے کچھ بھی کھاؤ روزہ ٹوٹ جائے گا۔"

مولانا نے تھیلی کھول کر دکھائی۔ اس میں جوتے رکھے تھے۔

'' جنازوں کے جلوس ''

"Pity The Nation"

خلیل جبران

ترجمہ

فیض احمد فیض

قابلِ رحم ہے وہ قوم
جس کے پاس عقیدے تو بہت ہیں
مگر دل یقیں سے خالی ہیں

قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو ایسے کپڑے پہنتی ہے
جس کے لیے کپاس
اُن کے اپنے کھیتوں نے پیدا نہیں کی

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو باتیں بنانے والے کو
اپنا سب کچھ سمجھ لیتی ہے
اور چمکتی ہوئی تلوار سے بنے ٹھنے فاتح کو
اپنا ان داتا سمجھ لیتی ہے

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو بظاہر خواب کی حالت میں بھی
ہوس اور لالچ سے نفرت کرتی ہے
مگر عالمِ بیداری میں
مفاد پرستی کو اپنا شعار بنا لیتی ہے

قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو جنازوں کے جلوس کے سوا
کہیں اور اپنی آواز بلند نہیں کرتی
اور ماضی کی یادوں کے سوا
اس کے پاس فخر کرنے کا کوئی سامان نہیں ہوتا
وہ اس وقت تک صورتِ حال کے خلاف احتجاج نہیں کرتی
جب تک اس کی گردن
عین تلوار کے نیچے نہیں آجاتی

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جس کے نام نہاد سیاستدان
لومڑیوں کی طرح مکّار اور دھوکے باز ہوں
اور جس کے دانشور
محض شعبدہ باز اور مداری ہوں

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو اپنے نئے حکمران کو
ڈھول بجا کر خوش آمدید کہتی ہے
اور جب وہ اقتدار سے محروم ہوں
تو ان پر آوازیں کسنے لگتی ہے

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جس کے اہلِ علم و دانش
وقت کی گردش میں
گونگے بہرے ہو کر رہ گئے ہوں

اور قابلِ رحم ہے وہ قوم
جو ٹکڑوں میں بٹ چکی ہو اور جس کا ہر طبقہ
اپنے آپ کو پوری قوم سمجھتا ہو۔

محبت

امجد اسلام امجد
(لاہور)

محبت کی طبیعت میں
یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے
کہ یہ جتنی پرانی جتنی بھی مضبوط ہو جائے
اِسے تائیدِ تازہ کی ضرورت پھر بھی رہتی ہے
یقیں کی آخری حد تک دلوں میں لہلہاتی ہو
ہزاروں طرح کے دلکش حسیں ہالے بناتی ہو
اسے اظہار کے لفظوں کی حاجت پھر بھی رہتی ہے
محبت مانگتی ہے یوں گواہی اپنے ہونے کی
کہ جیسے طفلِ سادہ شام کو اک بیج بوئے
اور شب میں اُٹھے
زمیں کو کھود کر دیکھے
کہ پودا اب کہاں تک ہے
محبت کی طبیعت میں عجب تکرار کی خو ہے
کہ یہ اقرار کے لفظوں کو سنانے سے نہیں تھکتی
بچھڑنے کی گھڑی ہو یا کوئی ملنے کی ساعت ہو
اسے بس ایک ہی دھن ہے
کہو مجھ سے محبت ہے
کہو مجھ سے محبت ہے
تمھیں مجھ سے محبت ہے
سمندر سے کہیں گہری
ستاروں سے سوا روشن
ہواؤں کی طرح دائم
پہاڑوں کی طرح قائم
کچھ ایسے بے سکونی ہے وفا کی سرزمینوں میں
کہ جو اہلِ محبت کو سدا بے چین رکھتی ہے
کہ جیسے پھول میں خوشبو کہ جیسے ہاتھ میں تارا
کہ جیسے شام کا تارا
محبت کرنے والوں کی سحر راتوں میں رہتی ہے
گمنام کے شاخوں میں آشیانہ بناتی ہے اُلفت کا
یہ عین وصال میں بھی ہجر کے خدشوں میں رہتی ہے
محبت کے مسافر زندگی جب کاٹ چکے ہیں
تھکن کی کرچیاں چنتے وفا کی اجرکیں پہنے
سے کی راہ گزر کی آخری سرحد پہ رکتے ہیں
تو کوئی ڈوبتی سانسوں کی ڈوری تھام کر
دھیرے سے کہتا ہے
کہ یہ سچ ہے نا
ہماری زندگی اک دوسرے کے نام لکھی تھی
دھندلکا سا جو آنکھوں کے قریب و دور پھیلا ہے
اسی کا نام چاہت ہے
تمھیں مجھ سے محبت ہے
تمھیں مجھ سے محبت ہے
محبت کی طبیعت میں
یہ کیسا بچپنا قدرت نے رکھا ہے

○

غریب نامہ

(نذرِ فیض)

جاوید زیدی (امریکہ)

فیض صاحب کا فیض ہے صاحب
ہم بھی اس کارواں میں شامل ہیں
وہ جو منزل ابھی نہیں آئی
ہم اس تشنگی کا ساحل ہیں
ہم اُسی آستاں کے سائل ہیں
جہاں سے گزری ہے بار بار سحر
غریبِ شہر کے حصّے میں گو نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں
یہاں تو مسجد و مندر میں اور کلیسا میں
خدائی آ گئی پر بندگی نہیں آئی
تلاش جس کی تھی وہ زندگی نہیں آئی
جہاں شعار رہا ، روشنی نہیں آئی
فقیہہ شہر کو تو جُبّہ و ستار ملے
غریبِ شہر یہاں غمزدہ بے کار ملے
چراغِ نور جلاتے پھرے مسیحا یہاں
غریبِ شہر کے آنگن میں نہ چراغ جلے
امیرِ شہر نے لوٹا ہے دونوں ہاتھوں سے
غریبِ شہر کی عصمت کے نہ سراغ ملے
لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی یاد آتا ہے اپنا وہ نگر کیا کیجے
در بہ در ہو کے ملی حفظ و اماں
گھر کی چوکھٹ مگر نصیب نہ تھی
میری اپنی زمیں حبیب نہ تھی

○

''صورتِ عیسٰی''

یوگیندر بہل تشنہ
(کینیڈا)

عیسٰی کی طرح، ہر شخص یہاں سُولی پہ چڑھا ہے
سُقراط کو بھی اپنی بات پہ، وِش پینا پڑا ہے

سسکیاں لے لے کر وہ روتا ہی گیا دیر تلک
اولاد کے ہاتھوں کا، بے طرح ستایا پڑا ہے

کیا تھا اُس نے ترکِ وطن اولاد کی بہتری کی خاطر
اب سوچتا ہے یہ سودا کسقدر مہنگا پڑا ہے

حالِ دل کس سے کہے، کوئی آتا نہیں اپنا نظر
وہ بھی صورتِ عیسٰی وقت کی سُولی پہ چڑھا ہے

یہ زندگی پہلے کبھی اِسقدر سنسان تو نہ تھی
خدا خیر کرے، شاید اسے کوئی سانپ سُونگھ گیا ہے

تنہا ویران نہ تھا وہ اپنے وطن میں تشنہ
محسوس اُسکو ہوتا ہے وہ صورتِ مردہ پڑا ہے

○

Corona Curse

ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد
(نیویارک)

ساری دنیا کی ، رُکی جاتی ہے Pulse
یہ Corona Virus ہے کس کی Curse

موت کے سائے ہیں دیکھو جس طرف
زندگی پہ آ رہا ہے مجھ کو ترس

اس وَبا کی زَد میں ہے ہر خاص و عام
ڈاکٹر محفوظ ہے کوئی، نہ Nurse

نوٹ زائید چھاپ لیں تو بات الگ
ان دنوں ہر ملک کا خالی ہے Purse

عبدؔ ، میں ہوں مستقل، اس سوچ میں
وقت یہ کیا دے رہا ہے ہم کو دَرس

○

عیدمبارک

محمد شاہد صدیقی شاہدؔ
(کینیڈا)

سرورِ عالم کے پیاروں کومبارک عید ہو
باغِ اُمت کی بہاروں کو مبارک عید ہو
بھیجتے ہیں عیدیاں یارانِ خوش اوصاف آج
ساری اُمت کی عواموں کو مبارک عید ہو
دل سے دل جیسے ملا سینے سے سینہ بھی ملے
مظہرِ الفت پہ یاروں کو مبارک عید ہو
سنت و توحید کے اسباق جاری جس میں ہو
ایسے دینی سب اداروں کو مبارک عید ہو
قافلے جن پر چلا کرتے ہیں اہلِ خیر کے
ایسی راہوں رہگزاروں کو مبارک عید ہو
اپنی خوشیوں میں نہ بھولیں جو غریبوں کو کبھی
ان غریبوں کے سہاروں کو مبارک عید ہو
جو مبلغ کرتے ہیں تبلیغ دین مصطفٰے
ایسے سب ایمان داروں کو مبارک عید ہو
جن کا ایمان اور اسلامی عمل جنکی حیات
دین کے ان چاند تاروں کو مبارک عید ہو
ہم کرونا کی وجہ سے مل نہیں سکتے گلے
پیار کے ان شاہکاروں کو مبارک عید ہو
رنج وغم ہر اُمتی کے دل میں اور چہرے پہ ہے
ایسے سب غربت کے ماروں کو مبارک عید ہو
بے عمل کی عید کیا شاہدؔ اگر دولت بھی ہو
ان کے سوٹ اُن کے غراروں کو مبارک عید ہو

○

اندھیرے کی سِلیں

فیصل عظیم
(کینیڈا)

آسمان
بھاری ہو چلا
اور زمین
یہ زمین اور ہلکی ہو گئی
اور یہ سب
ان کے بیچ
یہ سِلیں اندھیرے کی
ان کا بوجھ بھی تو ہے
آسمان گر کے کرچی کرچی ہو بھی سکتا ہے
اس سے پہلے میں
یہ کالی مستقل سِلیں ہی توڑ دوں نہ کیوں
توڑ ڈالوں تاریکی
آسمان گر جائے
اور کچھ نظر آئے!

○

ٹاک شو

طنز، دشنام، شعلے، منہ کے جھاگ
جیسے لے کر پہاڑ سر پہ ہی دے ماریں گے
جیسے سب معرکے ابھی ہوں گے
جیسے سب فیصلے ابھی ہوں گے
اور اس بحثِ بے اثر کے بعد
چل دیے خندہ زن
اور بھوکے کا پیٹ خالی رہا
اور ننگے کے تن پہ سرد ہوا کے تھپیڑ
اور ناسور تو رہے ناسور
اور خالی دوا کی شیشی میں دل کے ٹکڑے
وہی بچّے کی لاش ہسپتال سے نہیں لا پانے کی مفلس برچھی
خالی جیبیں بھی کوئی کیا دیکھے
اب تو وہ جیب بھی نہیں باقی
منہ کے بس جھاگ مَل سکو تو مَلو چہروں پر

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

جنگ مُسلط کیوں کرتے ہو!

امن سے بھی تو رہ سکتے ہو،
دُکھ جتنے ہوں سہ سکتے ہو،
جو کہنا ہو کہ سکتے ہو!
امن سے بھی تو رہ سکتے ہو!
جنگ مسلط کیوں کرتے ہو؟

○

یادگار لمحے

خوشگوار موسم میں
یادگار لمحوں کی
جب شبیہ اُبھرتی ہے
زندگی یقیں جانو!
خود بخود سنورتی ہے
ہر خوشی نکھرتی ہے
خوشبوئے شناسا بھی
روز و شب اُترتی ہے
زندگی یقیں مانو!
خود بخود سنورتی ہے

○

حضرتِ مُودی!

حضرتِ مُودی ہیں شرمندہ بہت اِس مَات سے
ہار کر اپنے وطن میں ایک عورت ذات سے
ہم دُعا گو ہیں پڑوسی مُلک کی اُفتاد پر۔۔
شاید راہِ راست پر آ جائیں وہ اس بات سے

جاوید زیدی (امریکہ)

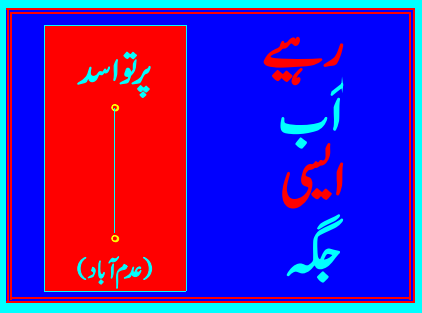

میاں۔۔۔ خط تمہارا مع غزل پہنچا۔ غزل کیا دیکھوں، فی الوقت عذابِ الٰہی دیکھ رہا ہوں۔ نہ کاغذ ہے نہ ٹکٹ نہ لفافہ۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ میں لپیٹ کر اس تحریر کو سپردِ ڈاک کر دوں گا۔

تم نے دلی کا حال پوچھا ہے!

میاں۔۔۔ اس کے مقدر میں تو اجڑنا ہی لکھا ہے۔۔۔

کبھی انسانوں سے کبھی آسمانوں سے!

کیفیت کیا لکھوں۔

کلیجہ منہ کو آتا ہے۔۔

ہاتھ لرزاں قلم جنبش نکند۔۔۔۔

لو صاحب تمہاری تواضع خاطر کے لئے جی ہلکا کئے لیتا ہوں۔ جی اپنا کڑا کر لو، اور سنو۔۔۔

ہر جانب ہو کا عالم ہے۔ محلے ویران، مکان بے چراغ،

نہ آدم نہ آدم زاد۔ بس ایک سناٹا کہ ہر سو چھایا ہوا ہے۔ شہر، اب شہرِ خموشاں ہے۔ ویرانی، وحشت، خاموشی، خوف، چشمِ تصور نے بھی کبھی دلی کو اس طرح دیکھا ہوگا؟ بحکم سرکار منادی والا آتا ہے، مرنے والوں کی تعداد بتا جاتا ہے۔ یہ عمل دن میں تین بار ہوتا ہے۔ خوف و دہشت کو ذرا جی سے دور کرنا چاہا کہ یہ کم بخت آ کر منادی موت کی سنا جاتا ہے۔ بتاؤ، ایسے حالات میں انسان زندگی کیوں کر اور کیسے کرے؟

صاحبانِ عالیشان کا فرمان ہے کہ ہر انسان چھوٹا بڑا، مرد و زن، اپنے مکانوں میں محصور رہے تا دمِ فرمانِ ثانی۔ خلاف ورزی باعث سرزنشِ شدید ہوگی۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ ناچار بیٹھا اپنے اشعار کی تسبیح کئے جاتا ہوں۔

رہئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

مسموع ہوا ہے کہ تمام شہر اور اطراف کا علاقہ ایک وبائے ناگہانی کی زد میں ہے۔ یہ وبا آپسی اختلاط، میل ملاپ سے آگ کی طرح پھیلتی ہے، لہٰذا ماحفظ التقدم انسان انسان سے دور رہے۔ اطباء و اہل حکمت وبا کا نام "کورونا وائرس" بتاتے ہیں۔ میں گنہ گار بندہ علی کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس بیماری یا وبا کا نام میں نے قبل ازیں نہ پڑھا نہ سنا۔ بظاہر اسم مرکب ہے نصف اس کا ریختہ اور نصف انگریزی۔ ریختہ میں کرنا مصدر ہے، کر اس کا امر ہے: کرو حالتِ حکم۔

'نا' اصرار کے لیے، جیسے چلو نا، آؤ نا، پیو نا وغیرہ وغیرہ۔ وائرس لفظ انگریزی کا ہے۔ میری فرنگی زبان میں ایسی استعداد نہیں کہ مفہوم تک رسائی ہو۔ فرہنگ سروری میں بھی یہ لفظ موجود نہیں۔ قرین قیاس "احتیاط" مفہوم ہو سکتا ہے۔ یوں جان لو۔۔۔۔

" کرونا احتیاط"۔۔۔

روبہ کعبہ کہتا ہوں کہ میں موت سے نہیں ڈرتا مگر وبا میں مرنا مجھے پسند نہیں:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

ان حالات میں مخلوق کو خالق سے رجوع ہونا چاہیے۔

توبہ، استغفار ہی نجات کا راستہ ہے۔ انسان معذور و مجبور۔۔۔!

گزشتہ دنوں میرے کرم فرما، محسن و مہرباں راجہ نریندر سنگھ بہادر والی پٹیالہ کا فرستادہ کارندہ غریب خانہ پہنچا۔ تین بوتلیں "لیکویور" کی راجہ صاحب نے تحفتاً بھجوائی تھیں، دے گیا۔ گویا اسے رسد سمجھو۔ میاں تم نہ سمجھو گے۔ یہ بہت قیمتی اعلیٰ درجہ کی انگریزی شراب ہے۔ مانند قوام، رنگت قرمزی، ذائقہ نہایت لطیف اور نشہ دیرپا۔ اللہ بڑا کارساز ہے ورنہ آج اس نفسانفسی کے عالم میں یہ ناتواں بے سرو ساماں کہاں سے یہ عرقِ تسکینِ دل و جاں جٹاپاتا تھا۔

حقہ کے لوازمات اور عرقِ گلاب وافر مقدار میں موجود ہیں۔ چلو، بارے کچھ دنوں کا سہی، سامانِ عیش تو ہے۔

کوتوالِ شہر نے فصیل کے چاروں دروازے مقفل کر دیے ہیں۔ نہ کوئی آ سکتا ہے نہ جا سکتا ہے سوائے سرکاری منصب داروں اور جرنیلی کارندوں کے۔

دیکھو یہ صورتِ حال کب تک رہے۔

مرزا سرفراز خاں صاحب کو خط میرا پڑھوا دینا۔

نجات کا طالب۔۔۔

غالب

ایک صدی کا قصّہ

رامانند ساگر

دیپک کنول (ممبئی)

چودہ سال کی ایک ماں سے اُسکا پلوٹھی کا بچہ اُس کے سولہ سال کے شوہر نے چھین کر اپنی ساس کی گود میں ڈال دیا کیونکہ اُن کے یہاں کوئی بچہ نہیں تھا۔ اُس نے اپنی ساس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ جب بھی اُن کا پہلا بچہ ہوگا تو وہ اُسے ایک دن بھی اپنے پاس نہیں رکھے گا بلکہ وہ اُسے اُن کو سونپ دے گا چاہے دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے وہ اپنے وعدے سے مکرے گا نہیں۔ جب بچے نے جنم لیا تو اُس نے اپنی بیوی کی ایک نہ سنی اور ایک معصوم کو اُسکی ماں سے جدا کر دیا۔ بچہ چھن جانے کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ بچے کی ماں اپنی سدھ بدھ ہی کھو بیٹھی۔ غیر متوازن دماغی حالت میں اُس نے ایک اور بیٹے کو جنم دیا جس کا نام چترنجن رکھا گیا۔ وہ بھی ماں کے پیار سے محروم رہا کیونکہ ماں ذہنی طور بیمار ہوگئی تھی۔ اُسے اس بات کا ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ پھر سے ماں بن چکی ہے۔ وہ زیادہ دنوں تک جی نہ سکی۔ محض بیس سال کی عمر میں اُس نے دم توڑ دیا۔ یہ فلمی کہانی کی طرح لگتی ہے مگر یہ ایک سچی کہانی ہے اور اس کہانی کا تعلق مشہور کہانی کار، ہدایت کار اور فلمساز رامانند ساگر کی زندگی سے ہے۔

رامانند ساگر جس کا اصل نام چندر موہلی چوپڑہ تھا جس کا جنم 29 دسمبر 1917 کو اصل گورونزد لاہور میں ہوا۔ اُس کا دادا لالہ شنکر داس چوپڑہ بہت بڑا کاروباری آدمی تھا۔ لاہور میں اُن کی کافی جائیداد اور پھیلا ہوا کاروبار تھا۔ اُسکے دادا نے لاہور سے نقل مکانی کر کے کشمیر میں پناہ لی۔ اُس نے یہاں سری نگر شہر میں اپنا کاروبار جما لیا۔ چندر موہلی کے والد لالہ دینا ناتھ چوپڑہ تاج پشاوری کے نام سے شوقیہ شاعری کیا کرتے تھے۔ اُس نے اپنی پہلی بیوی کی موت کے بعد دوسری شادی کر لی جس سے اُس کے کئی بچے ہوئے جن میں سے ایک جانا مانا نام فلمساز اور ہدایت کار ونود چوپڑہ کا ہے۔ جس نے کئی ساری فلمیں بنائیں، جن میں سے اُس کی پچھلی فلم ''پی کے'' ہے جس میں عامر خان اور انشوکا شرما مرکزی کردار میں تھے۔

چندر موہلی کی نانی نے اُس کا نام بدل کر رامانند رکھ دیا۔ اب وہ رامانند بیدی تھا کیونکہ اُس کے ننہیال والے بیدی کے نام سے جانے جاتے تھے۔ رامانند بچپن سے ہی اپنے ماں باپ کے پیار سے محروم رہا۔ یہ کسک وہ ساری زندگی محسوس کرتا رہا۔ اُس نے اپنی ابتدائی تعلیم لاہور میں ہی پوری کی جب کہ کالج کی پڑھائی اُس نے سری نگر کے سری پرتاپ کالج میں شروع کی۔ لکھنے کی طرف وہ بچپن سے ہی مائل ہو چکا تھا۔ اُس نے پریم پریتکھشا کے نام سے ایک نثری نظم لکھی جسے اس قدر پسند کیا گیا کہ اُسے کالج کے میگزین میں شائع کیا گیا مگر ساتھ ہی مدیر کو اُس کی تخلیقی صلاحیتوں پر شبہ تھا کیونکہ اُس وقت اُس کی عمر سولہ سال تھی جب کہ نظم کا لب ولہجہ کسی صاحب سخن کا تھا۔ میگزین کے مدیر کو ایسا لگ رہا تھا کہ یہ نظم کہیں سے اُٹھالی گئی ہے اس لئے اپنا دامن بچانے کے لئے کہ یہ نظم رامانند کی لکھی ہوئی ہے یا کہیں سے سرقہ کی گئی ہے اس نے نظم کے ساتھ یہ حاشیہ بھی لگا دیا کہ مدیر اس نظم کی (orginality) کے لئے ذمہ دار نہیں ہے۔

رامانند کا بچپن کب گزر گیا اُسے پتا ہی نہیں چلا۔ اصل میں اپنے ماں باپ سے جدائی کے غم نے اُس کی بچپن کی ساری شوخیاں اور شرارتیں اُس سے چھین لی تھیں۔ وہ ہمیشہ اُداس اور افسردہ رہتا تھا۔ اپنی نانی اور نانا سے اُسے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ اسے گھر نہیں قید خانہ سمجھتا تھا۔ اُسنے چھوٹی عمر سے ہی لکھنا شروع کیا۔ اُس نے ہر طرح کے فن پر طبع آزمائی کی۔ اُس نے کہانیاں لکھیں، ناول لکھے، ڈرامے لکھے اور ساتھ ہی شعر و شاعری بھی کی۔ وہ کئی ناموں سے لکھتا رہا۔ رامانند چوپڑہ، رامانند بیدی اور رامانند کشمیری۔ 1936 جب وہ اُنیس سال کا تھا تو وہ گھر سے بھاگا اور اُس نے فلموں میں داخلہ لیا۔ اُس نے ایک خاموش فلم ''Raiders of Rail Road'' میں ایک کلیپر بوائے کی حیثیت سے شمولیت اختیار کی۔ وہ ایک جگہ ٹک نہیں پایا۔ اُس کے اندر ایک بے چینی تھی۔ گھر میں وہ رہ نہیں پا رہا تھا۔ اُسے گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ اُس کے نانا کافی مالدار تھا مگر اُس نے اپنے نانا سے کوئی مدد نہیں لی بلکہ وہ خود کام کرتا رہا۔ اُس نے ہر طرح کے کام کئے اُس نے چپراسی سے لے کر کلرک کی نوکری کی، اُس نے کلینر کا کام کیا، اُس نے صابون فروخت کیا، ایک سونار کے پاس رہ کر سونا بیچا۔ اُسے کوئی بھی کام کرنے میں شرم محسوس نہیں ہوئی۔ وہ اپنے دم پر زندگی جینا چاہتا تھا اور اپنے اندر کے اُس خلا کو بھر دینا چاہتا تھا جو ماں کے مرنے سے اُس کے اندر پیدا ہوا تھا۔ اُس نے جو بھی کیا اچھا کیا برا کیا مگر اپنی پڑھائی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ وہ دن میں کام کرتا تھا اور رات میں پڑھائی کرتا تھا۔ اُس نے پہلے روزنامہ ''پرتاب'' اور روزنامہ ''ملاپ'' میں کئی مضمون لکھے اور پھر ''ملاپ'' میں مدیر کی حیثیت سے بھی کام کیا 1940 میں اندرا موی ٹون کے مالک آر ایل شوری نے اُسے پنجابی فلم ''کوئل'' میں ہیرو کے رول کی پیش کش کی۔ اس سے پہلے کہ فلم کی شوٹنگ شروع ہو جاتی وہ بیمار پڑ گیا۔ بیماری کے سبب اُس کے ہاتھ سے یہ سنہری موقع نکل گیا۔ یہ رول ستیش بترہ کے حق میں چلا گیا۔ بہر حال اسی سال شالیمار اسٹوڈیو پونہ نے اُسے اپنی ادھوری فلم ''کرشنا'' میں اِبھیمنو کا کردار ادا کرنے کا موقع دیا۔ ساتھ ہی اُس نے پرتھوی راج کپور کے پرتھوی تھیٹر میں اسسٹنٹ فلور منیجر کی حیثیت سے کام کیا۔ اُس نے پرتھوی تھیٹر کے لئے تین ایکٹ کا ایک اسٹیج ڈرامہ لکھا جس کا نام ''گورا'' تھا۔ اُس کے بعد اُس نے دو ایکٹ کا ڈرامہ لکھا جس کا نام ''کلاکار'' تھا جس میں مرکزی کردار پرتھوی راج کپور نے ادا کیا۔ اس کے بعد وہ واپس چلا گیا۔ 1942ء میں

اُس نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی اور سنسکرت میں نہ صرف گریجویشن کی ڈگری حاصل کی بلکہ ان دونوں زبانوں میں اونچے نمبر لے کر سونے کے میڈل بھی حاصل کئے۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہناتا اُس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ وہ ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اُن دنوں تپ دق کا مطلب موت ہوتا تھا کیونکہ اس مرض کا کوئی علاج دستیاب نہیں تھا۔ جب اس مرض کی تشخیص ہوئی تو رامانند چوپڑہ کو ٹنگرگ (گلمرگ) کے ٹی بی سینٹوریم میں علاج کے لئے بھیجا گیا۔ کسی کو اُمید نہیں تھی کہ وہ واپس زندہ لوٹ کے آئے گا۔ اس سینٹوریم میں ایک جوڑا تھا جو کہ دق کے مریض تھے۔ وہ ایک دوسرے سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ اُنہوں نے مرنے سے قبل شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ محبت کا اثر تھا یا اُنکی خود اعتمادی کہ وہ دونوں روبہ صحت ہو گئے اور اُن کو سینٹوریم سے وداع کیا گیا۔ پہلی بار رامانند ساگر کو سچی محبت کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ اُس نے چاہا کہ وہ محبت کا یہ پیغام پوری دنیا تک پہنچا دے۔ اُس نے ''ایک ٹی بی پیشنٹ کی ڈائری'' کے عنوان سے ایک کالم لکھا جو کہ لاہور کے ایک ادبی میگزین ''ادبِ مشرق'' میں باقاعدہ چھپا۔ اس کالم نے بہتوں کا دل چھو لیا۔ ان میں سے ایک فیض احمد فیض تھے جس نے ساگر کی خوب تعریف کی اور اسطرح ساگر کو پہچان ملی۔

رامانند ساگر کی خود اعتمادی نے اُسے تپ دق سے نجات دلا دی۔ وہ صحت یاب ہو کے سنیٹوریم سے نکلا اور کچھ دنوں کے لئے لاہور چلا گیا۔ اُس کی ادبی صلاحیتوں کو اُردو کے مستند ادیب تسلیم کرنے لگے تھے جن میں کرشن چندر سرفہرست تھا۔ 1943 میں محبوب خان، کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو نے اُسے بمبئی آنے کے لئے کہا مگر وہ کئی نجی وجوہات کے باعث بمبئی نہ آ سکا۔ وہ غم روزگار میں شہر شہر بھٹکتا رہا۔ 1947 میں جب ملک کا بٹوارہ ہوا تو ساگر اُن دنوں کشمیر میں تھا۔ بٹوارے کے فوراً بعد قبائیلوں نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ رامانند چوپڑہ اپنے پریوار کو لے کر نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوا۔ وہ وہ اپنی حاملہ بیوی اپنے پانچ بچوں کی ماں، ساس اور اپنے چھوٹے بھائی چترنجن کے ساتھ کشمیر سے دلی پہنچا۔ چترنجن جو ماں کے پیار کے لئے ترستا رہا کیونکہ وہ اُس حالت میں نہیں تھی کہ وہ اُس سے پیار کر سکے۔ چترنجن کا ایک مسلم لڑکی سے پیار ہوا تھا۔ دنوں کا ملن ممکن نہیں تھا کیونکہ اکثریتی سماج کا دباؤ اس قدر تھا کہ محبت کا یہ کھیل موت کے کھیل میں تبدیل ہو سکتا تھا۔ چترنجن اپنی محبت کی خاطر وادی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا مگر ساگر اپنے بھائی کو مجبوراً دلی لے کر چلا گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ اُس لڑکی نے خودکشی کر لی۔ چترنجن نے بھی اُس کے بعد شادی نہیں کی۔ وہ ساری زندگی کنوارا رہا۔

رامانند کے پاس کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ تھا وہ کشمیر میں رہ گیا تھا۔ اتنے بڑے پریوار کو پالنا آسان نہ تھا۔ اُس نے اپنے پریوار کو زندہ رکھنے کے لئے سڑک پر بیٹھ کر صابون بیچا۔ ٹرک کے ساتھ کلینر کا کام کیا۔ اُس نے اپنے پریوار کی کفالت کے لئے خوب محنت مزدوری کی۔ بہت جلد دلی شہر سے اُس کا دل بھر گیا۔ وہ اپنی فیملی کو لیکر بمبئی کے لئے روانہ ہوا۔ بمبئی اُس کا دیکھا بھالا شہر نہ تھا۔ اُس کے پاس رہنے کی جگہ نہیں تھی اس لئے اُس نے اداکار ساجن کے ملاڈ والے گھر ''ٹریسا ولا'' میں قیام کیا۔ اُس نے زندگی میں پہلی مرتبہ سمندر کے دیدار کئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن وہ سمندر کے کنارے کھڑا لہروں سے باتیں کر رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس سمندر سے پرارتھنا کر رہا تھا کہ وہ سپنوں کے اس شہر میں اُس کی آمد کو قبول کرے۔ تبھی ایک لہر اُٹھی جو اُس کے قدموں کو چھو کر لوٹ گئی۔ رامانند کو لگا کہ سمندر نے اُسے قبول کر لیا۔ وہ بہت خوش ہوا اور اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا نام رامانند چوپڑہ سے بدل کر رامانند ساگر رکھ لے۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ اُس نے نہ صرف اپنا نام بدل لیا بلکہ اپنے بچوں سے بھی چوپڑہ کا لاحقہ ہٹا کر ساگر کر دیا۔ نام کی اس تبدیلی نے بہت جلد اپنا اثر دکھانا شروع کیا۔

1947 میں ملک کا بٹوارا ہوا۔ بٹوارے نے انسانیت کو جو گہرے زخم دئے اُن سے کوئی بھی حساس انسان متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ رامانند ساگر نے بھی اس خون آگین دور کو صفحہ قرطاس پر اُتارا۔ اُس نے ایک ناول لکھا جس کا عنوان تھا ''اور انسان مر گیا''۔ یہ ناول اُردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ناول نے رامانند ساگر کو اُردو ادب میں پہچان دلائی۔ اُسنے ایک بار پھر پرتھوی تھیٹر میں داخلہ لیا۔ راج کپور کو وہ پہلے سے جانتا تھا اسلئے اُس سے گاہے گاہے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ راج کپور کی پہلی فلم ''آگ'' بری طرح ناکام رہی تھی۔ وہ ایک نئی کہانی کی تلاش میں تھا۔ رامانند ساگر نے اُسے ایک روز ایک کہانی سنائی جس کا نام ''برسات'' تھا۔ جب وہ کہانی سنا رہا تھا تو دونوں جذبات میں اسقدر بہہ گئے کہ کہانی سنتے بھی رہے اور ساتھ ہی روتے بھی رہے۔ راجکپور نے ساگر سے کہانی خرید لی اور اسے سلولائڈ کے پردے پر اُتارنے میں جٹ گیا۔ اس فلم میں نرگس کو چھوڑ کے باقی کوئی اسٹار نہیں تھا۔ ہیرو کے رول میں راج کپور تھا جب کہ معاون کردار میں پریم ناتھ تھا جب کہ اُس کے مقابل ایک نئی لڑکی نواب بانو تھی جس کو نیا نام نمی دیا گیا تھا۔ اس فلم میں پہلی بار موسیقاروں کی ایک نئی جوڑی شنکر جے کشن کو ہی نہیں بلکہ گیت کار حسرت جے پوری اور شیلندر کو بھی موقع دیا گیا تھا۔ فلم نے ہر طرف کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔ اس فلم نے بزنس کے سارے ریکارڑ توڑ دئے۔ راج کپور کے ساتھ رامانند ساگر کی قسمت بھی چمک اُٹھی۔

1950 میں اُس نے اپنی ذاتی فلم پروڈکشن ''ساگر فلم پروڈکشن پرائیویٹ لمیٹیڈ'' کی نیو رکھ دی جو بعد میں ''ساگر آرٹس'' میں تبدیل ہو گیا۔ اسی بیچ اُسے بطور منظر اور مکالمہ نگار ایک اور فلم ملی جس کا نام ''جان پہچان'' تھا۔ اس فلم کے مرکزی کردار میں راج کپور اور نرگس تھے۔ معاون اداکاروں میں شیاما اور جیون تھے۔ اس فلم کے فلمساز مشہور کیمرہ مین فلی مستری تھے۔ یہ فلم 1950 میں ریلیز ہوئی۔

1952 میں رامانند ساگر کی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کے مکھیہ

کلاکاروں میں دلیپ کمار اور مدھو بالا تھے۔اس فلم کا نام ''سنگدل'' تھا۔اس فلم کا منظر نامہ اور مکالمے ساگر نے لکھے تھے۔اس فلم کی موسیقی سجاد نے ترتیب دی تھی۔رامانند ساگر کی منزل یہیں تک نہیں تھی۔وہ بہت آگے جانا چاہتا تھا۔اُس کی مراد جلدی پوری ہوگئی جب اُسے فلم ''مہمان'' کو اپنے ساگر آرٹس کے بینر تلے بنانے کا موقع ملا۔یہ اس بینر کی اولین فلم تھی جس کے فلمساز، ہدایت کار اور لیکھک رامانند ساگر تھے۔یہ فلم اُسکی مصیبتوں اور کلفتوں کی آئینہ دار تھی۔اس کی کہانی اُس کی اپنی زندگی کی کہانی تھی جس میں درد وغم رنج ومحن کے سوا کچھ نہ تھا۔اس فلم کے اداکار تھے پریم ناتھ، نمی، ساجن اور پورنیا۔فلم کی موسیقی انل بسواس نے ترتیب دی تھی۔یہ فلم 1953 میں ریلیز ہوئی۔اگلے سال اُسکی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''بازو بند'' تھا۔اس فلم کو اُس نے ڈائرکٹ کیا تھا۔اس فلم کے اداکار تھے بلراج ساہنی، سلوچنا چٹر جی، روپ مالا، انور حسین، اوم پرکاش اور برہم بھاردواج ۔ یہ فلم 1954 میں ریلیز ہوئی۔1956 میں ساگر کی ایک اور فلم نمائش کے لئے پیش کی گئی جس کے اُس نے مکالمے لکھے تھے۔اس فلم کا نام ''میم صاحب'' تھا۔پھر 1958 میں ساگر کی فلم ''راج تلک'' ریلیز ہوئی جسے اُس نے لکھا تھا۔یہ فلم ساؤتھ کے مشہور فلمساز اور ہدایت کار ایس ایس واسن کی ہدایت میں بن رہی تھی۔اس فلم کے اداکاروں میں وجینتی مالا، پدمنی، جیمنی گنیشن اور پران اہم کرداروں میں تھے۔اس فلم کو سی رامچندر نے اپنی دھنوں سے آراستہ کیا تھا۔یہ فلم 1959 میں ریلیز ہوئی۔ایس ایس واسن ساگر کے کام سے اتنا خوش تھا کہ اُس نے اپنی اگلی فلم ''پیغام'' کے لئے رامانند ساگر کو بطور رائٹر سائن کیا۔اس فلم کے اداکاروں میں دلیپ کمار، راج کمار، وجینتی مالا، بی سروجا دیوی اور موتی لال تھے۔یہ فلم بھی اسی سال ریلیز ہوئی اور بہت بڑی ہٹ ثابت ہوئی۔اس فلم کے لئے رامانند ساگر کو بہترین مکالمہ نگار کے طور پر فلم فیئر ایوارڑ سے نوازا گیا۔

ایس ایس واسن ساگر پر اتنا مہربان ہوا کہ اُس نے اپنی اگلی فلم ''گھونگھٹ'' کی ہدایت کاری کی کمان ساگر کو سونپ دی۔رابندر ناتھ ٹیگور کی کہانی پر مبنی یہ فلم جس میں بینا رائے، پردیپ کمار، بھارت بھوشن، آشا پاریکھ مرکزی کردار میں تھے۔جب کہ معاون کرداروں میں رحمان، مینو ممتاز، آغا، لیلا چٹنس، کنہیا لال، ہیلن اور راجندر ناتھ تھے۔اس فلم کو روی نے اپنے مدھر سنگیت سے آراستہ کیا تھا۔اس فلم کی کامیابی نے ساگر کو اونچے مقام تک پہنچا دیا۔رائٹنگ کے علاوہ اُس نے ہدایت کاری میں بھی اپنی دھاک جمادی تھی۔

ایس ایس واسن کی جیمنی پکچرس کے لئے رامانند ساگر اب ایک جزو لانفیک بن چکا تھا۔اُنہوں نے اُسے اپنی اگلی فلم کے لئے سائن کیا جس کا نام ''زندگی'' تھا۔اس فلم کے اداکاروں میں جوبلی کمار راجندر کمار اور وجینتی مالا مرکزی کردار میں تھے۔ساتھ میں راجکمار اور پرتھوی راج کپور تھے۔اس فلم کی موسیقی شنکر جے کشن نے ترتیب دی تھی۔اس فلم کو بے پناہ کامیابی ملی۔یہ فلم 1964 میں ریلیز ہوئی۔اسی سال اُسکی ایک اور فلم بطور رائٹر ریلیز ہوئی جس کا نام ''راجکمار'' تھا۔اس فلم کے اداکاروں میں پرتھوی راج کپور، شمی کپور، سادھنا، پران، اوم پرکاش اور راجندر ناتھ اہم کردار میں تھے۔اس فلم نے بھی ریکارڑ توڑ کامیابی حاصل کی۔

اس کے بعد رامانند ساگر کی قسمت نے ایسی کروٹ لی جس نے رامانند ساگر کو نئی رفعتوں سے ہمکنار کر دیا۔ساگر آرٹس کے بینر تلے بننے والی دوسری فلم ''آرزو'' کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔رامانند ساگر اور راجندر کمار کے رشتے بڑے دوستانہ تھے اس لئے اس فلم کے لئے اُسے سائن کیا گیا۔ساتھ میں سادھنا اور فیروز خان اور محمود کو بھی معاہدہ بند کیا گیا۔موسیقی کے لئے سنگیت کار شنکر جے کشن کو سائن کیا گیا۔کشمیر کے پس منظر میں بننے والی یہ پریم کہانی رامانند ساگر نے لکھی تھی۔وہ اسے بڑے پیمانے پر بنانا چاہتے تھے۔رامانند ساگر نے اپنی سب سے بڑی آرزو کو پردہ سیمیں پر لانے کے لئے کسی بھی کمی کو آڑے نہیں آنے دیا۔فلم کی شوٹنگ شد و مد سے شروع ہوئی۔کشمیر کے جھیل ڈل کے پس منظر میں اس فلم کا بیشتر حصہ فلمایا گیا۔یہ فلم 1965 میں ریلیز ہوئی۔فلم نے باکس آفس کی کھڑکی پر دھوم مچادی۔فلم کی زبردست کامیابی نے رامانند ساگر کی جھولی بھر دی اور ساگر آرٹس کی بنیادیں مظبوط ہوگئیں۔''آرزو'' کے لئے رامانند ساگر کو دو فلم فیئر ایوارڑ ملے۔ایک بہترین کہانی کے لئے اور دوسرا بہترین ہدایت کاری کے لئے۔

اس کے بعد رامانند ساگر نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔اُس نے ساگر آرٹس کے بینر تلے باقاعدہ فلمیں بنانا شروع کیں۔''آرزو'' کے بعد بننے والی دوسری فلم ''آنکھیں'' تھی۔یہ ایک جاسوسی تھرلر تھی جس میں دھرمیندر، مالا سنہا، محمود اور سجیت کمار اہم کرداروں میں تھے۔یہ فلم 1968 میں ریلیز ہوئی اور اُس سال کی اُن دس فلموں میں سے ایک تھی جنہوں خوب کمائی کی تھی۔اس فلم کے فلمساز، ہدایت کار اور لیکھک رامانند ساگر تھے۔اسکے بعد اُس کی فلمیں ''گیت''، ''للکار'' اور ''جلتے زیادہ کامیاب نہیں رہیں حالانکہ ''گیت'' اور ''للکار'' کے اداکاروں میں بڑے نام شامل تھے۔1976 میں رامانند ساگر نے ''چرس'' بنا کر ریلیز کی جس کے مرکزی کردار میں دھرمیندر اور ہیما مالنی تھے جب کہ معاون کرداروں میں اجیت، امجد خان، ارونا ایرانی، اسرانی، نذیر حسین اور سجیت کمار تھے۔اس فلم کو ویدراہی اور رامانند ساگر نے مل کر لکھا تھا۔فلم زبردست ہٹ رہی۔یہ اُس سال کی سب سے زیادہ کمائی کرنے والی پانچ فلموں میں شامل تھی۔اُس کے بعد آئی فلم ''پریم بندھن'' جس کے کلاکار تھے راجیش کھنہ، ریکھا اور موسمی چٹر جی تھے۔اس فلم کے پرڈیوسر ریوتی رمن نندا تھی۔رامانند ساگر اس فلم کے ہدایت کار تھے۔اس فلم نے بھی خوب کمائی کی۔ساگر آرٹس کے بینر تلے بننے والی رامانند ساگر کی آخری کامیاب فلم ''بغاوت'' تھی جس کے اداکار تھے دھرمیندر، ہیما مالنی، رینا رائے، امجد خان، سجیت کمار اور بی ایم ویاس۔یہ فلم بیحد کامیاب رہی۔اس کے بعد رامانند ساگر نے فلم ''رومانس'' اور ''سلمہ'' بنائیں۔یہ دونوں فلمیں باکس آفس پر بری طرح ناکام رہی حالانکہ ''سلمہ'' کا سنگیت کافی مقبول ہوا تھا مگر اس سے فلم کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ایک دن رامانند ساگر نے سوئزرلینڈ کے ایک کیفے میں ریڈ وائن کا ایک گلاس پی کر اعلان کر دیا کہ وہ ٹی وی کے چھوٹے اسکرین کی خاطر فلموں سے کنارہ کشی کر رہا ہے۔ فلم والوں کو لگا کہ وہ سٹھیا گیا ہے۔ ایک کامیاب پروڈکشن ہاؤس جس نے بے شمار ہٹ فلمیں دیں وہ فلموں سے کیسے کنارہ کر سکتا ہے۔ انڈسٹری میں یہ موضوع کئی مہینوں تک زیر بحث رہا۔ رامانند ساگر جہاں دیدہ آدمی تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ ٹیلویژن کا بھاری پیمانے پر پھیلاؤ ہونے والا ہے۔ ایک وقت آئے گا جب ٹیلی ویژن فلموں پر حاوی ہوگا۔ اُسے اس بات کا کامل یقین تھا کہ یہ کل کا سب سے بڑا منعفت بخش کاروبار ثابت ہونے والا ہے۔ اُس نے سن 1985 سے اُس نے ٹیلی ویژن کے لئے کام کرنا زیادہ مفید سمجھا۔ اُس نے دوردرشن کے لئے پہلا سیریل بنایا جس کا نام ''وکرم اور بے تال'' تھا۔ یہ سیریل دو سال تک چلتا رہا۔ اسی دوران اُس نے ''رامائن'' سیریل بنانے کا ارادہ کر لیا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ رامانند ساگر کی یہ پہل اُسکے لئے خوشحالی اور کامیابی کی نوید لے کر آئے گی۔ 25 جون 1987 کا وہ تاریخی دن جب ''رامائن'' کا پہلا اپیسوڈ دوردرشن کی نیشنل چینل سے ٹیلی کاسٹ ہوا۔ اس سیریل نے ہندوستان کی جنتا کو جیسے سحر زدہ کر دیا۔ لوگ نہا دھو کر ٹی وی کے سامنے بیٹھتے تھے اور ایک پل کے لئے بھی ٹی وی سے آنکھیں نہیں ہٹاتے تھے۔ ہر اتوار کی صبح کو بازار سنسان ہو جاتے تھے۔ ساری سرگرمیاں ٹھپ ہو کے رہ جاتی تھیں۔ جسے دیکھو وہی ٹی وی کے سامنے بیٹھا نظر آتا تھا۔ رامانند ساگر جہاں بھی جاتا لوگ اُس کی پوجا کرتے تھے۔ اُسے پھولوں سے لادتے تھے۔ اس سیریل کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ یہ ہندوستان کے علاوہ پانچ ملکوں میں ٹیلی کاسٹ ہوا جن میں نارتھ اور ساؤتھ امریکہ، افریقہ، یورپ اور ایشا شامل ہیں۔ اسے دیکھنے والوں کی تعداد 65 کروڑ تھی جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ ''رامائن'' نے رامانند ساگر کی جھولیاں ہی نہیں بھریں بلکہ دوردرشن نیشنل چینل میں بھی بہار آ گئی۔

''رامائن'' کی کامیابی سے متحرک ہو کر رامانند ساگر نے ایک اور دھارمک سیریل بنایا جس کا نام ''کرشنا'' تھا۔ اس سیریل کو بھی بیحد سراہا گیا۔ اس کے بعد ساگر آرٹس نے کئی سارے سیریل بنائے جن کے نام ہیں، ''جے گنگا میا'' ''دھرم ویر'' ''پرتھوی راج چوہان'' ''بچ کے رہنا'' ''آنکھیں'' ''مہاشنی دیو کی'' ''جے ماں درگا'' ''سائیں بابا'' اور ''علی بابا''۔

سن 2000 میں بھارت سرکار نے رامانند ساگر کو پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ 1944 میں رامانند ساگر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''جوار بھاٹا'' چھپا۔ اُسکے اگلے سال ایک اور مجموعہ چھپا جس کا نام ''آئینے'' تھا۔ اُس کے بعد اُسکی اگلی کتاب ''جب پہلی روز برف گری'' شائع ہوئی۔ 1945 میں ایک اور کتاب چھپی جس کا نام ''میرے ہمدم میرے دوست'' تھا۔ بٹوارے کے بعد جب اُس نے کشمیر سے نقل مکانی کی تو اُس کے پاس پانچ آنے تھے اور ساتھ میں ایک ٹرنک تھا جو اُس کے مسودوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہی اُس کی کل پونجی تھی۔ اسی بدحالی کے دور میں اُس نے ایک شہکار لکھا جو 1948 میں ''اور انسان مر گیا'' کے نام سے اُردو میں چھپا جس نے تہلکہ مچا دیا۔ ناول کی مقبولیت دیکھ کے یہ ناول ہندی اور انگریزی میں بھی چھپا۔ 1949 میں ایک اور کتاب ''پھول اور کانٹے'' چھپ گئی۔

رامانند ساگر کی بیوی کا نام لیلا چوپڑہ تھا۔ یہ شادی جب ہوئی تو رامانند ساگر کو اس لئے اپنی بیوی کو لے کر گھر چھوڑنا پڑا کہ اُس نے گھر والوں کو دہیز لینے سے منع کر دیا تھا۔ گھر والے اُس سے اس حرکت پر اسقدر خفا ہو گئے کہ اُنہوں نے اُسے گھر سے نکال دیا۔ رامانند ساگر اور لیلا دیوی کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ بیٹوں کا نام سبھاش ساگر، موتی ساگر، پریم ساگر اور آنند ساگر جب کہ بیٹی کا نام نیلم ہے۔ چاروں بیٹے فلموں سے ہی وابستہ ہیں۔ رامانند ساگر فلم ''للکار'' کی فلمبندی کے دوران اداکارہ کم کم کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ معاملہ اتنا بڑھ گیا کہ رامانند ساگر نے کم کم اور کرن کمار کو لے کر ایک فلم بھی بنائی جس کا نام ''جلتے بدن'' تھا۔ یہ فلم بری طرح پٹ گئی اور اسطرح اُسکے سر سے عشق کا بھوت اُتر گیا۔

11 دسمبر 2005 کو رامانند ساگر نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ دیا۔ اُس کا جانا ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔ وہ ہمہ جہت فن کار تھا۔ ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ جب تک یہ فلمی دنیا ہے رامانند ساگر کو لوگ ہمیشہ یاد کرتے رہیں گے۔

''فیصلہ''

ایک مسجد کے سامنے شراب خانہ کھلا۔ مسجد میں نمازی ہر نماز پر اس کاروبار کی ناکامی کے لیے دعا کرتے۔ کچھ دن بعد شراب خانے میں بجلی شارٹ ہونے سے آگ لگ گئی اور سارا کچھ جل گیا۔

شراب خانے کے مالک نے مسجد کے امام اور نمازیوں کے خلاف کیس درج کروا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ میری دکان کے جلنے کی وجہ دعا تھی۔

مسجد کے امام اور نمازیوں نے اس بات سے انکار کیا کہ آگ ان کی بددعا کی وجہ سے لگی ہے۔

جج نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ اس کیس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ شراب خانے کا مالک دعا کی طاقت پر یقین رکھتا ہے لیکن تمام مسجد والے یقین نہیں رکھتے۔

☆

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

پیارے گلزار جاوید، آداب۔

جب سے آپ نے ادب کے اس طالب علم پر یہ کرم کیا ہے کہ تین دہائیوں سے اُردو ادب کی خدمت کرنے والے اور راولپنڈی سے ہر ماہ باقاعدگی سے منظر عام میں آنے والے ماہنامہ "چہارسو" کا ایک شمارہ (برائے مئی جون ۲۰۲۱) اس کے نام کر دیا ہے، تب سے سچ پوچھیں تو یہ خاکسار لاکھ بار سوچنے کے بعد بھی اسے احسان کے سوا کچھ اور سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ جَزَاکَ اللہُ خیراً.

جب آپ نے مجھ سے مکالمے کی غرض سے سوالات بھجوائے تھے، تیکھے سوالات، اور میں اپنے تئیں اُن کے مقابل ہونے کے جتن کر رہا تھا تو اندازہ نہیں تھا کہ آپ اس شمارے کو اتنے عمدہ مواد کے ساتھ لے آئیں گے، کہ میرے افسانے، ناول اور تنقید سب توجہ پالیں گے۔ میں سمجھتا ہوں یہ شمارہ اس خاکسار کے کام پر ایک حوالے کی دستاویز بن گیا ہے۔ سید ضمیر جعفری سے اپنی اوّلیں وابستگی پر نازاں اور اپنی اعلیٰ روایات مستحکم کرنے والے ماہنامہ ''چہارسو'' راولپنڈی کی اس اشاعت کو میں اپنے لیے کسی بھی بڑے اعزاز سے کم نہیں سمجھتا ہوں۔ آپ نہایت سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ معیاری تخلیقات کے حصول اور انتخاب کے بعد ''ہر شمارہ خاص شمارہ'' بنا لیتے ہیں۔ اس عمل کی جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔ اس شمارے میں محض اس خاکسار کے حوالے سے مواد ہی اہم نہیں ہے اور بھی بہت کچھ پڑھنے کے لیے موجود ہے۔ افسانے کا گوشہ ہی دیکھ لیں کہ یہاں عبد اللہ جاوید (دختر آب)، رضیہ اسماعیل (تتلیاں اداس ہیں)، ذکیہ مشہدی (کمینہ)، امجد طفیل (ملاح اور گڈریا)، جیسے اہم ناموں سے ملاقات ہو رہی ہے۔ افتخار عارف (شانتی کے تعاقب میں: ''ہر بستی میں نقدِ حسن کی اپنی اپنی میزانیں ہیں / اپنا اپنا پیمانہ ہے / آسمان کا اتنا حصہ جو تیری کھڑکی میں ہے وہ تیرا ہے / اور جو میری کھڑکی میں ہے وہ میرا ہے / اور سورج ہم دونوں کا ہے'')، جلیل عالی (جو بول سچ کا نہ بالا ہوا جہاں میں تو پھر / سوال اٹھے گا کہ یہ کس کی خامکاری ہے)، حمیرا رحمٰن (بہت سے خواب تھے رنگین، اس کے تھیلے میں / سو لوگ بیٹھ گئے اجنبی کے چاروں طرف)، عنبرین حسیب عنبر (یہ میں ہوں جس نے بڑھایا ہے اس کہانی کو / اترا تو مرکزی کردار مرنے والا تھا) کی تخلیقات پڑھیں اور جی چاہتا ہے کہ سارا رسالہ پڑھ لیا جائے۔ دعا ہے کہ ماہنامہ "چہارسو" راولپنڈی کی صورت اردو کا یہ روشن چراغ یوں ہی روشنی بکھیرتا رہے۔ ایک بار پھر گلزار جاوید آپ کا اور آپ کی ٹیم کے تمام اراکین بینا جاوید، فاری شا، محمد انعام الحق، عروب شاہد اور آمنہ علی کا تہہ دل سے شکریہ۔ سدا سلامت رہیں۔

محمد حمید شاہد (اسلام آباد)

عزیزم گلزار جاوید، سلام۔

چہارسو کا تازہ شمارہ مئی جون پیشگی برقی روپ میں موصول ہوا۔ اللہ کرے کاغذی پیرہن میں (غالب والے نہیں) ایک بار پھر آنا شروع ہو۔ آمین۔

اس مرتبہ قرطاسِ اعزاز جناب محمد حمید شاہد کے حصّے میں آیا ہے۔ تحریر مصاحبہ خاصا طویل ہو گیا ہے پڑھنا پڑا۔ جناب محمد انعام الحق کی تعارفی تحریر کے بعد جب محترم محمد حمید شاہد کے مضمون بعنوان ''اسلوب، زبان اور کردار'' پر نظر ڈالی تو یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ موصوف نے اپنے انتہائی نجی اور بے تکلفانہ اسلوب میں لکھے ہوئے خطوط کو مضمون کی جگہ دے دی ہے۔ شاید تین عدد خط ان کے ہیں بنام محمد عمر میمن اور ایک خط محمد عمر میمن کا ان کے خطوط کے جواب میں۔ ایک قاری کے طور پر مجھے محمد حمید شاہد کی یہ ادا قدرے ناپسند ہوئی۔ خطوط کا اسلوب نجی، شخصی، ذاتی، اشاراتی اور کنایاتی ہونے کی وجہ سے ان خطوط کی سمائی بھرتی کی سی لگتی ہے۔

''چہارسو'' کی دیگر مشمولات معمول کے مطابق ہیں۔ ڈاکٹر حسن منظر کا قطعہ ''بھیڑیا'' آپ کی ہماری اور دنیا بھر کی انسان برادری کی دلی تمنا ہے۔ سید خورشید انور رضوی اور محمد شریف شیوہ صاحبانِ ادب احترام کے التزام کی پابندی ملحوظ کرتے ہوئے نذرانۂ عقیدت و محبت کے لفظوں میں سمو رہے ہیں۔ ''نیوٹن کی بازیافت'' کے عنوان سے جو اقتباس آپ نے پڑھایا ہے اس کے پانچوں نکات بے حد مزیدار ہیں اور میرے تجربے کے عین مطابق۔ رضیہ اسماعیل صاحبہ ہمیشہ کچھ نیا لانے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں۔ ''تتلیاں اداس ہیں'' گھریلو مار پیٹ پر ایک اچھی تحریر ہے۔ امجد طفیل صاحب کا افسانہ ''ملاح اور گڈریا'' قاری کو ایک بار پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا بھی اس طرح کہ اس کی سوچ میں آتا جاتا رہتا ہے۔ افسانے سے اور کیا چاہیے۔ سلمیٰ صنم کی تحریر ''بانس کا آدمی'' دھیرج سے پڑھنے اور ایک سے زائد مرتبہ پڑھنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ سلمیٰ صنم کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جناب کرشن بہاری نور اور جناب شاہین، جناب جلیل عالی، محترمہ حمیرا رحمٰن، جناب واصف حسین واصف، جناب جاوید زیدی، جناب رؤف خیر اور دیگر شعراء کی غزلیات معیاری ہیں۔ افسوس کہ میں نے پرچہ پورا نہیں پڑھا۔ پڑھ پاؤں تو شاید مزید لکھوں۔ میں آپ سے اور ان سب اہلِ قلم سے معذرت خواہ ہوں جن کی نگارشات پڑھنے میں نہ آ سکیں۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

میرے گلزار، خوش رہو۔

کافی وقفے کے بعد تازہ چہارسو دیکھا تو طبیعت اُس بچے کی مانند شوخ و شنگ ہو گئی جو غبارے والے کے بانس پر لگے رنگ برنگے غبارے دیکھ کر ہو جاتی ہے۔ معمولی بات نہیں ہے ایک طرح سے ملکِ عدم کو چھو کے لوٹا ہوں۔ لوٹا کہاں بلکہ کھینچ کر لایا گیا ہوں۔ یہ سب آپ لوگوں یعنی گلزار جاوید، ڈاکٹر ریاض احمد، ڈاکٹر

فیروز عالم، رینو بہل اور پروین شیر کے علاوہ دونوں بیٹیوں ، داماد اور اُن کے بچوں اکلوتے بیٹے اور بہو کی دعاؤں نے ایک مرتبہ پھر سے زندگی سے آنکھیں چار کرنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ کیا کہوں ،سوائے دعاؤں کے میرے پاس کہنے کو ہے ہی کیا؟ آپ سب لوگ جیتے رہیں اور اسی طرح ایک دوسرے سے جڑے رہیں۔شاباش زندہ باد۔

چہارسو کے تمام مشمولات دسترخوان پر سجے خوشبودار کھانوں کی طرح اپنی جانب متوجہ کر رہے ہیں اور میں ایک زمانے سے بھوکے شخص کی مانند اُن پر ٹوٹنے کو آمادہ ہوں مگر رس رابطے کے چند خط پڑھنے کے بعد ہی نقاہت کے مارے آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے ہیں۔ بہرحال حمید شاہد جیسے پُرعزم نوجوان کو آپ نے جس سلیقے اور سجیلے طریقے پر پیش کیا ہے اُسے دیکھ کر آپ دونوں کے لیے دل سے دعائیں نکل رہی ہیں کہ چہارسو کا گلشن یونہی آب وتاب کے ساتھ کِھلتا اور مہکتا رہے اور ہم اس کی مہک اور خوشبو سے تازگی اور تراوٹ لیتے رہیں۔

زندگی نے وفا کی اور جسم نے ساتھ دیا تو اگلے شمارے میں تفصیلی رائے عرض کروں گا۔آپ اور قارئین چہارسو سے دعاؤں کی التماس ہے۔

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

برادرِ عزیز گلزار جاوید۔السلام علیکم۔

تازہ شمارہ چہارسو تمام تر تو نہیں، کچھ اہم تحاریر ڈاؤن لوڈ اور پرنٹ بھی کر لی تھیں اور ان کا مطالعہ بھی کر لیا تھا۔مگر ان پر تبصرہ کرتے میں کچھ تاخیر ہوگئی اور تبصرہ بھی مختصر کروں گا کیونکہ کل پرسوں سے میری آنکھ میں کافی تکلیف ہو رہی تھی اور آج آئی سپیشلسٹ سے تفصیلی معائنہ کرایا ہے تو کئی مسائل نکل آئے جن میں سے دو بڑے بڑے مسائل یہ کہ ایک آنکھ میں سفید موتیا اور دوسری میں کالا موتیا ہے۔ دو دن بعد پھر جانا ہے تین چار رپورٹیں ساتھ لے کر، جس کے بعد معلوم ہوگا کہ کیا کرنا ہے۔بس دعا کیجیے۔

برادرم محمد حمید شاہد پر خصوصی نمبر بہت پسند آیا اور خاص طور پر آپ کا انٹرویو جس میں سوالات بھی اور جوابات بھی مزے مزے کے تھے، محمد حمید شاہد ایک بہت بڑی ادبی شخصیت ہیں مگر ان سے مل کر کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ بڑی شخصیت ہیں اس لیے کہ وہ خطِ عظمت میں گرفتار نہیں ہیں۔ ہر لکھنے والے سے برابر کی سطح پر ملتے ہیں، میں نے شاید جتنے افسانے اور تنقیدی مضامین ان کے پڑھے ہیں شاید ہی کسی اور کے پڑھے ہوں، مگر ان پر تفصیلی اظہارِ خیال پھر کسی موقع پر۔

جناب تابش خانزادہ کا بھنگ کے پودے کے بارے میں مضمون بھی تاریخ کے بہت سے اوراق سامنے لاتا ہے۔اور بلاشبہ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں، اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ برادرم تصور اقبال نے میرے حمدیہ ونعتیہ مجموعہ ''محورِ دو جہاں'' پر جس محبت کے ساتھ مضمون لکھا ہے اس کی جتنی داد دی جائے، کم ہے، اور چہارسُو کے حوالے سے یہ اعزاز بھی ان کے حصے میں آیا ہے کہ مجھ پر چہارسُو میں یہ پہلا مضمون ہے۔ باقی آنکھوں کی حالت میں کچھ بہتری ہونے تک۔دعا کیجئے گا۔

نسیم سحر (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید،السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں اور ادبی روایتوں کے ساتھ نظر نواز ہوا۔قرطاسِ اعزاز اردو ناول، افسانہ اور تنقید کا معروف اور باوقار نام محمد حمید شاہد کے نام ہے۔''براہِ راست'' میں بقول محمد حمید شاہد ''تیکھے'' سوالات اور ہم جیسے تشنگانِ ادب کے لیے انتہائی مفید سوالات اور پھر تفصیلی جوابات سے لطف آ گیا۔شاہد صاحب نے اپنے خاندانی پس منظر، والدین، گاؤں، ابتدائی تعلیم، طلبہ سیاست، تربیت اور ادب کی جانب رجحان کی خوب وضاحت کی ہے۔ حمید شاہد کے افسانے اردو افسانے کی تاریخ میں ایک بامعنیٰ اضافہ ہیں اردو کے معروف اہلِ علم وفن کی تحریر اُن کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔منشایاد مرحوم کا یہ کہنا درست ہے کہ ''حمید شاہد کے ہاں دفتری ماحول میں افسانے لکھنے کا رجحان ہے۔'' شمس الرحمان فاروقی نے بڑی باریک بینی سے صاحبِ اعزاز کے فن کا تجزیہ کیا ہے۔ مجھے عرفان جاوید صاحب کا مضمون زیادہ پسند آیا۔حمید شاہد نے جو ایک جواب میں کہا میرا خیال ہے ہر سچے تخلیق کار کے ساتھ یہ مسئلہ ہے دیکھئے ''جو کام مجھے سب سے مشکل لگتا ہے وہ اپنے افسانوں کی بابت کچھ کہنا ہے۔''

''تخلیقی وجدان'' میں محمد انعام الحق نے کس سلیقے سے صاحبِ اعزاز کا سوانحی تعارف، ادبی کارگزاری اور کتب کی فہرست مرتب کی ہے۔محمد حمید شاہد کی تنقیدی مضامین اور ایک دو کتابیں بھی دیکھی ہیں کمال کرتے ہیں۔''گماں کا ممکن: جو تو ہے میں ہوں'' ن۔م۔راشد کی تجزیہ ان کی تنقیدی بصیرت کی ایک جھلک ہے۔ڈاکٹر یاسین آفاقی نے درست لکھا ہے ''محمد حمید شاہد کی فکشن کی تنقید اپنے طرز احساس کے سبب نیا تنقیدی منہاج فراہم کرتا ہے'' (ص:۴۶)۔ بھرپور گوشے کی ترتیب پر ''چہارسو'' کے معزز ارکان اور محمد حمید شاہد کو مبارک میں نے فون کر کے بھی صاحبِ اعزاز کو مبارک باد دی تھی۔بہت خوب۔

محترمہ رضیہ اسماعیل کا بین الاقوامی حساس اور (خاموش) مسئلے ''گھریلو تشدد'' پر متاثر کن افسانہ ''تتلیاں اداس ہیں'' افسانے میں فنی لوازمات کے گہرے مشاہدے کی داد نہ دینا ادبی بددیانتی ہوگی۔ذکیہ مشہدی کا افسانہ ''کمینہ'' بنت کے لحاظ سے مضبوط افسانہ ہے جس میں احساس کی برتری کے ساتھ ساتھ معاشرے کے کم تر اور حقیر لوگوں کی اہمیت ظاہر کرتا ہے۔افسانہ کا آخری جملہ ''کمینہ کہیں کا'' افسانے کا حاصل ہے۔ افسانہ پڑھتے ہوئے ماضی کے افسانے ''کالو بھنگی'' اور ''کچرا بابا'' یاد آئے۔افسانے میں صفحہ ۶۸ پر لفظ ''قانونوں'' نے لطف نہیں دیا۔رعنا کوثر کے افسانے ''اچھوت'' نے بھی متاثر کیا۔

جلیل عالی، حمیرا رحمٰن، رؤف خیر، عنبرین حسیب عنبر، انیس الرحمان، نبیل احمد نبیل، رئیس صدیقی، تسنیم کوثر، عادل حسین، یاسین ضمیر کی غزلوں کے اکثر اشعار توجہ طلب اور دل کے قریب محسوس ہوتے ہیں۔

بہت سے خواب تھے رنگین، اس کے تھیلے میں
سو لوگ بیٹھ گئے، اجنبی کے چاروں طرف

(حمیرا رحمٰن)

وقت ہر چیز میں ترمیم کیے جاتے ہیں
خود کو اک حال میں اتنا نہ زیادہ رکھنا
(نبیل احمد نبیل)

ڈاکٹر فیروز عالم صاحب نے ''غضب کے قصے، غضب کے فسانے'' میں رینو بہل کے افسانوں کی نئی کتاب پر تفصیلی مضمون اس طرح تحریر کیا ہے کہ ہر افسانے کا مرکزی خیال اور تبصرہ کر کے منفرد بنا دیا۔ رینو بہل ''چہارسو'' کی مستقل لکھاری ہیں۔ محترمہ پروین شیر نے ''رفتہ یا جاویداں'' معروف نقاد، محقق، شاعر، ناول نگار، مدیر اور دانش ور ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی پر زبردست مضمون تحریر کیا۔ محترمہ نے الفاظ کا چناؤ سوچ سمجھ کر کیا ہے جو مرحوم کی شخصیت اور ادبی خدمات کا اعتراف بھی ہے اور تحسین بھی۔ بہت خوب۔ امیر حمزہ توف کے زندہ ناول ''میرا داغستان'' کا ایک جزو جو زبان سے محبت پر مبنی ہے خوب چسپاں کیا ہے۔ ''رس رابطے'' کا مطالعہ سب سے پہلے کرتا ہوں احباب کے خیالات سے مستفید ہوتا ہوں۔ وجیہہ الوقار بڑی محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔

نوید سروش (میر پور خاص)

محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

محمد حمید شاہد معروف ادیب اور صدارتی ایوارڈ یافتہ شخصیت ہیں۔ اس حوالہ سے ''چہارسو'' کا گوشہ ان سے منسوب کرنا قابل تحسین ہے۔

شمارہ میں اچھے افسانے اور شاعری شامل ہے۔ ''تتلیاں اداس ہیں'' رضیہ اسماعیل نے دلچسپ اور بامقصد افسانہ لکھا ہے جس میں گھریلو تشدد کی تکلیف دہ صورت حال کی وجہ سے بچوں کے جذبات اور شخصیت پر جو منفی اثرات پڑتے ہیں عمر بھر ان کا اثر باقی رہتا ہے پر مرد کو خصوصی طور پر اس مسئلہ کے نتائج پر غور کرنا چاہیے اور عورت بھی احتیاط، برداشت اور مسکراتے چہرے کے ساتھ خوشگوار ماحول قائم کرنے کی کوشش اور بات کو طول نہ دے۔ ''اچھوت'' رعنا کوثر نے موجودہ حالات کے تناظر میں دلچسپ افسانہ تحریر کیا ہے۔ کورونا وائرس کی وبا نے ایسا ماحول بنا دیا ہے کہ ہر کوئی دوسرے سے اچھوت کی مانند سلوک کر رہا ہے۔

''ملاح اور گڈریا'' کے عنوان سے امجد طفیل نے ایک دلچسپ اور پُر اثر کہانی تحریر کی ہے۔ ''دخترِ آب'' عبداللہ جاوید کی ایک طویل تحریر ہے۔ صفحہ نمبر ۶۱ پر ماں بیٹی اور دو جوان بہنوں کے درمیان جنسی گفتگو کا تذکرہ افسانہ کا شرمناک حصہ ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے ڈاکٹر رینو بہل کے ناولوں اور افسانوں پر بہترین تبصرہ کیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے۔

شاعری میں کرشن بہاری نور، حمیرا رحمٰن، واصف حسین واصف، رؤف خیر اور رومانہ رومی کا کلام متاثر کن ہے۔ موجودہ حالات میں ''چہارسو'' کے باقاعدگی سے اجراء پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

گلزار جاوید صاحب، آداب اور سلام

حمید شاہد صاحب کا گوشہ دونوں طرح دلچسپ تھا، ان کی تخلیقات کی طرح ان کا انٹرویو بھی بہت اچھا تھا، حمید شاہد صاحب نے افسانے ''سورگ میں سور'' میں علامتوں سے حالاتِ حاضرہ کا نقشہ کچھ ایسے کھینچا ہے کہ نہایت سخت بات بہت آرام سے کہہ دی ہے۔ اسی طرح ناول سے اقتباس ''مٹی آدم کھاتی ہے'' بھی دوطرفہ ضمیر جھنجھوڑتی کہانی ہے۔ عبداللہ جاوید صاحب کا ''دخترِ آب'' تخلیق کار کے جزوِ فن ہونے کی بہت اچھی تمثیل ہے۔ ذکیہ مشہدی کا ''کمینہ'' وبا کی چشم کشائی سے عبارت، ایک حقیقت پسندانہ تحریر ہے۔ شاعری میں کرشن بہاری نور اور ولی عالم شاہین صاحب کی غزلیں بہت خوب ہیں۔ ان کے علاوہ واصف حسین واصف، عنبرین حسیب، نوید سروش، قاسم جلال، حمیرا رحمٰن، سہیلہ انعام، رومانہ رومی اور منظور ثاقب کی غزلوں کے اشعار بھی اچھے تھے۔ ہمیشہ کی طرح چہارسو پڑھ کر بہت لطف آیا۔ سب کو سلام اور محبت۔

فیصل عظیم (کینیڈا)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

کورونا کال میں جس طرح چاروں جانب آہا ہا کار مچی ہے ایسے میں نو بہ نو عنوانات اور تخلیقات سے سجا رنگ برنگا چہارسو دل دماغ کو تازگی بھی دے رہا ہے اور تقویت بھی۔ آپ کے حوصلوں کو داد دینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ جس دور میں آدمی کو اگلے سانس کی خبر نہیں ہوتی اُس دور میں آپ ایک کے بعد دوسرا چہارسو شائع کر کے قارئین چہارسو کے لیے بڑا آسرا بنے ہوئے ہیں۔

محمد حمید شاہد صاحب اردو ادب کی جانی مانی شخصیت ہیں اور آپ کی پیشکش نے تو اُس میں ایسی دلکشی پیدا کر دی ہے کہ بار بار دیکھنے اور پڑھنے کے باوجود بھی طبیعت بھر نہیں پا رہی۔

اس بار افسانے تعداد میں کم، معیار میں بہت اونچے ہیں۔ عبداللہ جاوید صاحب نے صرف افسانہ ہی نہیں لکھا بلکہ ایک نئی دنیا کی سیر کرائی جو دلچسپی کے ساتھ نئی نئی معلومات سے پُر ہے۔ ہم جیسے طالب علموں کے لیے عبداللہ جاوید صاحب کا یہ افسانہ سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری دعا ہے کہ عبداللہ جاوید صاحب اسی طرح عمدہ افسانے لکھتے رہیں اور ہم جیسے نو آموز لکھنے والوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہیں۔ امجد طفیل صاحب کو میں نے پہلی بار پڑھا ہے کیا خوب لکھتے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ وہ آئندہ بھی چہارسو کے لیے لکھیں اور میں اُنہیں بار بار پڑھوں۔ ذکیہ مشہدی صاحبہ نے ایک عام موضوع کو اپنے قلم کے ذریعہ خاص بنا کر جس طرح پیش کیا ہے اُس کے لیے وہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔ رضیہ اسماعیل صاحبہ کے نام کے آگے یو کے لکھا ہوتا ہے جبکہ اُن کی کہانیوں میں مشرق کی بُو باس اس قدر نمایاں ہوتی ہے۔ یقین نہیں آتا کہ مصنفہ کا کبھی مغربی تہذیب و تمدن سے کوئی تعلق رہا ہو۔ بہت بہت مبارک باد ڈاکٹر صاحبہ۔ سلمیٰ صنم صاحبہ کو بھی پہلی بار پڑھا لیکن جس طرح انہوں نے افسانے کو بُنا اور گوندھا ہے اُس سے موضوع اور نمایاں ہو کر قاری کے سامنے آتا ہے۔ سلمیٰ صاحبہ کو دعاؤں کے ساتھ یہی کہنا چاہوں گی کہ اللہ کے دیے ہوئے اس وصف کو اسی طریقے پر استعمال کرتی رہیں۔

شاعری پر تبصرہ ادھار رہا۔ دعا کیجیے کہ نہ صرف انڈو پاک بلکہ دنیا کے تمام لوگ کورونا جیسے موذی مرض سے جلد از جلد نجات پالیں۔

رینو بہل (چندی گڑھ)

گلزار بھائی، السلام علیکم۔

ایک تو رمضان کی آمد، پُرنور دن اور راتیں اور پھر خوبصورت چمکتا دمکتا چہارسو۔ اتنا دلچسپ کے رات کو پڑھنے بیٹھتے تو یہ بھول جاتے کے سحری میں بھی اٹھنا ہے۔ اس کی جدت پسندی یہ ہے کہ بے شمار موضوعات ملتے ہیں۔ افسانے، غزلیں، اچھے قلم کاروں سے تفصیلی ملاقات، سفرنامہ اور پھر ایک صدی کا قصہ۔

محمد حمید شاہد کا تفصیلی تعارف حاصل ہوا۔ ان کی ناول اور کتابوں سے ہلکا سا تعارف ہوا۔ ان کا بہترین افسانہ ''سورگ میں سور'' آپ کی وساطت سے پڑھنے کو ملا۔ اور جن علامات کے ساتھ انہوں نے افسانہ لکھا اس سے ان کی حالات کو سمجھنے کی سوجھ بوجھ کا اندازہ ہوا۔ ذکیہ مشہدی کا افسانہ ''کمینہ'' ہمارے معاشرے کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ ہم تنگ نظر لوگ ہیں جو ہمیں آرام بہم پہنچاتے ہیں ہم ان کو پیشے کے حساب سے حقیر جانتے ہیں۔ امجد طفیل کا ''ملاح اور گڈریا''۔ ''بانس کا آدمی'' سلمیٰ صنم کا افسانہ پسند آیا۔ فیروز عالم کی میرے افسانے کے بارے میں مشورہ پسند آیا۔ ہمیشہ اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے۔

رینو بہل کی کتاب پر فیروز عالم کا تبصرہ پڑھا۔ رینول بہل کو مبارکباد۔ دیپک کنول ''ایک صدی کا قصہ'' میں بے حد معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مشاعرہ آن لائن بشاشت سے پڑھا۔ یہ صدی یہ سال مشاعروں کا ہی ہے جناب گھر بیٹھے شہرت کسے بُری لگتی ہے۔ ستوتی اگروال نے اردو غزل اور ہندوستانی ذہن وتہذیب پر جو روشنی ڈالی ہے اپنے ترجمے کے ذریعے اس سے اردو غزل کی تاریخ سے آگہی ہوئی۔ آج کل غزل بہت مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ یہ ہماری تہذیب کا حصہ ہے۔ اس کے بارے میں جان کو خوشی ہوئی۔

گلزار جاوید کے سوالات حسبِ معمول بہت اتار چڑھاؤ کے ساتھ حمید شاہد کو پسند آئے یا نہیں ہمیں بہت پسند آئے۔ آپ کے ہاں بہترین شاعری کا خزانہ بھی ملتا ہے اور جانے پہچانے نیویارک کے شاعروں کو دیکھ کر اور خوشی ہوتی ہے۔ خالد عرفان کی تنقیدی شاعری ہمیشہ کی طرح بھرپور، مشیر طالب کا مامون ایمن کو خراج تحسین بالکل درست، حمیرا رحمٰن کی غزل جو مجھے بے حد پسند ہے، واصف حسین واصف، افتخار عارف نام لیتے رہیں اور ختم نہ ہوں بہت مبارک یہ آپ ہی کا کارنامہ ہے۔

پروین شیر کا مضمون شمس الرحمان فاروقی پر اچھا لگا۔ گلزار بھائی فی الحال اتنا ہی پڑھ سکی اور قلمبند کر دیا۔ بہت دلچسپ شمارہ۔

رعنا کوثر (نیویارک)

جاوید بھائی، السلام علیکم۔

سلامت رہیے خوش رہیے ادبی شخصیات کے دلوں میں راج کرتے رہیے اور دنیائے ادب کے اُفق پہ ستارہ بن کر روشن رہیے۔ چہارسو کے تعارفی سلسلے پہ جاوید بھائی سمیت ساری ٹیم کو جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے یہ ایک بڑا زبردست سلسلہ ہے جس کی معرفت سے ہم ادب سے تعلق رکھنے والی مختلف شخصیات سے (جنہوں نہ صرف ادب کی خدمت کی بلکہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں کارکردگی کر کے اپنا آپ منوایا ہے) جی بھر کے ملاقات کر سکتے ہیں ایسی ہی ایک شخصیت جناب حمید شاہد سے چہارسو کے ذریعے مُلاقات ہوئی ان کے بارے میں جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ بے شُمار کُتب کے خالق جن میں افسانوں کے مجموعے ناول نثر نگاری تبصرہ نگاری سیاسی سماجی نظریے بین الاقوامی زبان کی شاعری کے تراجم مزاح اور بہت کچھ شامل ہے جنہیں تعلیمی میدان کو بہترین صلاحیت سے عبور کرنے کے بعد ادب کی بے انتہا خدمت انجام دینے پر نہ صرف صدارتی ایوارڈ سے نوازا بلکہ کئی ایوارڈز انکے نام کیے گئے۔ حمید شاہد جیسی ہمہ جہت شخصیات ہماری وطن کا سرمایہ ہیں جو ادب کی خدمت کو اپنی اولاد کی خدمت کی طرح انجام دیتے ہیں۔ تعارفی سلسلہ اپنی مثال آپ ہے بلکہ چہارسو کے سارے سلسلے دل میں اترنے والے ہیں جن میں ایک بہترین سلسلہ رس رابطے جو مجھے تو بہت پسند ہے۔ یقیناً باقی قارئین کو بھی اپنی طرف کشش کرتا ہوگا اسکی بدولت ہم کھُل کر اپنی رائے کا اظہار کر سکتے ہیں اسی طرح متعدد افسانہ نگاروں کے سیاسی، سماجی، رومانوی، المیہ اور طربیہ موضوعات کے رنگوں سے مزیّن افسانے مکمل پڑھے بغیر میگزین سے نظریں ہٹنے نہیں دیتے۔ محترمہ رضیہ اسماعیل کا افسانہ تتلیاں اُداس ہیں ازل سے معاشرے میں خواتین پر ہونے والی بدسلوکی کا مضمون لیے تھا۔ بہت خوب اسی طرح دخترِ آب عبداللہ جاوید صاحب کا افسانہ ایک اچھوتی تحریر بن کے سامنے آیا ذکیہ مشہدی کا افسانہ کمینہ بھی ہم نے خوب آنکھیں کھول کے پڑھا۔ ملاح اور گڈریا بھی اپنی مثال رہا۔ اچھوت افسانہ جو رعنا کوثر صاحبہ کی تخلیق تھا ہمیشہ کی طرح یہ ان کی یہ تحریر بھی دل میں جگہ کر گئی سلمیٰ صنم صاحبہ کے بانس کے آدمی نے بھی کم متاثر نہیں کیا۔

شاعری کے دریچے میں جھانک دیکھا تو بڑے نامور شعراء اپنی باکمال عرضیات کے ساتھ ہنستے مُسکراتے ہوئے نظر آئے جن میں جمیل عثمان، مُشیر طالبُ افتخار عارف راشد متین، شاہد علی صدیقی اور دوسرے مختلف شعراء شامل تھے انہی میں ہم جیسے نااہلیوں کی ناقص نظم کو بھی شامل کر کے گلزار بھائی آپ نے ہماری رگوں کئی لیٹر خون کی روانی بڑھا دی جس کے لیئے ہم تہہ دل سے مشکور ہیں پروین شیر صاحبہ جو خود بھی اپنی تحریروں کی طرح خوبصورت اور با اخلاق ہیں چہار سُو میں دیکھ کر دلی مُسرت محسوس ہوتی ہے گلزار بھائی کا مضمون براہِ راست اس قدر اچھا رہا خوبصورت الفاظ کا انتخاب ایسا تھا کہ واقعی براہِ راست دل میں اُتر گیا ہم گلزار بھائی اور اس ٹیم کے تمام افراد کے لیئے دل سے دعا گو ہیں کہ آنے والی نسلوں کی نسلیں بڑھتی رہیں اور چہار اسی طرح پوری آب وتاب سے جگمگا تا رہے آمین یارب العالمین۔

ڈاکٹر نزہت شاہ (نیویارک)

..... تصوّرِ حرا .....

حضور پُرنور، شافعِ یوم النشور، وجہِ کائنات، فخرِ موجودات کی ذاتِ بابرکات کے حوالے سے کہی جانے والی ہر نعت کے اشعار ہر نعت گو کے لیے دنیا میں سندِ فضیلت ہی نہیں، زادِ آخرت بھی ہے۔ جناب تصوّر اقبال اس لحاظ سے بہت خوش نصیب ہیں ہ یہ سعادت وفضیلت ان کے حصے میں بھی آئی ہے۔ کسی شاعر نے سچ کہا ہے:

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جناب تصور اقبال کی پیشِ نظر کتاب ''تصورِ حرا'' اُن کے حمدیہ ونعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ اگرچہ اس سے قبل بھی ان کی کئی کتب منظرِ عام پر آ چکی ہیں لیکن موجودہ کتاب اپنے موضوعات (حمد، نعت، سلام ومنقبت) کے حوالے سے منفرد اور موصوف کی زندگی کا شاندار کارنامہ ہے۔ عشقِ الٰہی اور حبِ رسولؐ سے شاعر کا دل منور ہے جس کے نتیجے کے طور پر ہر شعر میں عقیدت ومحبت کی حلاوت، بے ساختگی اور والہانہ پن کے ستارے جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ''تصورِ حرا'' ایک ایسا چمنستان ہے جس کے ہمہ رنگ، ہمہ پہلو اور ہمہ خوشبو اپنی اپنی بہاریں دکھا رہے ہیں۔ حمدیہ کلام میں جیسے خداوند تعالیٰ کی ذات وصفات، قدرتِ کاملہ، احکامات وارشادات اور بندگانِ الٰہی کی نیازمندی، عاجزی، مغفرت کی تمنا اور رحمت کی امید جیسے موضوعات موجود ہیں۔ اسی طرح تاجدارِ مدینہؐ کے روضے کے دیدار کی تمنا، حضورؐ سے قلبی وابستگی، حشر کے دن شفاعت کی آرزو کے موضوعات بھی نہایت آب وتاب سے تصوّر اقبال کے مافی الضمیر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ''تصورِ حرا'' کا اسلوب بیاں نہایت سادہ، رواں، دلکش اور پُرتاثیر ہے۔ میں جناب تصور اقبال کو ان کے اس یادگار مجموعۂ نعت کی اشاعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

..... ڈاکٹر سید قاسم جلال

اشاعت: ۲۰۲۱ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: آرٹ لینڈ، اردو بازار چوک اعظم (لیہ)۔

..... عالمی سیاست کے فرماں روا .....

اشرف جاوید اپنی محنت، تحقیق کی لگن اور قلم کی صداقت کے بَل پر پاکستان کے کالم نویس صحافیوں کی صف میں ایک نمایاں مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے کالموں کے زیرِ نظر مجموعے سے پہلے ایک انتخاب جو ''نئے سیاسی رجحانات'' کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا، مقبولِ عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ اس نئے مجموعے سے واضح ہوتا ہے کہ اشرف جاوید کا اپنے فن کی تکمیل کا سفر نہ صرف جاری ہے بلکہ اُن کے مشاہدات کی گہرائی پہلے سے کہیں زیادہ داد کی مستحق ہے۔ پہلی کتاب کی طرح اشرف جاوید کے موضوعات کی وسعت واضح ہے۔ ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست کے مختلف پہلو بھی اُن کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ جمہوریت کو لاحق خطرات کی بات ہو یا مردم شماری کے مسائل ہوں یا بلوچستان میں خونریزی یا زینت کا قتل یا پھر عالمی سطح پر رونما ہونے والے واقعات، اشرف جاوید کا تبصرہ نہ صرف معاملات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے بلکہ اُن کے حل کے لیے آگے بڑھنے کا رُخ بھی متعین کرتا ہے۔ اشرف جاوید کی تحریروں میں جہاں تنوع قابلِ رشک ہے وہاں اسلوب کی پختگی بھی اتنی ہی قابلِ داد ہے۔ بہت سے کالم نویسوں کے مقابلے میں اشرف جاوید پیش گوئی سے بجا طور پر گریز کرتے ہیں لیکن جہاں پیش گوئی ممکن ہو وہاں وہ مستقبل کے امکانات بیان کرنے سے گھبراتے بھی نہیں ہیں جیسا کہ اپنے کالم ''سیاسی کروٹیں اور الیکشن ۲۰۱۸ء'' میں وہ کہتے ہیں کہ انتخابات کے بعد آنے والی کسی حکومت کو ورثے میں ملنے والے مسائل کا ہمیشہ رونا رہے گا۔ اسی طرح وہ اپنے کالم ''ترک عوام اور صدارتی نظام'' میں بھی اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہوئے ترک عوام کو ممکنہ طور پر پیش آنے والے حالات سے آگاہ کرتے ہیں۔

..... آئی۔اے۔رحمٰن

قیمت: ۶۰۰ روپے، دستیابی: جمہوری پبلی کیشنز، لاہور۔

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
پس جدیدیت
لہجے اور اسلوب